[Book Title]

حدیث نعمت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِن دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ

اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور بے پناہ رحم کرنے والے ہیں

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی راہ میں جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول ﷺ اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (التوبہ ۱۶)

انتساب

ان سعید ارواح کے نام

جن کے فانی جسم کے تمام اعضاء باری باری خدائے بزرگ وبرتر کی خوشنودی کیلئے قربان ہو گئے ،اسی کیلئے کٹ گئے، سب اسی کے پائے ناز پر نثار ہو گئے جس کے دستِ خاص نے ان کو وجود کے سانچے میں ڈھالا تھا۔

یقیناً ان نوجوانوں کے دھڑ شیطانی قوتوں کا شکار ہو گئے ہیں مگر اشک بار آنکھوں سے سو بار چومنے کے لائق ہیں کہ فرشتے ان کو اٹھا کر اللہ کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں اوران کی جوانیاں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ دنیا پر نہیں یہ آخرت پر نثار ہوئی ہیں۔ انہوں نے دنیا کی کسی چیز سے نہیں خود خدا سے عشق کیا، انہوں نے دنیا کی ساری اشیاء اور عیش و عشرت پر نہیں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر ایمان کی بنیاد رکھی، انہوں نے دنیا کی نشیلی چھاؤں میں نہیں بلکہ شہادت کے پر شوق سائے میں پناہ ڈھونڈی، انہوں نے زندگی کی دلفریب اور ایمان کی شاہکار شاہراہ پر اس طرح سفر کیا کہ زندگی سے ہٹ کر شہادت اور شہادت کے اس پار تک کچھ سوچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ شباب و حسن سے وجد کرتے ہوئے اللہ کے ہاں اس طرح حاضر ہو گئے ہیں کہ حسن و جوانی بار بار ایسی حسرت کرے!!!

فہرست

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
1	طاقت کا اصول یا اصول کی طاقت	بروز جمعرات 20 ذوالقعدہ 1431ھ 28/ اکتوبر 2010ء	8
2	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو	بروز ہفتہ 22 ذوالقعدہ 1431ھ 30/ اکتوبر 2010ء	13
3	درباری مذاکرات۔ لاحاصل کوشش	بروز منگل 25 ذوالقعدہ 1431ھ 2 نومبر 2010ء	19
4	کوئی ہے جوان کو سمجھائے	بروز جمعۃ المبارک 28 ذوالقعدہ 1431ھ 5 نومبر 2010ء	23
5	سکے کے دو رخ	بروز منگل 3 ذوالحج 1431ھ 9 نومبر 2010ء	27
6	اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے	بروز جمعۃ المبارک 6 ذوالحج 1431ھ 12 نومبر 2010ء	30
7	جگ ہنسائی	بروز سوموار 9 ذوالحج 1431ھ 15 نومبر 2010ء	34
8	بے مثال قربانی	بروز جمعۃ المبارک 13 ذوالحج 1431ھ 19 نومبر 2010ء	38
9	تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی	بروز سوموار 16 ذوالحج 1431ھ 22 نومبر 2010ء	41
10	انہیں بھی یاد کرلیں	بروز جمعرات 19 ذوالحج 1431ھ 25 نومبر 2010ء	43
11	کہیں دیر نہ ہو جائے	بروز اتوار 22 ذوالحج 1431ھ 28 نومبر 2010ء	46
12	فرق سمجھ کا نہیں سمجھنے کا ہے	بروز منگل 24 ذوالحج 1431ھ 30 نومبر 2010ء	49
13	کڑی آزمائش	بروز جمعۃ المبارک 27 ذوالحج 1431ھ 3 دسمبر 2010ء	52
14	اک شخص اندھیرے میں اجالے کی طرح تھا	بروز اتوار 29 ذوالحج 1431ھ 5 دسمبر 2010ء	55
15	وکی لیکس۔ حقیقت یا افسانہ	بروز منگل یکم محرم الحرام 1432ھ 7 دسمبر 2010ء	63
16	چپ ہوں تو تجھے ناداں سمجھ کر	بروز جمعرات 3 محرم الحرام 1432ھ 9 دسمبر 2010ء	69
17	بمبینو کا عذاب	بروز اتوار 6 محرم الحرام 1432ھ 12 دسمبر 2010ء	73
18	شہادت و خلافت	بروز منگل 8 محرم الحرام 1432ھ 14 دسمبر 2010ء	76
19	سفر شہادت	بروز جمعرات 10 محرم الحرام 1432ھ 16 دسمبر 2010ء	84
20	اسلام اور مغربی جمہوریت	بروز ہفتہ 12 محرم الحرام 1432ھ 18 دسمبر 2010ء	87
21	نشانِ راہ	بروز سوموار 14 محرم الحرام 1432ھ 20 دسمبر 2010ء	94
22	ڈوبتے سورج کی زمین	بروز جمعرات 17 محرم الحرام 1432ھ 23 دسمبر 2010ء	98
23	آستیں میں رہتے ہیں	بروز اتوار 20 محرم الحرام 1432ھ 26 دسمبر 2010ء	101
24	امام اور چور	بروز منگل 22 محرم الحرام 1432ھ 28 دسمبر 2010ء	104
25	مشکلات اور اس کا حل	بروز جمعرات 24 محرم الحرام 1432ھ 30 دسمبر 2010ء	109
26	ایمان کی کمتری	بروز ہفتہ 26 محرم الحرام 1432ھ یکم جنوری 2011ء	113

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
27	معاشی دہشت گرد	بروز سوموار 28 محرم الحرام 1432ھ 3 جنوری 2011ء	116
28	میں تم پر اعتماد نہیں کرتا	بروز بدھ یکم صفر الحرام 1432ھ 5 جنوری 2011ء	120
29	امید کا چراغ	بروز جمعتہ المبارک 3 صفر الحرام 1432ھ 7 جنوری 2011ء	124
30	تلاشِ حق	بروز اتوار 5 صفر الحرام 1432ھ 9 جنوری 2011ء	128
31	فکر کرنا داں	بروز منگل 7 صفر الحرام 1432ھ 11 جنوری 2011ء	132
32	خون کے چھینٹے	بروز جمعرات 9 صفر الحرام 1432ھ 13 جنوری 2011ء	136
33	عزتِ نفس اور چھترول	بروز اتوار 12 صفر الحرام 1432ھ 16 جنوری 2011ء	139
34	چلو اپنے رب کی طرف	بروز جمعرات 16 صفر الحرام 1432ھ 20 جنوری 2011ء	142
35	ایک خون ہی کافی ہے	بروز جمعتہ المبارک صفر الحرام 1432ھ 20 جنوری 2011ء	145
36	اٹھو وگرنہ سحر نہ ہوگی پھر کبھی	بروز منگل 28 صفر الحرام 1432ھ یکم فروری 2011ء	148
37	سروں کی فصل	بروز جمعرات 30 صفر الحرام 1432ھ 3 فروری 2011ء	151
38	وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں	بروز سوموار 4 ربیع الاوّل 1432ھ 7 فروری 2011ء	156
39	آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو	بروز ہفتہ 2 ربیع الاوّل 1432ھ 5 فروری 2011ء	160
40	خوابیدہ ضمیر	بروز بدھ 6 ربیع الاول 1432ھ 9 فروری 2011ء	163
41	اک ذرا صبر	بروز جمعرات 7 ربیع الاول 1432ھ 10 فروری 2011ء	167
42	اپنے سائے سے بھی خوفزدہ	بروز اتوار 10 ربیع الاول 1432ھ 13 فروری 2011ء	169
43	عید میلاد النبی	بروز منگل 12 ربیع الاول 1432ھ 15 فروری 2011ء	172
44	معتبر اندھیرا کیوں	بروز ہفتہ 16 ربیع الاول 1432ھ 19 فروری 2011ء	176
45	زندگی موت کی امانت ہے	بروز سوموار 2 ربیع الثانی 1432ھ 7 مارچ 2011ء	179
46	گاڑی بلٹ پروف اور دل شرم پروف	بروز جمعرات 5 ربیع الثانی 1432ھ 10 مارچ 2011ء	182
47	مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے	بروز اتوار 8 ربیع الثانی 1432ھ 13 مارچ 2011ء	185
48	حکمت یا حماقت	بروز منگل 10 ربیع الثانی 1432ھ 15 مارچ 2011ء	188
49	کڑکتے کوڑے یا ڈالروں کے توڑے	بروز بدھ 11 ربیع الثانی 1432ھ 16 مارچ 2011ء	191
50	گدھوں کا راج	بروز سوموار 16 ربیع الثانی 1432ھ 21 مارچ 2011ء	194
51	ضمیر فروش	بروز جمعتہ المبارک 20 ربیع الثانی 1432ھ 25 مارچ 2011ء	198
52	دوستی کا حساب	بروز بدھ 25 ربیع الثانی 1432ھ 30 مارچ 2011ء	202
53	جان غنیمت جانو	بروز ہفتہ 28 ربیع الثانی 1432ھ 2 اپریل 2011ء	205

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
54	نئے سپاہی اور امریکا	بروز سوموار 30 ربیع الثانی 1432ھ 4/اپریل 2011ء	208
55	کرکٹ ڈپلومیسی، لاحاصل مشق	بروز بدھ 2 جمادی الاوّل 1432ھ 6/اپریل 2011ء	211
56	منافقت کے نصاب	بروز ہفتہ 5 جمادی الاوّل 1432ھ 9/اپریل 2011ء	215
57	موہن لال سے من موہن سنگھ تک	بروز بدھ 9 جمادی الاوّل 1432ھ 13/اپریل 2011ء	218
58	شکاری	بروز اتوار 13 جمادی الاوّل 1432ھ 17/اپریل 2011ء	221
59	کہیں تلوار سے کانٹا یاؤں کا نکلتا ہے	بروز منگل 15 جمادی الاوّل 1432ھ 19/اپریل 2011ء	224
60	تکلف بر طرف قاتل کو قاتل لکھ دیا جائے	بروز جمعرات 17 جمادی الاوّل 1432ھ 21/اپریل 2011ء	227

طاقت کا اصول یا اصول کی طاقت

جب ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہزاروں سال کی تاریخ سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہندو سماج کی ذات پات پر تقسیم انسانی تاریخ کی شرمناک سازش تھی اور یہ مقتدر طبقات نے کی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ مقتدر طبقات کن لوگوں پر مشتمل تھے؟ یہ وسطی ایشیا کے آریا تھے جنہوں نے حملہ کر کے ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور یہاں کے مقامی لوگوں یعنی دراوڑوں اور دوسرے لوگوں کو غلام بنالیا۔ اسے دوام بخشنے کیلئے ایک مذہب تخلیق کیا اور ذات پات پر مبنی نظام کو مذہب کا لازمی جزو بنا دیا، اس ظالمانہ اور غیر انسانی نظام کو مذہبی تقدس عطا کر دیا۔ ذات پات کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ غالب اور قابض آریا نسل کی واضح ترین اکثریت اونچی جاتی برہمن اور کھشتری بن گیا اور باقی مغلوب اور غلام لوگوں کو ویش اور شودر ذاتوں میں ڈال دیا گیا۔ یہ ہے اونچی جات کی وہ ذہنیت جس نے ہندوستان کا امن غارت کر رکھا ہے۔ بدھ مت جیسا مذہب بھی اس استحصالی اور انسان کش نظام کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور انجام کار اسی میں ضم ہو گیا۔

اسلام ایک انقلابی اور جاندار مذہب تھا جس کو موجودہ اصطلاح میں جمہوری کہا جاتا تھا اور یہ ،، تمام انسان برابر ہیں ،، پر زور دیتا تھا کیونکہ اسلامی تعلیمات ہندوستان کے استحصالی طبقوں یعنی اونچی جاتی کے مفادات کیلئے زہر قاتل تھیں، سو اس کا منطقی نتیجہ تصادم ہی تھا۔ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد اسلامی عدالتیں قائم کی گئیں۔ اس اونچی جاتی کے ظلم کی سزا چونکہ عدالتوں سے ملنے لگی اس لئے عوامی سطح پر ظلم رک گیا۔ حکومتی سطح پر چونکہ انسانی فسادات کی پالیسی اپنائی گئی اس لئے ذات پات کا ظالمانہ نظام کمزور پڑ گیا لیکن صدیوں کے تصادم اور کشمکش کے باوجود برہمن اور کھشتری یعنی اونچی جاتی کی ذہنیت نہ بدلی اور مسلمانوں سے نفرت بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کے بعد یہ نفرت پورے شدومد کے ساتھ ظاہر ہو گئی اور انہوں نے کھل کر انگریزوں کی حمائت اور مسلمانوں سے دشمنی کی۔ انہوں نے برملا کہا کہ ہم بھارت میں رام راج قائم کریں گے۔
آخر کار کانگریس پر بنیاد پرست اور ہندو قوم پرست چھا گئے جو تعصب اور پست ذہنی کا شکار تھے۔ انہوں نے قائداعظم کے کسی مطالبے اور تجویز کو درخور اعتنانہ سمجھا اور بالآخر ان کا یہ رویہ تقسیم ہند پر منتج ہوا۔ کشمیر پر قبضہ بھی اسی رویہ کا آئینہ دار ہے۔ بہر حال اونچی جاتی کی بالادستی اور استحصالی ذہنیت نے ایک ہزار سال میں تشکیل پانے والے ہندو مسلم وضع داری کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

تقسیم ہند کے بعد بھارت کی ہیئت مقتدرہ پر وہ عناصر چھا گئے جو تقسیم کو دل سے قبول نہیں کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو بحر ہند کو بھارت کی جھیل بنانا چاہتے تھے اور جنوبی ایشیا کے جملہ ممالک پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ سوچ فی الحقیقت اونچی جاتی کی ذہنیت کا مظہر تھی۔ یہی وہ نکتہ ہے جو جنوبی ایشیا میں تناؤ، کشیدگی اور عدم استحکام کی وجہ بنا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ بھارتی قیادت ناک کو کان کے پیچھے سے پکڑتی ہے۔ وہ بعض مراحل اور مقامات پر یہ کہتی ہے کہ "اگر بھارت کشمیر کا مسئلہ حل بھی کر دے تو پاکستان پھر کوئی اور مسئلہ کھڑا کر دے گا" جب کہ پاکستان کا مؤقف یہ ہے کہ بھارت کے حکمراں تقسیم ہند کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کے پاس محکم دلیل یہ ہے کہ جب 1971ء میں بھارت کو موقع ملا تو اس نے مشرقی پاکستان کو جدا کر کے بنگلہ دیش کی الگ ریاست قائم کرنے میں ذرا برابر ہچکچاہٹ نہ برتی، اس لئے پاکستان کا بھارت پر اعتماد نہ کرنا ایک جائز امر ہے۔

آیئے اب نگاہ ڈالتے ہیں جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک پر، سری لنکا کے بھارت کے ساتھ شدید اختلافات ہیں، وہ تامل ٹائیگر کی شکل میں بھارتی دراندازوں کا برسوں سے شکار ہے۔ بنگلہ دیش کے ساتھ بھارت کی سرحدی کشیدگی اور تنازع پایا جاتا ہے۔ کئی مرتبہ بھارت اور بنگلہ دیش کی سرحدوں پر شدید فوجی جھڑپوں میں درجنوں فوجی بھی ہلاک ہوئے ، بنگلہ دیش وقتاً فوقتاً بھارتی مداخلت کی شکائت بھی کرتا رہا لیکن بھارتی سرحدی فوج اپنے تکبر میں بنگلہ دیش کی کسی بھی شکائت کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بالآخر بھارت کے انٹیلی جنس ادارے "را" نے حسینہ واجد کو بنگلہ دیش کا وزیر اعظم اور بنگلہ دیش کی فوج کو ہمیشہ کیلئے اپنا تابع کرنے کی ایک خطرناک سازش تیار کرتے ہوئے بنگلہ دیش رائفلز کے ہاتھوں فوج کے اٹھاون اعلیٰ آفیسر جس میں ایک میجر جنرل، چار بریگیڈیئر شامل تھے، کا ایسا کھلا قتل عام کروایا کہ فوج کے ڈسپلن کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا اور دوسری طرف بھارت نے بنگلہ دیش کی حکومت اور فوج کے اعلیٰ آفیسرز کو یہ کھلا پیغام دیا کہ اب بنگلہ دیش کو بھارت کی ایک کالونی کے طور پر رہنا ہو گا اور بنگلہ دیش کی خود مختاری بھارت کے احکام کی تابع ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بنگلہ دیش بظاہر ایک آزاد ملک مگر بھارت کی ایک کالونی سمجھا جاتا ہے جس کی ائیر فورس اور نیوی ایک علامت کے طور پر ملک میں موجود ہے۔

بھوٹان کو جیسا کہ سب پر عیاں ہے، بھارت نے پابند کیا ہوا ہے کہ وہ اس کی خارجہ پالیسی پر کاربند رہے گا۔ اس بناء پر بھوٹان کے عوام میں شدید ناراضگی پائی جاتی ہے بلکہ طلبہ کالجوں اور بعض اوقات سڑکوں پر اس کے خلاف احتجاج بھی کر چکے ہیں جسے بھارتی حکومت نے پوری طرح عالمی میڈیا کا حصہ نہ بننے دیا۔ ماریشس بھارتی بالادستی سے نالاں ہیں، ابھی گزشتہ برسوں میں بھارتی ایجنسی،،را،، اور بھارتی فوج نے سول لباس میں ماریشس میں زبردست آپریشن کیا اور "بھارت مخالف عناصر" کے خلاف سخت کاروائی کی۔

نیپال ایک ہندو ملک ہے اور سرکاری طور پر ہندو مذہب کو اپنایا ہوا ہے لیکن یہ بھی بھارتی مداخلت کا شکائت کنندہ ہے۔ بھارت چاہتا ہے کہ نیپال کی خارجہ پالیسی اس کے تابع ہو۔ بھارت نیپال کے چین اور پاکستان سے شاندار تعلقات کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی بے محل نہ ہو گا کہ بھارت پاکستان کے خلاف یہ پروپیگنڈہ بڑے شدومد کے ساتھ کرتا ہے کہ پاکستان مذہبی تعصبات پھیلاتا ہے۔ اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی کہ پاکستان کے ایک مذہبی ہندو ریاست سے بہترین تعلقات ہیں۔ یہ اسلامی پاکستان کا ہی حسن ہے کہ پاکستان میں آج تک ایک ہندو مسلم فساد نہیں ہوا ،اور پاکستان میں ہندو برادرانِ وطن انتہائی مامون و محفوظ رہ رہے ہیں اور سیکولر بھارت میں کوئی اقلیت محفوظ نہیں ہے۔ آئے دن فساد رہتے ہیں حتیٰ کہ نہ صرف اونچی جاتی نہ صرف شودروں بلکہ عیسائیوں کو بھی زندہ جلاتی رہتی ہے۔ گجرات کے مسلم کش فسادات نے تو اونچی جاتی ہندوں کے منہ پر ایسی کالک مل دی ہے کہ جس کو دھونے کیلئے سینکڑوں گنگا و جمنا بھی ناکافی ہیں۔ جنوبی ایشیا کے مذکورہ بالا چھ ممالک بھارتی عزائم سے نالاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارک تنظیم آج تک ثمر آور نہ ہو سکی۔ بھارت کا مؤقف اس ضمن میں بہت غیر عاقلانہ ہے اور سارک کے فعال نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ممبرز نے بھارت کے خلاف اتحاد بنا رکھا ہے اور یہ عملی طور پر بھارت کے خلاف ایک فورم بن گیا ہے جبکہ اس تمام صورتحال کی وجہ بھارت کا منفی رویہ ہے۔

بھارت کے عزائم میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان ہے۔ جنوبی ایشیا کے باقی ممالک کو بھارت کے سامنے اپنا جائز مؤقف اختیار کرنے میں پاکستان سے حوصلہ ملتا ہے۔ خلیج اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک پر اثر انداز ہونے میں پاکستان رکاوٹ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھارت کے علاقائی طاقت بننے میں بھی پاکستان سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جہاں تک بھارت اسرائیل تعلقات کا معاملہ ہے تو اسرائیل پاکستان کو مستقبل کا اسٹریٹیجک حریف سمجھتا ہے اور مشرقِ وسطیٰ دونوں کے مفادات کا تصادم کا میدان ہے۔ واحد ایٹمی طاقت ہونے کی بناء پر اسرائیل اپنے آپ کو علاقائی طاقت سمجھتا ہے ،ہمسایہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک مسلم ایٹمی طاقت ہونے کی بناء پر پاکستان پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اسرائیل بھارت کی پاکستان پر بالادستی کو یقینی بنانے کیلئے اعلیٰ ٹیکنالوجی منتقل کر رہا ہے تاکہ پاکستان کی تمام تر توجہ بھارت تک رہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو سیاسی طبع کے اعتبار سے سوشلسٹ سمجھے جاتے تھے، اسی لئے پنڈت نہرو نے اس ذہنی اپچ کے باعث چین کے ساتھ رشتوں کو نظریات کے دھاگے میں باندھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سرحدی تنازعات زمینی حقائق بن کر نظریاتی رشتوں پر حاوی ہو گئے اور 1962ء میں دونوں ملک تباہ کن جنگ لڑنے کی انتہاء تک جا پہنچے۔ اس کے بعد ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ پاک چین دوستی کے نعروں میں دبتا چلا گیا۔ خطے کی سیاست میں مسئلہ کشمیر کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کھلے حریفوں کی طرح ابھرتے چلے گئے اور چین طاقت کی اس آنکھ مچولی میں پاکستان کا سدا بہار دوست اور منطقی طور پر بھارت کا حریف سمجھا جانے لگا۔ سی آئی اے کی ایک رپورٹ کے مطابق پنڈت جوہر لال نہرو چین کی طاقت سے بہت خوفزدہ تھے اور چین کو ناراض ہونے کا کوئی موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی جب اقصائے چین کی شاہراہ پر چین کی سرخ فوج کے ہاتھوں بھارتی فوجی مارے گئے تو پنڈت نہرو نے اس پر باقاعدہ احتجاج نہیں کیا بلکہ بھارتی وزارتِ داخلہ کی طرف سے سرحدی جھڑپوں اور خلاف ورزیوں کی جو رپورٹس پنڈت نہرو کو بھیجی جاتی تھیں، وہ ان فائلوں کو داخل دفتر کر دیتے تھے اور اس تصادم پر پنڈت نہرو نے باقاعدہ احتجاج کی بجائے ایک جملے میں ڈپلومیٹک تبصرہ کیا تھا کہ "یہ ہتھیاروں کا نہیں ارادوں کا تصادم تھا"۔ کہا جاتا ہے کہ بھارت کی بیوروکریسی بھی پنڈت نہرو کی ان معذرت خواہانہ اداؤں پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

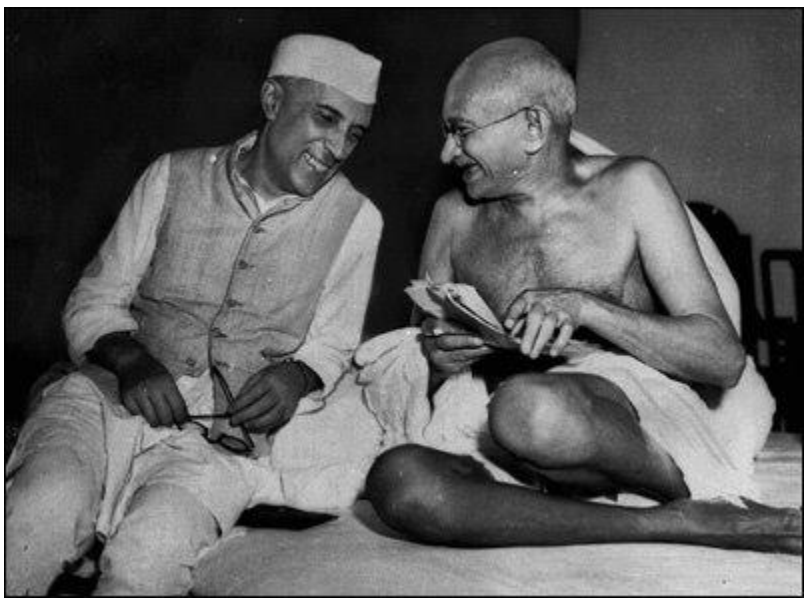

بھارتی سیاست کے ایک اہم نباض اور معروف دانشور کلدیپ نیئر نے اپنے ایک مضمون میں دعویٰ کیا تھا کہ ،، بالآخر پنڈت نہرو چین سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ نہرو نے بطور وزیر اعظم ریاستی وزرائے اعلیٰ کو خط لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ چین اور بھارت کے درمیان تنازعہ محض سرحدی نہیں بلکہ اس کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ دونوں ایشیا کے بڑے ملک ہیں اور دونوں کا وسیع و عریض سرحد کی حد بندی پر اختلاف ہے۔ ان فیصلوں کا انحصار اس پر ہے کہ نہ صرف

سرحد پر بلکہ ایشیا کی سربراہی میں کون کس پر حاوی ہوتا ہے"۔ اگر کلدیپ نیئر کا یہ تجزیہ درست مان لیا جائے تو پھر چین اور بھارت میں تنازعہ محض سرحدی چوکیوں اور لکیروں کا نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ ایشیا کی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور فوجی قیادت کا ہے۔ بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے 2007ء میں چین کے دورہ کو 45 سالہ جمود کو توڑنے اور ایک خوشگوار تازہ ہوا کے جھونکے سے تعبیر کر کے اس خطے کو امن کا گہوارہ بنانے کا جو دعویٰ کیا تھا، کشمیر کی بگڑتی صورتحال نے اس دعوے کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی ہے۔ چین نے بھارتی فوجی جنرل کو محض کشمیر میں جاری ظلم و ستم کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے ویزہ دینے سے انکار کر دیا اور دوسری طرف کشمیریوں سے یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو بھارتی پاسپورٹ کی بجائے ایک سادے کاغذ پر چین کا ویزہ دینے کا اعلان کر کے بھارت اور دنیا بھر کو ایک واضح پیغام دے دیا کہ وہ اس خطے میں کشمیر کو ایک متنازعہ مسئلہ سمجھتا ہے۔

اس خطے میں بھارتی بالادستی کا خواب دیکھنے کی غلطی کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ چین اور پاکستان نہ صرف دوست بن گئے بلکہ اب تو تزویراتی پارٹنر بن گئے بنا دیا۔ اب میں یہ اضافہ بھی ہیں۔ گزشتہ دنوں بھارتی ایڈمرل نیر کا بیان ایک مرتبہ پھر شائع ہوا کہ چین نے پاکستان کو بھارت کا ایٹمی حریف اور کر دوں کہ چین اب پاکستان کو تیزی کے ساتھ خلائی اقتصادی قوت بنانے پر کمربستہ ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ چین نے بھارت کو گھیر اہوا ہے اور یہ اب تک جنوبی ایشیا تک محدود ہے۔ چین اس کو بالادست قوت کبھی بھی نہیں بننے دے گا اور اس بات کو امریکا، روس ، برطانیہ اور فرانس بھی سمجھتے ہیں اور وہ پاکستان کے ضمن میں چین کی حساسیت سے بھی آگاہ ہیں، اس لئے وہ پاکستان کے معاملے میں محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر چین سپر طاقت بن کر ابھر رہا ہے تو ان دگرگوں حالات کے باوجود پاکستان بھی تیسری دنیا میں ایک ایٹمی طاقت کے علاوہ لیڈنگ ٹیکنالوجی پاور بن کر ابھر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ بھارت پاکستان کو زیر اثر لانے میں آج تک ناکام رہا ہے۔

چین بھارت تعلقات کی اس پر پیچ کہانی پر نظر ڈالیں تو اس میں مکافاتِ عمل کا ایک پہلو بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ دہلی سرکار نے پچھلے تریسٹھ برس سے کشمیریوں اور پاکستان کے ساتھ جو کچھ کیا اس میں اصول اور انصاف کی بجائے طاقت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بھارت کشمیر کے بارے میں عالمی ادارے کی ان قراردادوں کو پرِ کاہ کے برابر اہمیت نہیں دیتا جہاں خود بھارت کشمیر کے تنازعے پر اقوام عالم سے انصاف کیلئے گیا تھا۔ بھارت کے اس غیر اصولی اور غیر اخلاقی رویے کی بناء پر چین نے بھی سرحدی تنازعات کے بارے میں چھ ملکوں کی پرائیویٹ کوشش "کولمبو تجاویز" کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ گزشتہ پچاس سال میں بھارت نے کولڈ وار میں روس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کے ساتھ ساتھ مغرب سے بھی فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن چین سے تعلقات بگاڑ کر اور مسابقت کا رویہ اختیار کر کے جو فاش غلطی کی، اس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہے اور آئندہ بھی بھگتے گا۔

بھارت نے پاکستان کی طرف سے امن کی ہر کوشش کو کمزوری کی علامت یا بھیک سمجھ کر تنازعے کی اصل وجہ مسئلہ کشمیر سے نظریں چرانے کی کوشش کی اور ہمیشہ یہ کوشش کی کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دینے کی بجائے،، اسٹیٹس کو،، پر راضی ہو کر آزاد کشمیر پر قناعت کر لے۔ چین اور بھارت کی طرح بھارت اور پاکستان کے تعلقات کی داستان خوشگواریت اور جوش و جذبے کی کتنی ہی بلندیوں سے جنگوں اور کشیدگی کی پستیوں تک پہنچنے سے عبارت ہے۔ چین کی طرح امن آج بھارت کی بھی اشد ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی، جو اپنی سرزمین کو مغربی اور امریکی سرمایہ کاروں کیلئے معاشی

جنت بنانے میں دن رات کوشاں ہے لیکن اپنے لئے امن چاہنے کے باوجود بھارت کشمیریوں کو باعزت زندگی کا تحفہ دینے کو تیار نہیں۔ امن کی ساری قیمت کشمیریوں اور پاکستان سے وصول کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ دہلی اور بیجنگ میں سیاسی تنازعے کو ٹائم بم قرار دینے اور اسے سیاسی، معاشی اور تجارتی پیش رفت کو تباہ کرنے کی صلاحیت کا حامل قرار دینے والے بھارتی دانشور پاکستان کو یہ سجھاؤ دینے کو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ پہلے وہ کشمیر جیسے خوفناک سیاسی مسئلے کو نظر انداز کر کے بھارت کے ساتھ تجارت، ثقافت اور معیشت کے شعبوں میں رشتے استوار کرے۔ آخر یہ دانشور بھارت کو یہ مشورہ دینے سے کیوں گریز کر رہے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ نہ تو بیس سال پہلے وی پی سنگھ سرکار کی طرف سے مقرر کردہ راجیو گاندھی اور مذاکرات کار حل کر پائے تھے اور نہ اب من موہن سنگھ کی طرف سے مذاکرات کار اس مسئلے کی گتھی سلجھا پائیں گے۔ ایک طرف تو بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قرار دینے میں تفاخر محسوس کرتے ہیں اور دوسری طرف کشمیری بزرگ رہنما سید علی گیلانی کا سچ سننے کی تاب نہیں اور ان پر دہلی میں قاتلانہ حملہ کر کے سچ کی آواز کو دبانے کے فاشسٹ ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

بھارت کا کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور منفی رویہ جنوبی ایشیا میں کشیدگی کی اصل وجہ ہے اور جب تک بھارت کی یہ ذہنیت تبدیل نہیں ہو گی، جنوبی ایشیا میں امن واستحکام نہیں ہو گا۔ اگر بھارت طاقت کے اصول کی بجائے اصول کی طاقت کے فلسفے کی کارفرمائی کا آغاز خود اپنے سے کرلے تو ممکن ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے علاوہ اقوام عالم بھی بھارت کی آواز کو وزن دینے پر غور کریں۔

بروز جمعرات 20 ذوالقعدہ 1431ھ 28/ اکتوبر 2010ء

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل والوں کو نجانے کیا سوجھی کہ اپنی حالیہ اور تازہ رپورٹ میں پاکستان کو بد دیانت ملکوں کی فہرست میں 34ویں نمبر پر کھڑا کر دیا اوراس بات کی اطلاع بھی فراہم کی کہ پہلے اس کا نمبر 42واں تھا۔ گویا ملک میں بد عنوانی اور کرپشن کو ایسی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ ہر سال ملکی دولت کے تین سو ارب روپے سے زائد لوٹ لئے جاتے ہیں۔ کچھ سال پہلے میڈیا نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی مایہ ناز بحری فوج کے ایک سربراہ کے بارے میں انکشاف کیا کہ موصوف ایک محتاط اندازے کے مطابق نیوی کیلئے خریدے گئے سازوسامان میں 35لاکھ ڈالر سے زائد رقم کمیشن کے طور پر لے اڑے تھے تو تھوڑی دیر کیلئے میڈیا میں ہاہاکار ہوئی لیکن وقت کے ساتھ معاملہ فراموش کر دیا گیا۔ کچھ سالوں کے بعد موصوف امریکا سے واپس آئے اور لوٹی ہوئی رقم کا کچھ حصہ لوٹا کر اب پاک پوتر ہو کر زندگی کے باقی ایام عیش و عشرت سے گزار رہے ہیں۔

ماضی قریب میں ہمہ مقتدر شخصیات کے چند ہونہار، نونہال آج نہ صرف اربوں پتی ہیں بلکہ کھلے بندوں اپنی بیش بہا دولت کا بھرپور فائدہ ابھی اٹھا رہے ہیں۔ کتنے ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز سرکاری افسر، سیاستدان، ٹیکنوکریٹ بیرونی ممالک میں دادِ عیش دے رہے ہیں حالانکہ ان میں سے کئی ایک کے خلاف بھاری رشوت اور سنگین بد عنوانی کے مقدمات اب تک زیر التواء ہیں جن میں انہیں مفرور قرار دیا جا چکا ہے۔ چند ایک مقدر کے سکندر ایسے بھی ہیں جو اب بھی ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر براجمان ہیں اور کچھ ایسے جو پہلے مملکت خداداد پاکستان کے مالیاتی شعبے کے نگران بھی تھے اور پالیسی ساز بھی۔ جب تک ہوا کا رخ موافق رہا وہ سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ ان کو اپنا اور ان مہربانوں کا مفاد جن کے وہ ممنون احسان تھے اس قدر عزیز تھا کہ ستم رسیدہ عوام کی بھلائی کا خیال تک دل سے بھلا بیٹھے، ملک تو کیا آنے والی نسلوں کو بھی گروی رکھتے گئے۔ اشرافیہ کو عیش و عشرت کی لت ڈال گئے ۔ ہم سے ایک سال بعد آزاد ہونے والے پڑوسی ملک چین کی مثال پ کے سامنے ہے جس کے عظیم ترین لیڈر مازوئے تنگ نے سادگی، کفات شعاری اور خود کفالت کو رواج دیا، وہ اور ان کے تمام ساتھی سختیاں جھیلتے رہے۔ جن اصولوں پر قائدین خود کاربند ہوں، عوام کیلئے انہیں دل و جان سے قبول کرنا اور ان پر بخوشی عمل کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ انقلاب کے بعد پہلی نسل کی قربانیاں رنگ لائیں اور اب چین دنیا کا عظیم تر ملک بن چکا ہے۔

پڑوسی ملک ہندوستان میں پنڈت نہرو نے بھی اپنے دورِ حکومت میں چین کی طرح سادگی، کفات شعاری اور خود کفالت کی بنیاد رکھی اور آج بھارت اس کے ثمر سے کسی حد تک مستفیض ہو رہا ہے۔ بھارت کے متعلق ماہرین کی رائے ہے کہ باوجود اندرونی اور بیرونی مشکلات کے اکیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں وہ دنیا کے تیسرے یا چوتھے نمبر پر آجائے گا اور ہم.....ہاتھ میں کشکول لئے پھرتے ہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ امریکا کی بارگاہ میں سربسجود ہیں، جس کے منشی اور کارندے ہم پر حکم چلاتے ہیں اور ہم بلاچوں چرا حکم بجالاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم ان کارندوں میں سے بہت سے ہمارا ہی کھاتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں مانگ تانگ کے، کئی دفعہ ناک سے لکیریں کھینچ کر۔ جو قرضہ ہم غیر ممالک یا مالیاتی اداروں سے لیتے ہیں اس میں سے یہ،، فرشتے،، مشاورت اور خدمات کے نام پر بہت کچھ ہتھیا لے جاتے ہیں۔ مالِ غنیمت میں سے کچھ سکے وہ "مقامی ہمجولیوں" کی جھولی میں بھی ڈال دیتے ہیں تاکہ نہ صرف اصل کھیل پردوں کے پیچھے چھپا رہے بلکہ سنہری کلغیوں والے مرغانِ چمن بہار کے گیت اس وقت تک گاتے رہیں جب تک حکومت نہ بدل جائے۔

حکومت بدلتے ہی یہ موسمی مینڈک تھوڑی دیر کیلئے یوں خاموش ہو جائیں گے جیسے دلدل میں گھس گئے ہوں مگر جلد ہی پھر نکل آئیں گے۔ راگ پھر سے شروع ہو گا مگر سر تال پہلے سے مختلف۔ اب خانہ بربادی کا ذکر ہو گا، ستیاناس اور بدعنوانی کے ایسے قصے سنائیں جائیں گے کہ سننے والا توبہ توبہ کا ورد کرتے کانوں کو ہاتھ لگائے اور سوچے کہ یہ ملک کتنا بدقسمت ہے کہ اس میں بھیڑوں کے روپ میں بھیڑیئے نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ ان میں سے کئی اعلیٰ ترین عہدوں اور مقامات تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ طالع آزما ایسی چکنی مٹی سے بنے ہوتے ہیں کہ عوام کے اعتماد کی مقدس امانت بھی ان کی گھٹی میں پڑے حرص و ہوا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، نہ صرف پوری ڈھٹائی سے وہ موقع ملتے ہی کھل کھیلتے ہیں بلکہ اپنی "بہادری و جرأت" پر فخر کرتے ہیں۔ بعد میں پکڑے جائیں تو بھی اپنے کئے پر نادم ہونے کی بجائے یوں سینہ تان کر اپنا دفاع کرتے ہیں کہ اعلیٰ عدلیہ کے جج کو ان کے بارے میں کہنا پڑتا ہے "کرپٹ عناصر شرمندہ نہیں بلکہ فخر سے چلتے ہیں..... ان سے کئی کئی ملین ڈالر حکومت نے وصول کئے ہیں اس کے باوجود وہ گالف کھیل رہے ہوتے ہیں، معاشرے کو ان سے الگ تھلگ رہنا چاہئے اور ان کا بائیکاٹ کرنا چاہئے"۔

خطا تو معاشرے کی بھی ہے، اچھائی برائی کی تمیز کمزور پڑ جائے، عجز و انکسار کمزوری کی علامت تصور ہونے لگے، برائی سے بچنا بزدلی کہلائے اور چور، ڈاکو، رہزن کیلئے دلوں سے نفرت مٹ جائے تو کیوں نہ بھیڑیئے بھیڑوں کے گلے کے نگہبان کا کردار ادا کریں۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ انسانی سرشت میں مضمر ہے کہ ہر انسان دل کی گہرائیوں میں نہ صرف نیکی اور بدی کا واضح احساس رکھتا ہے بلکہ وہ برائی کے خلاف جدوجہد کے جذبے سے بھی عاری نہیں۔ حالات کا جبر البتہ اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ روزمرہ مشاہدہ اسے واضح اشارے دیتا ہے کہ خوامخواہ،، پنگا،، لینے میں سراسر حماقت ہے، جو سر پھرے پرائی آگ میں کود پڑتے ہیں ان کے نہ صرف پاؤں جھلس جاتے ہیں بعض اوقات یہ تن سوزی انہیں عالمِ نزع سے عدم کی منزل تک لیجاتی ہے۔ "عقلمندی" انہیں ناانصافی، ظلم اور بے رحمی سے نبرد آزما ہونے کی بجائے خاموش رہنے اور بہت کچھ "پی جانے" کی ترغیب دیتی ہے، یوں ان کی قوت برداشت کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے جس سے برخود ظالموں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔

وہ چنگیز خان کے لشکریوں کی طرح ہر مرغزار پر چڑھ دوڑتے ہیں، بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے نہ صرف نہتے اور بے بس عوام کی طاقت جواب دے جاتی ہے بلکہ انسانیت کی روح تک ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ آٹھوں پہر گردش کرنے والا آسمان پھر عجیب و غریب مناظر دیکھتا ہے۔ مفتوحہ شہر میں ایک ممتاز شہری کسی غیر مسلح تاتاری کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، اسے وہیں لیٹ جانے کا حکم ہوتا ہے جس کی بلاچوں چراں تعمیل ہوتی ہے۔ تاتاری یہ کہہ کر "یہیں لیٹے رہنا جب تک میں کیمپ سے تلوار لا کر تمہارا گلا نہ کاٹ دوں" چلا جاتا ہے۔ معزز شہری بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے، نہ اسے فرار کا خیال آتا ہے نہ جان بچانے کی سوجھتی ہے۔ کافی دیر کے بعد تاتاری آتا ہے اور اس کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ۔ (التین4-6)
"یقیناً" ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت (احسن تقویم) میں پیدا کیا، پھر اسے نیچوں سے نیچا (اسفل سافلین) کر دیا، ماسوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے"۔

حد سے بڑھ جانے والی سفاکی غلامی کو پیدا کرتی ہے۔ کوئی بھی خواہ مخواہ گردن کٹوانا نہیں چاہتا۔ نہتے انسانوں کا جم غفیر توپ و تفنگ سے مسلح لشکر کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا ہے خصوصاً جب قتل عام کا اذن ہو چکا ہو یا ہو سکتا ہو۔ ہلاکو خان نے اہلِ بغداد کو تہہ و تیغ کیا تو دریا کا پانی گلرنگ ہو گیا۔ نادر شاہ نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی، گلیوں میں انسانی خون بارش کے پانی کی طرح بہنے لگا۔ 1857ء میں بار بار اجڑنے والی دلی کو پھر ویسا ہی المیہ پیش آیا۔ شہزادگان کی لاشیں کئی دن درختوں سے لٹکتی رہیں، نازونعمت میں پلے بڑھے کتنے ہی اہل ثروت خون کی ہولی کی بھینٹ چڑھ گئے، جو بچ رہے وہ فاتحین کی قدم بوسی کو بڑھے، اپنی وفاداری کا یقین دلانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، تابعداری کو شرط استواری سے یوں سنوارا کہ وہ اصل ایمان ٹھہری۔

عرب کے خیمے میں اونٹ گھسنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سردی میں ٹھٹھرتا بیچارہ عرب کر ہی کیا سکتا ہے۔ اونٹ کی ناک میں نکیل ہوتی اور رسی کو سوار نے مضبوطی سے تھاما ہوتا تو یہاں تک نوبت ہی نہ پہنچتی۔ اترنے پر بھی اونٹ خیمے سے باہر زمین میں گاڑے کھونٹے سے باندھ دیا جاتا۔ ایک دفعہ وہ خیمے میں گھس جائے تو بازی مالک کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے، اب وہ بے بس اور لاچار ہے۔ انحصار اب اونٹ کی خصلت پر ہے، اگر نیک طینت ہے تو مالک کیلئے بھی خیمے کے اندر گنجائش پیدا کرے گا، اگر کینہ پروری پر تل گیا تو مالک کیا اس کا باپ بھی آجائے، پر نالہ وہیں رہے گا جہاں تھا۔ فاتح طبقے روایتی اونٹ کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ ان کی شرافت، رعایا پروری اور بندہ نوازی کے گن گاتے ہوئے التماس کی جاسکتی ہے کہ شرفِ انسانی کی لاج رکھیں اور غلاموں کو آزادی کی نعمت لوٹا دیں۔ ایسی التجائیں اگر کافی لوگوں کی طرف سے ہوں اور بار بار کی جائیں تو پتھر کو بھی پگھلا دیتی ہیں۔ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ جسٹس رستم کیانی مرحوم نے 1959ء میں دیئے گئے خطبہ یومِ اقبال میں ایک شوریدہ سر شاعر کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا:

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف
قائداعظم کا پاکستان دیکھ

کیانی صاحب اس وقت حکومت کے قانونی مشیر تھے۔ ان سے رائے طلب کی گئی تھی کہ اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے، انہوں نے اس کا یوں جواب دیا کہ،، خدا کے بندو! وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو، پاکستان کی طرف دیکھو کیا یہ وہی ملک ہے جو قائداعظم نے تراشا تھا"..... اب تو غالباً روح پاکستان بھی اپنے "جانثاروں" سے یہی سوال کرتی ہو گی۔ کیا ہم سے کوئی جواب بن پاتا ہے؟ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی بھی لمحے میں بھی یہ سوچنے یا معلوم کرنے کی زحمت گوارہ کی کہ مملکت خداداد کیونکر صفحہ ہستی پر نمودار ہوئی۔ بانیانِ پاکستان کے خواب کیا تھے، آرزوئیں، تمنائیں اور آدرش کیا تھے؟؟؟؟ بابائے قوم نے کیا سوچا تھا، کیا چاہا تھا، کون سی منزل متعین

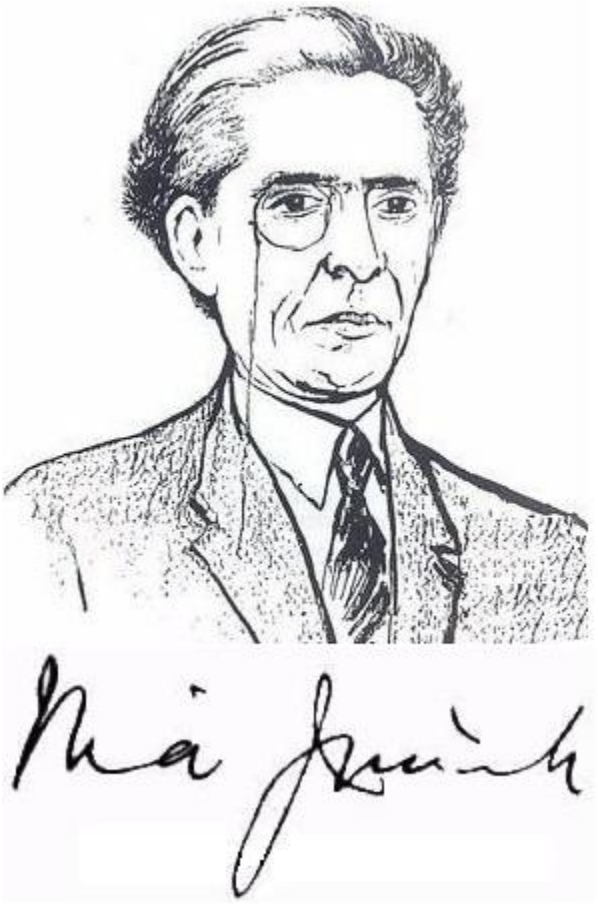

کی تھی، کیسے وہاں تک پہنچنا تھا، وہ منزل کن اندھیروں میں کھو گئی، نشانِ منزل بھی کوئی دکھائی پڑتا ہے یا نہیں؟؟؟؟؟

صحرائے سینا میں چالیس سال بھٹکنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو بھی بالآخر منزل مل گئی تھی۔ احساسِ زیاں اگر دامن گیر ہو جائے تو کیا خبر ہم بھی گم گشتہ راہوں کو از سرِ نو پالیں۔ اپنی اپنی ذات کی قید سے آزاد ہو جائیں، غلام ضمیر کی اسیری سے نجات حاصل کر لیں، ذاتی مفاد کو ہی سمجھنا ترک کر دیں، ملک و قوم کی فلاح بہبود کو نہ زندگی کا واحد مقصد صرف اپنا فرض سمجھیں بلکہ اس کیلئے تھوڑی بہت قربانی دینے کیلئے بھی تیار ہو جائیں۔ کیا وہ ایک نئی صبح نہ ہو گی جب ہم سے کئی دیوانے سچ کو برملا سچ کہنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ کتنا ہی خوشگوار اجالا ہو گا جب یاری دوستی اور برادری کی زنجیروں سے آزاد ہو کر ہمارے ارباب و اختیار حق وانصاف کے تقاضے پورے کرنے لگیں گے۔ قائداعظم کے پاکستان کے حسین چہرے پر جمی گرد کی موٹی تہیں خود بخود جھڑنے لگیں گی۔ وہ حسین منظر جو قائد کے پیش نظر تھا پھر سے اجاگر ہو گا۔ یاد ہے کہ نہیں جو میرے اور آپ کے محبوب قائد محمد علی جناح نے 11/اگست 48ء کو مجلس دستور ساز پاکستان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "حکومت کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان برقرار رکھے تاکہ مملکت اپنے عوام کی جان ومال اور ان کے مذہبی عقائد کو مکمل طور پر تحفظ دے سکے"۔

کیا یہ فریضہ ہم نبھا پائے؟ انہوں نے تو برملا فرمایا تھا کہ "بلا امتیاز مذہب، ذات پات، عقیدہ پاکستان کے تمام شہریوں کے حقوق و مراعات اور فرائض مساوی ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو، ہندو رہے گا نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے"۔ ہمارا طرزِ عمل کیا رہا، غیر مسلم تو ایک طرف رہے ہم تو آپس ہی میں بٹ گئے۔ خونِ مسلم کی ارزانی کا یہ عالم ہے کہ اپنوں کے ہاتھوں کلمہ گو ناحق قتل ہوتے رہے، ایک آدھ نہیں سینکڑوں ہزاروں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ گلی کوچوں میں تو کیا، بند کواڑوں کے پیچھے دم سادھے مکین بھی انجانے خوف سے کانپنے لگے۔ قائد نے فرمایا تھا:

"کراچی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اہم شہروں میں یہ واحد شہر ہے جہاں لوگوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھا اور خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی گزارتے رہے، مجھے امید ہے کہ ہم ایسے ہی رہتے رہیں گے،،۔ کیسی لاج رکھی ہم نے اپنے قائد کے اس ارشاد گرامی کی؟ لسانی فسادات ہو رہے ہیں، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، نسلی امتیاز کے بیج بو دیئے گئے ہیں، امن کے نام پر مار دھاڑ کیلئے تنظیمیں تشکیل دے دی

گئی ہیں، قانون نافذ کرنے والے بے بس اور لاچار دکھائی دے رہے ہیں۔ شائد ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب دس بارہ بے گناہ غریب افراد کو موت کی وادی میں دھکیل نہ دیا گیا ہو۔ جلی ہوئی گاڑیوں کے شاہراہوں پر پڑے ڈھانچے تو اب معمول کا منظر بن گئے ہیں۔ عروس البلاد پیہم ماتم کی حالت میں ہے۔ ساحل سمندر اچاٹ، تفریح گاہیں سونی ہو گئی ہیں۔ روشنیاں تک بے رونق دکھائی دے رہی ہیں، شام ڈھلے کوئی مجبوراً گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتا کیونکہ اسے جان کی قیمت پر روشنیاں دیکھنے کا یارا نہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت
درد سے بھر نہ آئے کیوں

یہ اداسی، یہ پژمردگی، یہ بے رونقی بے سبب تو نہیں۔ کس کس کی بے وقت شہادت کو نہیں رویا یہ عروس البلاد! اور تو اور حکیم سعید شہید (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کے پایہ کا عظیم انسان بھی محفوظ نہ رہ سکا اور انہیں روزے کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ قاتلوں نے ان کے ان گنت احسانات تک کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ کاش اور نہیں تو ظالموں نے ہمدرد یونیورسٹی کا کیمپس کو ہی دیکھ لیا ہوتا، تعلیم کے شعبے میں وہ جو بے مثال خدمات انجام دے رہے تھے، ان کا خیال رکھا ہوتا۔ سادگی اور فقر جو باوجود تمامتر وسائل کے انہوں نے اپنا رکھے تھے، اس کی لاج رکھ لی ہوتی، کیسے کیسے کھرے انسان لقمہ اجل بن گئے۔ قلم کی آبرو کا حق ادا کرنے والا فقید منش صلاح الدین ایڈیٹر تکبیر دفتر کی پک اپ میں سوار جا رہے تھے کہ بے رحم قاتل جو تاک میں بیٹھے تھے، گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اس مرد مومن کو شہید کر دیا۔ قاتل کون تھے؟ کہاں سے آئے اور کس کے حکم پر ان قد آور شخصیات کو شہید کر دیا گیا، اب تک ان کا سراغ نہیں مل سکا۔ کیا اس سے بڑا کوئی المیہ ہو سکتا ہے؟ کرپشن، بدعنوانی اور برائی کو بروقت آشکار کرنے والا قلم توڑ دیا جائے، وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے اور حق و صداقت کیلئے اٹھنے والی زبان و آواز خاموش کر دی جائے، اندھیاروں میں روشنی پھیلانے والی شمع گل کر دی جائے تو ظلم و ستم کا راستہ کون روکے گا؟

کیسے کیسے جید علماء کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا گیا، کس کس کیلئے سینہ کوبی کی جائے، حشر سامانی کا عالم کچھ ایسا کہ مقدور ہو تو رکھوں ایک نوحہ گر کو میں..
..... قتل و غارت گری کا سلسلہ اب کراچی تک محدود نہیں، یہ دہشت گردی سارے ملک کا مقدر بنا دی گئی ہے۔ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ جیسا شفیق اور محبتوں کا پیامبر، شرافت، متانت، تحمل اور انسانیت کا مرقع، پکے اور کھرے مسلمان، عادات و اطوار اور چال چلن سے قرون اولیٰ کے خدا پرستوں کی یاد تازہ کرتے تھے، جھگڑا تو کجا کسی سے اونچی زبان سے بات نہیں کرتے تھے، سفاک قاتلوں کی گولیوں کے طفیل واصل بالحق ہو گئے۔ (چہ دلاوراست دزدے کہ بہ کف چراغ دارد) (چور کتنا بے باک ہے کہ ہاتھ میں چراغ لیے پھرتا ہے)۔ آخر ہم کب تک ایسے ظالم نظام کی چکی میں پستے رہیں گے؟ کراچی میں ایم کیو ایم اور اے این پی کے اتحاد سے سندھ حکومت قائم ہے لیکن عجیب طرفہ تماشہ ہے کہ جمہوریت کا نعرہ بلند کرنے والے اتحادی اس قتل و غارت کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرا رہے ہیں اور خود اپنی زبان سے سندھ حکومت کے ناکام ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے اس عروس البلاد کو فوج کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن عوام پہلی مرتبہ ان سازشی چہروں کو پہچان گئے ہیں کہ یہ سب گروہ اپنے اپنے مفادات کی جنگ میں مشغول ہیں جس کی بھاری قیمت معصوم شہریوں سے وصول کی جا رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دفعہ ملک میں کرپشن، بدعنوانی میں کسٹم کو پہلے نمبر پر اور دوسرے نمبر پر عدالتی نظام کو ٹھہرایا گیا ہے۔

ہیں دفن مجھ میں کتنی رونقیں مت پوچھ
اجڑا اجڑ کے جو بستا رہا وہ شہر ہوں میں

بروز ہفتہ 22 ذوالقعدہ 1431ھ 30/ اکتوبر 2010ء

درباری مذاکرات۔لاحاصل کوشش

جموں وکشمیر کی سینکڑوں سالہ پرانی تاریخ اسلامی روایات کی امین ہے۔یہ جنت نظیر وادی اپنا منفرد ثقافتی ورثہ رکھتی ہے اوراس کی بنیاد صرف اور صرف اسلام پر ہے۔یہاں کے آزاد منش مسلمانوں کے دلوں پر اسلام کی مہر ثبت ہے۔رنگینی فطرت کے اس خطے میں فن تعمیر، فن خطاطی، فن پیپر ماشی، فن چوب کاری، فن حرب، چاندی وپیتل کے ظروف پر بیل بوٹے کا کام، کڑھائی سلائی اور دیگر آلات میں اسلامی اقدار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔وادئ کشمیر کی مساجد، خانقاہیں، مزارات وعمارات، حسن وزیبائش اور کاریگری کے دل پذیر نمونے ہیں۔شادی وغمی اور دیگر مواقع پر محبت ویگانگت کے جذبات کا انوکھا اور پرکشش اظہار اس وادی کا طرۂ امتیاز ہے۔ سینکڑوں سالہ امن وآشتی اور پیار کی یہ وادی آج انگارۂ وادی بنی ہوئی ہے جس کا ایک ایک پتہ خون کے آنسو رو رہا ہے۔ہر سائبان لہولہان ہے اور ہر کشمیری مسلمان کلمہ خون کے آنسو پی رہا ہے۔

کشمیر کی اس تحریکِ آزادی کا آغاز 13 جولائی 1931ء کو ہوا تھا جب کشمیری فرزندان اسلام نے ڈوگرہ سامراج سے آزادی اوراسلام کی سربلندی وبقاء کیلئے اصولوں کی جنگ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔انہوں نے اپنے لہو سے تاریخ کا ایک باب رقم کر کے آزادی کا ایک باب منور کیا۔آزادی کی مانگ میں لہو کا سیندور بھرنے والے مجاہدین نے قربانیوں کا آغاز کیا۔جب 1940ء میں بھارت میں بسنے والے مسلمان دو قومی نظریے کی بنیاد پر اقبال اور محمد علی جناح کی قیادت میں اپنی منزل کا تعین کرتے ہوئے سوئے پاکستان چلے تو ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں نے بھی مسلمانانِ برصغیر کی تحریک آزادی کے ساتھ اپنے فکری اور نظریاتی رشتے جوڑ دیئے۔3 جون 1947ء کو مہاراجہ کشمیر سے مطالبہ کیا کہ اصولوں کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کا الحاق پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے کرے۔ریاست جموں وکشمیر کے دشمن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لارڈ ریڈکلف نے مسلم دشمنی کے اظہار کیلئے ریاست کا الحاق پاکستان سے نہ ہونے دیا۔اس کے پس منظر میں تفرقہ ڈالو اور حکمرانی کرو کی پالیسی کارفرما رہی۔

انگریز اور برہمنی سامراج کی سازشوں کی بناء پر اس وقت کشمیر کا غیر قانونی اور جبری الحاق بھارت کے ساتھ ظاہر کر کے بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں اوراب یہ مسئلہ صرف کشمیریوں کا نہیں بلکہ برصغیر کے ایک ارب سے زائد عوام کا مسئلہ بن چکا ہے۔1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے علاوہ کارگل کے محاذ پر تو دو عالمی ایٹمی طاقتوں کے درمیان اس مسئلے نے ساری دنیا کو ایک نئی ایٹمی جنگ کے بارے میں انتہائی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور ہنوز عالمی امن کو تباہ کرنے کا یہ خطرہ ابھی تک موجود ہے۔ان تین جنگوں کے بعد بابری مسجد، درگاہ حضرت بل اور چرار شریف کے سانحات پر بھارت کے گھناؤنے عزائم کھل کر سامنے آگئے ہیں کہ درپردہ بھارت اس خطے میں ہندوراج کے قیام کی سازشوں میں مصروف ہے۔کشمیر میں لاکھوں بھارتی فوج مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے، انسانی گردنوں پر شیطانی قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ جذبۂ شہادت لیکر چلنے والی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیرگی میں روشنی کے استعارے بن رہے ہیں۔جذبۂ حریت کے پاسدار، ستاروں کے ہمسفر موت سے ٹکرا رہے ہیں۔وادئ کشمیر کے ہر مجاہد کا ایک ہی نعرہ ہے،، آزادی یا موت،،۔اس نعرے کی تکمیل کیلئے راہِ حق کے مجاہد رسم شبیری ادا کر رہے ہیں۔

آج ہر کشمیری بے وطن ہے، اس وادی یں ماتم کناں سخن ہے، یہ اجڑا ہوا چمن ہے، زخموں کا بدن ہے، بدلی ہوئی چبھن ہے، حسن شعلہ زن ہے، دریدہ پیرہن ہے، قربانی عشق کا چلن ہے، ہر جواں مثل کوہکن ہے، مفلسی کا بانکپن ہے، سر سے باندھے کفن ہے، حکائت محن ہے، مجاہد خیمہ زن ہے، دل میں جلن ہے، ماہتاب کو گرہن ہے، اجڑی انجمن ہے لیکن غازیوں کا کمالِ فن ہے۔ کشمیری مجاہدین قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی طرح سر بکف ہیں۔ آج کشمیر میں مساجد پر گولیاں چل رہی ہیں، عزت کی بولیاں لگ رہی ہیں، آنچل دریدہ اور چھلنی جھولیاں ہو رہی ہیں۔ متحد ظالم سامراج کی ٹولیاں ہو رہی ہیں۔ کشمیر کا کوئی شہر یا گاؤں ایسا نہیں جہاں معصوم بچوں کی سسکیاں، بے آسرا لوگوں کی آہیں، مظلوم کشمیریوں کی بے گور و کفن لاشیں، موت کا وحشیانہ رقص، سوکھے ہوئے چہرے، ظلم شب کے مناظر، غاصبوں کی بربریت، گولیوں کی سرسراہٹ، بموں کی گڑگڑاہٹ اور موت کی ہر سو آہٹ سنائی و دکھائی نہ دیتی ہو۔ کشمیر کی شاہراہیں بھی ہر روز بے گناہوں کے لہو کی گواہی دے رہی ہیں اور کشمیر کے کوہسار و مرغزار کو ایسا بے ترتیب گلشن ہستی بنا دیا گیا ہے جیسے شہر خموشاں میں ہر کہیں ننگے پاؤں چل رہا ہو۔

اپنے لہو سے تاریخ دہرانے والے ہر کشمیری نے عزم کر لیا ہے کہ وہ آزادی کی شمع روشن کر کے رہیں گے لیکن دوسری طرف بھارت کی خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ وہ اب بھی ان مذاکرات کاروں کے توسط سے کشمیری رہنماؤں کو جھانسہ و فریب دینے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اب ایک اور نیا پینترا بدلا گیا ہے کہ کشمیر کیلئے بھارت کے آئین میں تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن اب اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کشمیر کا بھارت کے آئین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ایک خود مختار ملک کا اپنا آئین ہوتا ہے اور کشمیر اپنے آزادی کے بنیادی حق کیلئے اب تک ایک لاکھ سے زائد جانوں کی قربانی دے چکے ہیں۔

گو کہ بھارت نے ایسے غیر سیاسی مذاکرات کاروں کا انتخاب کیا ہے جو بظاہر سب ہی معتدل لوگ ہیں، ذاتی حیثیت میں ان کے نہ صرف کشمیریوں سے بلکہ پاکستان میں بھی کئی لوگوں سے بہترین تعلقات ہیں۔ مذاکراتی گروپ کے سربراہ جن کو مرکزی وزیر کا درجہ حاصل ہے، صحافی پڈ گانکر ہیں جو رام جیٹھ ملانی کی کشمیر کمیٹی کے ساتھ کام کر چکے ہیں جبکہ اس گروپ کے دوسرے رکن ایم ایم انصاری ہمدرد یونیورسٹی میں کام کر چکے ہیں اور اس گروپ کی تیسری رکن رادھا کمار جامعہ ملیہ اسلامیہ نیو دہلی میں نیلسن منڈیلا انسٹی ٹیوٹ آف پیس کی سربراہ ہیں، اور دہلی پالیسی گروپ کے ساتھ بھی وابستہ ہیں جو کشمیر پر کئی کانفرنسوں کی میزبان بھی رہ چکی ہیں جن میں 2005ء میں سرینگر میں ہونے والی کانفرنس بھی شامل ہے اور ابھی چوتھے رکن کی تقرری ہونا باقی ہے۔

صحافی پڈ گانکر نے مسئلہ کشمیر کے حل میں پاکستان کے کلیدی کردار کا اعتراف کرتے ہوئے دہلی سرکار اور ان بھارتی سیاسی جماعتوں کو پیغام دیا ہے جو کشمیر کے مسئلے سے پاکستان کو دور رکھنے کی پالیسی جاری رکھے ہوئے ہیں اور دوسری طرف رادھا کمار نے بھی دہلی سرکار کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اب مسئلہ کشمیر کے حل میں بھارتی آئین میں تبدیلی کی ضرورت ہے گویا بھارت کو اٹوٹ انگ کی پالیسی سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ تحریک آزادی کے بزرگ رہنما سید علی گیلانی نے مذاکرات کیلئے بہت پہلے اپنے پانچ نکاتی پروگرام میں یہی مشورہ دیا ہے کہ دہلی سرکار کو سب سے پہلے کشمیر کو متنازعہ قرار دینا ہو گا اور بھارتی آئین کے اندر رہتے ہوئے مذاکرات کی شرط کو ختم کرنا ہو گا، تبھی بھارتی مذاکراتی ٹیم سے مسئلہ کشمیر پر گفتگو ہو سکتی ہے وگرنہ

23مارچ 1952 ء سے لیکر آج تک کم و بیش ایک سو پچاس بے نتیجہ اور ناکام مذاکرات کے دور ہو چکے ہیں اوران پانچ نکاتی جائز مطالبات کو تسلیم کئے بغیر مزید مذاکرات محض وقت کا ضیاع ہو گا کیونکہ اٹل بہاراجپائی نے بھی اپنے دور حکومت میں ایک موقع پر ایسی ہی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے بھارتی آئین کے فریم ورک میں محصور ہونے کی بجائے انسانیت کے دائرے میں مسئلہ کشمیر کے حل کی تجویز دی تھی بلکہ اپنی ایک تاریخی تحریر میں اس تنازعے کے بارے میں لکیر کا فقیر بننے سے اجتناب کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن آج تک بھارت نے مسئلہ کشمیر کے حل میں کبھی عملی اخلاص کا مظاہرہ نہیں کیا۔

دہلی سرکار کی ہٹ دھرمی اور بے لچک رویہ شائد ایک مرتبہ بھر ان مذاکرات کی ناکامی کا سبب بن سکتا ہے اور کشمیری مزید کسی بھی ایسے بیان کے فریب یا جھانسہ میں آکر اپنے شہداء کے خون سے بے وفائی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ کشمیر میں ہونے والے مظالم اب بھارتی جمہوریت کے چمکتے ماتھے پر ایک ایسے بد نما داغ بن چکے ہیں کہ اقوام عالم کی آنکھوں میں مزید دھول نہیں جھونکی جاسکتی۔ بھارت دنیا کے سامنے اپنی امن پسندی اور ترقی کی جو شبیہ دکھانا چاہتا ہے، ایک لاکھ کشمیریوں کے لہو نے اس کے چہرے کے اس نقاب کو نہ صرف تار تار کر دیا ہے بلکہ دہلی سرکار کو بے نقاب کر کے مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے جہاں اب بھارت کے انصاف پسند دانشور بھی اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔

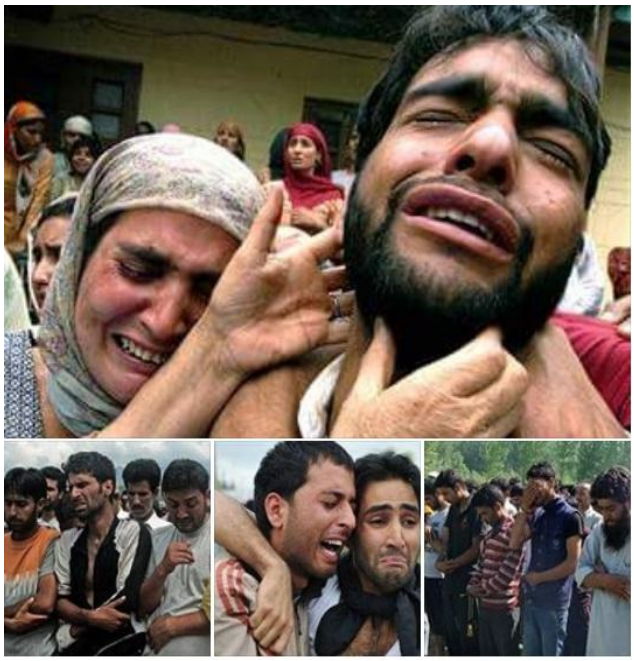

مغرب اور بالخصوص امریکا میں پھیلے ہوئے لاتعداد کشمیری اوراسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھی کئی کشمیری نژاد خواتین جن میں ایک امریکی صدر کی مشیر بھی ہیں، جب اپنے گھر والوں کو کئی مہینوں سے ہڑتالوں اور کرفیو میں محصور دیکھتی ہیں اور آئے دن بھارتی سیکورٹی کے ہاتھوں اپنے عزیزوں کی ظالمانہ اموات کے صدموں کی اطلاعات سنتی ہیں تو ان کی کیفیت بھی کسی نہ کسی انداز میں امریکی حکام کی رائے اور ایوانوں کے ماحول پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اب گاہے بگاہے بھارت کو مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف متوجہ کرتا چلا آرہا ہے۔ حال ہی میں اس کا اعتراف بھارتی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا نے اپنے ایک بیان میں کیا ہے کہ امریکی حکام وقتاً فوقتاً مسئلہ کشمیر کے حالات کی طرف بھارت کی توجہ مرکوز کرواتے رہتے ہیں پھر اندرون خانہ ضرور کوئی ایسی بات ہے کہ ایس ایم کرشنا کو یہ بیان دینے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بھارت سلامتی کونسل کی مستقل نشست کے بدلے مسئلہ کشمیر کا حل قبول نہیں کرے گا، گویا کوئی قوت ایسی ہے جو بھارت کیلئے سلامتی کونسل کی مستقل نشست کو مسئلہ کشمیر کے حل سے مشروط ٹھہرا رہی ہے۔

آج سے چند ماہ پہلے کسی کو بھی اس بات کا قطعی یقین نہیں تھا کہ کشمیریوں کا اپنی تحریک آزادی کیلئے یہ بھرپور احتجاج اس قدر طوالت اختیار کر جائے گا کہ اقوام عالم بھی اس مسئلے کی حدت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے بلکہ دلی سرکار نے تو میڈیا میں یہ قیاس آرائیاں نشر کرنا شروع کر دی تھیں کہ جموں وکشمیر کی پوری انسانی آبادی چند ہفتوں سے زائد کاروبارِ حیات کو بند کرنے کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی لیکن کشمیری عوام نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور بھارت جو غیر ضروری طور پر اپنے مضبوط اعصاب کا تاثر دیتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر غیر سنجیدگی کا اظہار کر رہا تھا، اب اس کو کشمیر پر اپنی روایتی گرفت کمزور نظر آ رہی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اب بھارت کے مذاکرات کاروں کو کشمیر پر پاکستان کا کلیدی کردار بھی نظر آنا شروع ہو گیا ہے اور آئین میں تبدیلی کی نوید کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ لیکن کشمیر کے بزرگ رہنما سید علی گیلانی کی بصیرت افروز قیادت نے کسی بھی مذاکرات میں حصہ لینے سے قبل دلی سرکار کی سنجیدگی کو پانچ نکات سے مشروط کر دیا ہے۔ ادھر میر واعظ فاروق نے اپنے مؤقف کا اظہار کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے تینوں فریقوں کا آمنے سامنے بیٹھنے کا مطالبہ کیا ہے۔ لبریشن فرنٹ کے رہنما یٰسین ملک نے بھی مذاکرات کاروں بات چیت کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ سڑکوں، پلوں ، کالجوں کی تعمیر اور روزگار کی لالچ سے حل نہیں ہو گا بلکہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے، بھارتی قیادت کو اقوام متحدہ میں کشمیریوں سے کئے گئے وعدوں پر عمل کرنا ہو گا۔

دلی سرکار جموں وکشمیر کی صورتحال سے انتہائی پریشان ہے لیکن مصنوعی طریقوں سے اپنی انانیت کی آگ کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ دلی سرکار کی شدید خواہش ہے کہ مذاکرات کاروں کے ان بیانوں سے کشمیر پر امن، خاموش اور پر سکون ہو جائے تا کہ صدر اوبامہ کو بھارتی دورے کے درمیان یہ تاثر دیا جا سکے کہ کشمیری بھارت کے اندر پر سکون زندگی گزار رہے ہیں۔ دلی سرکار کا مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کا ڈرامہ رچا کر اقوام عالم اور بالخصوص امریکا کو مطمئن کرنے کی ایک لاحاصل کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اب یوں لگتا ہے کہ امریکی صدر کا بھارتی دورہ اور کشمیر میں برپا آزادی کی تحریک کیلئے بھرپور احتجاج کسی نئے منظر نامے کی تشکیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

بروز منگل 25 ذوالقعدہ 1431ھ 2 نومبر 2010ء

کوئی ہے جو اِن کو سمجھائے؟

وہی عہدِ خوں رنگ کی لہو نوشی، وہی چار سو بکھرے ہوئے لاشے، وہی کٹے پھٹے انسانی اعضاء، وہی لہو میں رنگین تارکول کی سڑکیں، وہی در و دیوار سے چپکے انسانی گوشت کے لوتھڑے، وہی آہیں، وہی چیخیں، وہی سسکیاں، وہی آنسو، وہی رسمی بیانات، وہ کیفر کردار تک پہنچانے کے فرسودہ اعلانات، وہی دہشت گردی کو جڑ سے اکھیڑ دینے کا عزم، وہی جگر خراش حربے، وہی نمک پاش ردعمل۔ کوئی کہاں جائے؟ کس کی زنجیرِ عدل ہلائے؟ کس سے جان کی امان کا تقاضا کرے؟ کس کے سامنے ہاتھ جھوڑے کہ خدارا، اس ملک کی فکر کرو، خدارا، اپنی ذات کے خول سے باہر نکلو ، خدارا، اس خوبصورت اور وسائل سے مالامال پاکستان کو اپنی ہوس اقتدار کی بھٹی میں نہ جھونکو، خدارا، اسے عالمی سازشوں کا اکھاڑہ نہ بناؤ، خدارا امن، مفاہمت، خیر سگالی، ہم آہنگی اور قومی اتحاد کی کوئی ایسی مخلصانہ کوشش کرو کہ آگ اور بارود کا یہ جہنم ٹھنڈا ہو، خدارا، امریکہ کو بتائو کہ اس کے کروسیڈ کا دست و بازو بن جانا ہمارے لئے مہلک ثابت ہو رہا ہے، خدارا، اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرو اور فتنہ گر عالمی طاقتوں کو بتائو کہ بہت ہو چکی، اب تمہاری خاطر اپنے عوام کی زندگیوں سے نہیں کھیل سکتے۔

وہ اولیائے کرام جو اس خطے میں اسلام، امن و آشتی کا پیغام لیکر آئے تھے، جنہوں نے محبتوں کے دروس سے دلوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی آج ان کے مزارات پر بھی لوگوں کو امان نہیں مل رہی۔ مساجد، امام بارگاہیں، اسکول و کالج، بچوں کے پارک اور ہنستے بستے شہروں کی شاہراہوں پر معصوم اور بے گناہ انسانیت کا شکار کیا جا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت بھی انگریزوں اور ہندوئوں کی غلط حکمت عملی کی وجہ سے بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں موت کی بھینٹ چڑھیں بہر حال اللہ کے نام پر وجود میں آنے والی مملکت پاکستان کے دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ سوچا جا رہا تھا کہ خدا کی وحدانیت پر یقین رکھنے والے کلمہ گو کم از کم اس سلطنت میں حقوق العباد کا خاص خیال رکھیں گے اور ہوا بھی ایسے۔ جنرل ایوب کے دور میں جب چینی کے ریٹ میں معمولی اضافے پر راولپنڈی کے ایک کالج کے دو طلبا کی ہلاکت ہوئی تو پورا پاکستان ہل گیا جس سے ایک مضبوط ڈکٹیٹر کی حکومت ڈانواڈول ہو کر ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان اور پھر بلوچستان میں کچھ انسانی جانوں کے تلف ہونے کو قوم نے نہایت حقارت سے دیکھا۔ لیکن انسانوں کے سفاکانہ قتل کا جو سلسلہ حالیہ چند سالوں میں پاکستان میں شروع ہوا ہے اس کی پاکستان کی 63 سالہ تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس لحاظ سے یہ دور پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے جس نے قومی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے غریب لوگ جو آٹھ دس افراد کے کنبوں کے واحد کفیل ہیں، گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں اپاہج ہو چکے ہیں ان کے چولہے بجھ گئے ہیں اس ناکامی پر کسی وزیر، وزیرِ اعلیٰ، گورنر یا قومی لیڈر نے استعفیٰ نہیں دیا بلکہ ہر سال تین سو ارب روپے سے زائد کی کرپشن کا ریکارڈ قائم کر کے اب بھی عوام کی محبت کا دردا اپنے دل میں بسائے بیٹھے ہیں۔ کیا یہ ہلاک کنندگان کے لواحقین کے زخموں پر نمک پاشی نہیں؟ انسانی لاشیں اور ان کا خون ابھی سڑکوں پر بکھرا پڑا ہوتا ہے اور اس پر قومی سوگ منانا تو درکنار ٹی وی چینلوں پر ناچ گانا بند نہیں ہوتا اور آج تک قومی قیادت کسی کے جنازے میں نہیں پہنچ پائی اور جمہوریت کے نام پر خوشحال پاکستان کیلئے اپنے آپ کو قوم کا ناگزیر مسیحا کے طور پیش کر رہے ہیں۔ ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں خوشحالی

کے حوالے سے ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 110 ممالک کی خوشحالی کی فہرست میں پہلی مرتبہ پاکستان 109 ویں نمبر پر چلا گیا ہے، صرف زمبابوے اس کے بعد ہے ۔

تو پھر کون ہے جسے پاکستان کی خوشحالی سے چڑ ہے ؟ کون ہے جو اپنی مرضی کے غلام پاکستان کے ایوانِ اقتدار میں تعینات کرتا ہے ؟ کون ہے جو خلقِ خدا کو اپنے گھروں میں مقید اور پابہ زنجیر دیکھنے کا آرزو مند ہے ؟ کون پاکستان کی حقیقی عوامی قیادت سے خوفزدہ ہے اور گملوں میں لگی پنیری کو ہی زیب گلستاں دیکھنا چاہتا ہے ؟ کراچی کی تازہ واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے ؟ اسی کراچی میں بے نظیر بھٹو کے والہانہ استقبال میں آنے والے ڈھائی سو سے زائد جیالوں کے پرخچے اڑا دیئے گئے تھے اور آج تک ان کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر نامدار آصف علی زرداری نے ایک سرکاری ایجنسی کو ذمہ دار قرار دیا تھا اور اس کے سربراہ کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا تھا؟ لیکن آج تو وہ ملک کے سب سے بڑے منصب پر براجمان ہیں، ملک کے تمام وسائل ان کے ایک ہی اشارہ ابرو کے منتظر ہیں لیکن اقتدار سنبھالتے ہی اپنے ملک کے تمام تحقیقاتی اداروں پر بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیق اقوام متحدہ کے سپرد کر دی اور اب اقوام متحدہ کی تحقیقاتی رپورٹ پر بھی شکوک کا اظہار کر دیا گیا ہے اور بے نظیر بھٹو کے قتل کے مقدمے کو بھی داخل دفتر کر دیا گیا ہے۔ آخر ملکی خزانے کی کثیر رقم کو ضائع کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے ؟ اپنے آقاؤں کے حکم پر پاکستان میں ہونے والی تمام دہشتگردی کو القاعدہ کے کھاتے میں ڈال کر پاکستانی عوام سے حقیقی دشمنوں کے چہرے چھپانے کی کوشش آخر کب تک جاری رہے گی ؟

کیا یہ،،القاعدہ،، کی کاروائی ہے ؟ امریکہ یہی چاہے گا کہ یہ غارتگری بھی نام نہاد اسلامی شدت پسندوں اور القاعدہ یا طالبان عناصر پر تھوپ دی جائے۔ اُس کیلئے یہ ایک سہانا خواب ہے کہ ہر خونیں واردات کا رخ، امریکہ کے دشمنوں کی طرف موڑ دیا جائے اور کسی ثبوت کے بغیر ان پر سنگ زنی شروع کر دی جائے۔ ایک حلقہ اس سفاکی کے ڈانڈے اُن کے ساتھ ملا رہا ہے جو کراچی کو پر امن دیکھنے کے روادار نہیں۔ پاکستان دشمن کاروائیوں میں ملوث غیر ملکی ایجنسیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا رہا جو ہمارے آس پاس خاصی سرگرم ہو چکی ہیں اور جن کے لئے پاکستان کے کسی بھی حصے میں کارروائی کرنا مشکل نہیں رہا۔ ہمیشہ کی طرح ہم کبھی نہ جان پائیں گے کہ قاتل کون ہے ؟ کہاں چھپا بیٹھا ہے ؟ کس کی پناہ میں ہے ؟

مجرم اور محرک سے قطع نظر کراچی کے تازہ خونی کھیل نے بہت سے سوالوں کو تازہ کر دیا ہے۔ بہت سے نئے سوالات اٹھا دیئے ہیں۔ سب سے بڑا، اہم اور بنیادی سوال تو یہی ہے کہ کیا ہمیں آنکھیں بند کر کے امریکہ کی بھڑکائی ہوئی جنگِ دہشت گردی کا ہراول دستہ بنے رہنا چاہئے؟ شاید اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس کا دوٹوک، واضح اور فوری جواب سوچنا ہو گا۔ نو سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ان نو سالوں میں ہم امریکی کروسیڈ کو اپنا بہت سا خون دے چکے ہیں۔ ہمارے اتنے فوجی جوان جاں بحق ہو چکے ہیں جتنے امریکہ کے نہیں ہوئے۔ جتنے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں نہیں ہوئے۔ قبائلی علاقے باقاعدہ میدان جنگ بنے ہوئے ہیں جہاں فضائیہ استعمال کی جارہی ہے۔ حکومت، امریکہ کی اتحادی ہے اور امریکہ نفرتوں کی علامت۔ سوپوری پاکستانی قوم اس بے راہ، بے سمت اور بے مقصد جنگ کے شدید خلاف ہے۔ صدر مشرف کی جن ظالمانہ پالیسیوں نے انتہاپسندی اور عسکریت کو فروغ دیا تھا وہ اب بھی جاری وساری ہیں اور اب اس آگ کی لپٹیں صوبہ سرحد کے بندوبستی شہروں سے نکل کر سارے ملک میں آپہنچی ہیں۔ سوات جیسا سیاحتی مقام اب بھی ایک جداگانہ منظر پیش کر رہا ہے۔ کراچی سے اسلام آباد تک کوئی شہر، کوئی عمارت، کوئی تقریب بم دھماکوں سے محفوظ نہیں۔ موجودہ حکمران بوجوہ امریکی جنگ دہشت گردی کو نہ صرف ایک مشن کے طور پر اپنا چکے ہیں بلکہ اس مشن کو اپنے اقتدار کے لئے لازم وملزوم بھی سمجھنے لگے ہیں۔

ایک بڑی پیش رفت یہ ہوئی کہ موجودہ حکومت نے قصر سفید کے فرعون کے ساتھ حالیہ اسٹریٹجک مذاکرات میں قصرِ اقتدار میں مزید رہنے کیلئے صدر مشرف ہی کی طرح امریکی کروسیڈ کی اطاعت اور امریکی اہداف کی تکمیل کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ موجودہ حکومت خود ہی اس سوال کا بہتر جواب دے سکتی ہیں کہ انہوں نے یہ راستہ اپنی کس کمزوری کے سبب چنا لیکن حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے پچھلے تین برس میں واشنگٹن کے متعدد دورے کئے اور وہاں کی جنگجو لیڈر شپ کو باور کرایا کہ وہ جمہوریت کے نام پر مشرف سے بھی دو ہاتھ آگے جا کر وہ کچھ کر سکتے ہیں جو کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ اسی تناظر میں بے نظیر بھٹو نے ،، این آر او،، کی ڈیل سے پہلے اس بدنام زمانہ معاہدے کے خالقوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اقتدار ملتے ہی بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کے اوباشوں کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان تک رسائی مہیا کریں گی اور اسی پس منظر میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ضرورت پڑی تو امریکہ کو قبائلی علاقوں میں براہ راست کاروائی کی اجازت بھی دے دیں گی۔ یہ تو وہ بیانات تھے جو پریس کو دیئے گئے تھے۔ پسِ پردہ کی مفاہمتوں اور ضمانتوں سے کوئی واقف نہیں۔ بلاشبہ بے نظیر بھٹو مقبول عوامی رہنما تھیں لیکن وہ پاکستان میں امریکی اہداف کی پاسبان، وار آن ٹیرر کی تازہ دم سپہ سالار اور صدر پرویز مشرف کے بازوئے شمشیر زن کے طور پر داخل ہوئیں تھیں۔ یہ ایک طرح کی سیاسی کمک تھی جو امریکہ نے اپنی جنگ لڑنے والے جرنیل کو بھیجی تھی۔ یہ ایک بڑا ہی خوفناک اور کسی حد تک اشتعال انگیز پیغام تھا جو افغانستان اور پاکستان میں امریکہ کے خلاف سرگرم عناصر کو بھیجا گیا تھا۔ قارئین! آپ نے پچھلے تین سالوں میں خود مشاہدہ فرمالیا کہ عدالتِ عالیہ کو خود آگے بڑھ کر ڈاکٹر عبدالقدیر کو تحفظ فراہم کرنا پڑا اور باقی کے تمام معاملات آپ کے سامنے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہماری سپاہ کو ہر دوسرے دن شمالی وزیرستان میں کاروائی کا حکم صادر کیا جاتا ہے اور ہم ابھی تک یہ کہہ کر ان سے وقت حاصل کر رہے ہیں کہ جب مناسب وقت ہو گا تو ہم شمالی وزیرستان کو تاراج کریں گے۔

کیا کراچی میں ٹارگٹ کلنگ واشنگٹن کے اس پیغام کی تعمیل میں تاخیر کا جواب ہیں؟ یہ کہنا قبل از وقت ہے لیکن اتنی بات طے ہے کہ پاکستان کو پائدار امن سے ہمکنار کرنے، تشدد اور شدت پسندی کا خاتمہ کرنے اور سیاسی استحکام کی خاطر جمہوری منزلوں کی طرف بڑھنے کیلئے پینٹاگون کے اتحادیوں کو

قوی کرنے کے بجائے اُن معتدل اور میانہ رو سیاسی عناصر کو تقویت دینا ہو گی جو ملک اور قوم کو اس بھنور سے نکال سکیں۔ حالیہ اسٹریٹجک مذاکرات کی شکل میں تازہ امریکی کمک، دراصل آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہے۔ یہ امن، مفاہمت اور یکجہتی و ہم آہنگی کی نہیں، امریکہ کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے اپنے گھر کو آگ لگانے اور اپنے پیاروں کے لہو کو قصر سفید کے رخساروں کا غازہ بنانے کی بے حکمتی ہے۔ جب تک یہ بے حکمتی ہی حکمت اولیٰ بنی رہے گی، ملک جلتا رہے گا خون بہتا رہے گا۔ کوئی ہے جو ان کو سمجھائے؟

اک مستقل عذاب کو سر پر بٹھا لیا
اور کہہ رہے ہیں، درد سے دامن چھڑا لیا
اس سادگی پر داد طلب ہیں جناب شیخ
چوروں کو احترام سے گھر میں بلا لیا
ان کو کہاں حرم کا تحفظ عزیز تھا
ارض وطن کو بیچ کر خود کو بچا لیا

بروز جمعتہ المبارک 28 ذوالقعدہ 1431ھ 5 نومبر 2010ء

سکے کے دو رخ

تاریخ کو خون آلود راہداریوں میں ایک محل اور قصر شاہی کے دربار میں پڑا، ایک پتھر، بدلتے دنوں میں انسانوں کی بربریت، ظلم و جور اور حیوانیت کی کہانی مدتوں بیان کرتا رہا۔ اس پتھر پر سب سے پہلے اعلائے کلمۃ الحق کے قافلہ سالار شہید کربلا سیدنا امام حسین کا مقدس سر ابن زیاد کے سامنے رکھا گیا۔ پھر اسی پتھر پر ابن زیاد کا سر مختار بن ثقفی کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہی پتھر مختار بن ثقفی کے خون کی گواہی بنا جب اس کا سر عبداللہ بن زبیر کے سر بریدہ لاشوں کی بے سامنے پیش کیا گیا اور پھر اسی پتھر پر عبداللہ ابن زبیر کا سر حجاج بن یوسف کے روبرو تاریخ کی بربریت کی شہادت دیتا رہا۔ حرمتی، کٹے ہوئے سروں کی نمائش ان لوگوں کا فعل رہا جن میں بربریت انسانی احترام پر غالب تھی یا پھر جن کے انتقام کی آگ نے انہیں ان لوگوں کی پیروی کرنے پر مجبور کر دیا جن کے خلاف وہ حق کی آواز بلند کرتے تھے۔

میں تاریخ کی یہ کہانیاں پڑھتا تھا اور حیرت میں ڈوب جاتا تھا۔ احد کی وادیوں میں سیدنا حمزہ کی مقدس لاش کا مثلہ کرنے پر سید الانبیاءﷺ کا کرب اور دکھ میری آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ مجھے وہ ہدایت یاد آجاتیں جو آپﷺ لشکر کو جہاد پر روانہ کرتے ہوئے دیا کرتے تھے۔ کسی فصل کو تباہ نہ کرنا، کسی لاش کا مثلہ نہ کرنا، کسی عورت اور بچے پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ لیکن ان سب ہدایات کا تمسخر تاریخ میں جس طرح اس امت مسلمہ کے چند افراد نے اقتدار کی لالچ میں اڑایا وہ میری روح پر بوجھ تو تھا ہی لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اپنی ہی زندگی میں اس تمسخر کی آنکھوں دیکھی گواہی کے مسلسل عذاب میں مجھے گرفتار ہونا پڑے گا اور اس کرب کا تجربہ مجھے گزشتہ تریسٹھ سال سے جموں و کشمیر کی انگار وادی میں بغور مطالعہ سے ملے گا۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں پچھلی چھ دہائیوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس جنت ارضی میں ان تمام ظلم و ستم کے دوران کربلا کے میدان سجاتے وقت وزارت اعلیٰ کا منصب ان افراد کے پاس رہا جو اسی رحمۃ اللعالمینﷺ کی سنت کے دعویدار اور اس کے دین مبین کے علمبردار ہیں اور جن کی زبان ان کے ساتھیوں اور ان کے گھرانے سے محبت میں رطب اللسان رہتی ہے لیکن اقتدار کی خاطر ظالم کے ہاتھ پر بیعت کر کے تاریخ میں اپنے ہی ہم وطنوں کے قتل و غارت کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔

بدقسمتی سے نائن الیون کے بعد بالخصوص امریکا اور بالعموم مغرب نے مسلمانوں کے تمام مسائل سے نہ صرف چشم پوشی بلکہ ایک دشمنی کا رویہ اپنا رکھا ہے جس سے بھارتی حکومت بھی پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے، اس لئے ان کا تصورِ دہشت گردی اور انتہا پسندی صرف مسلمانوں کے گرد ہی گردش کرتا رہتا ہے۔ اس مدار میں اتنی خوبصورتی اور توازن ہے کہ بھول کر بھی یہ تصور بھارت کی بی جے پی اور اسرائیل کی لیکوڈ پارٹی کی طرف نہیں جاتا، جنہوں نے انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں سے بھی نچلی سطح پر رکھا ہوا ہے۔ جتنے بچے انہوں نے کشمیر، گجرات اور غزہ میں انسانوں کے مارے ہیں، اتنے اگر کسی جنگل میں سانپ کے مارے ہوتے تو امریکا اور مغرب میں جنگلی حیات اور ماحول کے تحفظ کی تنظیمیں ان ملکوں کے خلاف پابندیاں لگوانے میں کامیاب ہو چکی ہوتیں لیکن چونکہ ان جماعتوں کے ہاتھوں مرنے والے بچے مسلمانوں کے تھے اس لئے امریکا اور یورپ نے اسرائیل اور بھارت میں کبھی بھی انتہا پسندوں کی جیت پر ناگواری اور شکست پر مسرت کا اظہار نہیں کیا۔

ایمنسٹی انٹر نیشنل نے امریکی صدر باراک اوبامہ سے اپنے ایک خط میں بھارت کے مجوزہ دورے میں ان کی توجہ مسئلہ کشمیر کی طرف مبذول کرواتے ہوئے یہ مطالبہ کیا ہے کہ بھارت کو مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے پہل کرنے پر مجبور کیا جائے۔ کچھ دنوں پہلے دلی اور سرینگر کے سیمیناروں میں کشمیریوں کے انسانی حقوق کیلئے بلند ہونے والی آواز ایک عالمی شہرت یافتہ ارن دھتی نے بھی اٹھائی ،انہوں نے دلی سرکار کو ہوش کے ناخن لینے کا مشورہ دیا ہے۔ انہوں نے دلی سرکار سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ کشمیر میں اجتماعی قاتلوں اور عصمت کے لٹیروں کو جو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے اس کو لگام دی جائے اور اپنے بیان میں مزید کہا کہ تاریخ کے مستند حوالوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جموں و کشمیر کبھی بھی بھارت کا حصہ نہیں رہا اس لئے کشمیریوں کو ان کے بنیادی حق سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔ ارن دھتی کی صاف گوئی پر بی جے پی نے فوری طور پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے ان پر غداری کا مقدمہ قائم کرنے کا اور کانگرس نے ارون دھتی سے اس بیان سے دستبرداری کا مطالبہ کر دیا لیکن اس دبنگ عورت نے ایک دفعہ پھر حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ اس نے وہی بات کہی ہے جو سرینگر کے بچے بچے کی زبان پر ہے اور جو بھارت کے سیاسی مبصرین اور قلمکار سالہا سال سے کہتے چلے آرہے ہیں۔

ارن دھتی کا قصور یہ ہے کہ اس نے کشمیریوں کیلئے انصاف کا مطالبہ کیا ہے کہ اب تک بھارتی افواج کے ہاتھوں ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا ہے، پچاس ہزار سے زائد ماؤں کو ان کے جگر گوشوں سے جدا کر دیا گیا ہے کہ وہ اب کبھی دنیا میں واپس نہیں آئیں گے، تیس ہزار سے زائد نوجوان کشمیری بچیاں اپنے سہاگ کا خون دلی سرکار کے ہاتھوں پر عائد کر رہی ہیں، ایک لاکھ تیس ہزار بچے شفقتِ پدری سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ارن دھتی کا المیہ یہ ہے کہ وہ دلی سرکار سے ان دلت سپاہیوں کیلئے انصاف کی بات کر رہی ہے جو کشمیر کے اندر مارے جارہے ہیں، وہ چڈالو نامی گاؤں کے اس گندگی پر بنی قبروں کا تذکرہ کر کے دلی سرکار کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑنے کا جرم کر رہی ہے۔ وہ حقائق کی تلاش میں جنوبی قصبے شوپیاں پہنچ گئی جہاں ایک سال پہلے سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں منیلو فر اور آسیہ کی عصمت دری کرنے کے بعد ان کو بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا تھا اور جس کے قاتل آج بھی آزادی کے ساتھ دندناتے پھر رہے ہیں، آسیہ کے بھائی اور نیلوفر کے شوہر شکیل کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنے ان کے گھر پہنچ گئی جسے آج تک انصاف نہیں مل سکا، وہ اس گاؤں کی ماؤں بہنوں اور بھائیوں سے اظہار ہمدردی کر رہی تھی جنہوں نے اس ظلم کے خلاف مسلسل 47 روز مکمل احتجاج کیا لیکن انصاف کی بجائے ان کو مزید لاشوں کا تحفہ دیا گیا۔ وہ اس سوگوار گاؤں کی کیفیت کا مطالعہ کرنے گئی جس کے مکیں اب مکمل مایوسی اور صدمے سے دوچار ہیں اور جنہیں اب دلی سرکار سے کسی انصاف کی توقع نہیں۔

ارن دھتی نے ان سنگبازوں سے بھی ملاقات کی جن کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں، اس نے ایک ایسے نوجوان کے ساتھ سفر کیا جس نے اسلام آباد میں اپنے ایسے تین دوستوں کا ذکر کیا جن کے ہاتھوں کے ناخن کھینچ کر نکال دیئے گئے کہ وہ آئندہ سیکورٹی فورسز پر پتھر نہ پھینک سکیں۔ بے بس، مجبور و مقہور کشمیریوں کے حق میں انصاف کی فریاد کرنے والی کو بالآخر مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ ،، مجھے اس ملک و قوم پر افسوس ہو رہا ہے جس کو اپنے

قلمکاروں کو خاموش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، افسوس اس ملک پر جس کو انصاف کی بات کرنے والوں کو جیل بھرنے کی ضرورت پرتی ہے اور اس کے برعکس جہاں فرقہ وارانہ قاتل، اجتماعی قتلوں میں ملوث عناصر، گھپلے باز، عصمتوں کے لٹیرے اور غریبوں کا شکار کرنے والے آزاد گھوم رہے ہیں،،۔ یہ وہی ارن دھتی ہے جس نے چند سال قبل کشمیر سمیت بھارت کی شمال مشرقی ریاستوں میں فورسز کے ہاتھوں عوام پر بے پناہ ظلم وستم اور جبر کے پہاڑ توڑنے پر احتجاجاً پدم شری کا اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ 2008ء میں امرناتھ تنازعے کے موقع پر دلی سرکار کو یہ صلاح دیتے ہوئے کشمیریوں کے دل جیت لئے تھے کہ "اب وقت آگیا ہے کہ کشمیریوں کو آزادی جیسی نعمت سے ہمکنار ہونا چاہئے"۔

ارن دھتی کی یہ صاف گوئی جہاں دلی سرکار کو گراں گزری ہے وہاں بھارت کے ایک مشہور صحافی ودانشور جناب کلدیپ نیئر نے دلی سرکار کی وکالت کرتے ہوئے پونے مہاراشٹر میں دلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے من موہن سنگھ کو مسئلہ کشمیر کیلئے بہت مخلص قرار دیتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ،، کشمیر کا حل آئین ہند کے دائرے میں بھارتی خدوخال کے عین مطابق ہونا چاہئے،،۔ کیا کلدیپ نیئر کے پاس اس بات کو کوئی جواب ہے کہ اب تک کوئی ایک بھی ایسا عمل من موہن سنگھ کا سامنے کیوں نہیں آیا جس سے یہ محسوس ہو کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل میں بہت مخلص ہیں؟ اور پھر بھارتی خدوخال کا نیا مشورہ تو کشمیریوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ اگر 1947ء میں برطانوی وزیر اعظم چرچل یا ایٹلی پنڈت نہرو اور گاندھی جی کو اپنے اخلاص کا صدق دل سے ایسا ہی یقین دلاتے کہ برطانوی خدو خال میں بھارت کی آزادی کا حل تجویز کریں گے تو کیا کلدیپ نیئر اور دیگر بھارت کے اکابرین اس اخلاص کے طریقہ کار سے اتفاق کرتے؟ اگر ایسا حل اس وقت ممکن نہیں تھا تو اب بھی کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔

مناسب یہی ہے کہ کلدیپ نیئر کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف ارن دھتی کا ساتھ دیں اور ممکن ہو تو دلی سرکار کے قائم کردہ کئی "گوانتاناموبے" کیمپوں سے کشمیریوں کو رہائی دلوائیں۔ ابھی حال ہی میں بمنہ سرینگر کے شیخ فرحت محمود (جس کا قصور یہ تھا کہ اس نے جیل میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر بھوک ہڑتال کی تھی) کو کولکتہ کی جیل میں درگا پوجا کے پوتر دن الف ننگا کر کے ساری جیل میں گھمانے کی انسانیت سوز حرکت پر من موہن سنگھ کے اخلاص کی قلعی کھل کر سامنے آگئی ہے۔ کشمیر میں جاری انسانی حقوق کی لامتناہی پامالی، لاکھوں کشمیریوں نوجوانوں کا قتل، سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں ہزاروں کشمیری خواتین کی عصمت دری کا سلسلہ بند کرانے میں ارون دھتی کا ساتھ دیں نہ کہ ایسے بیانوں سے ان قوم وفرقہ پرست جماعتوں کی حوصلہ افزائی کریں جن کے نزدیک سچائی، حق پرستی کی کوئی وقعت نہیں اور طاقت وجبر کے بل بوتے پر کشمیریوں کو اپنا غلام بنائے رکھنا ان کے ایمان میں شامل ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ارن دھتی اور کلدیپ نیئر صحافت کے سکے کے دو ایسے رخ ہیں جن کی مشابہت کبھی ایک جیسی نہیں ہوتی۔

بروز منگل 3 ذوالحج 1431ھ 9 نومبر 2010ء

اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے!

پاکستانی وفاقی کابینہ کے ایک اہم وزیر اور پاکستان کی ایک انتہائی اہم شخصیت کا بیٹا اس وقت نیشنل انشورنس کارپوریشن میں اربوں روپے کی کرپشن کے بڑے ملزم ایاز خان نیازی کو بچانے کیلئے سینہ سپر میدان میں اتر آئے ہیں جس کے شواہد اور ثبوت اس سے پہلے انہی کالموں میں تحریر کئے جا چکے ہیں اور اس ملزم سے ابھی تک وفاقی انٹیلی ایجنسی یعنی ایف آئی اے کی رسائی ناممکن بنادی گئی ہے۔ اس سے ابھی تک نہ تو ابتدائی پوچھ گچھ ہو سکی ہے اور نہ ہی کوئی ایک سوال کا جواب مل سکا ہے۔ دبئی کے ایک نائٹ کلب کا یہ سابقہ مینجر ایاز خان نیازی جس کو چن کر پاکستان بلایا گیا اور اس کو نیشنل انشورنس کارپوریشن کا سربراہ مقرر کر دیا گیا تھا، اس نے پچھلے ڈیڑھ سال کے دوران زمینوں کے ایسے سودے کئے جس نے نیشنل کارپوریشن کے خزانے میں پڑے اربوں روپے خالی کر دیئے۔ دو بڑے سودے لاہور میں ہوئے جہاں کوڑیوں کے مول کی اراضی کو اربوں روپے میں خریدا گیا، ایک بڑا سودہ کراچی میں ہوا جہاں کورنگی کا ایک پلاٹ جو انتہائی ارزاں قیمت پر بھی کوئی خریدنے کو تیار نہیں تھا اس کو آسمان سے چھوتی ہوئی قیمت میں خرید لیا گیا۔

دبئی میں جب رئیل اسٹیٹ زمیں بوس ہو رہی تھی وہاں آفس ٹاور میں زمین 150 / درہم اسکوائر فٹ فروخت ہو رہی تھی جبکہ کارپوریشن نے اس کی قیمت 3350 درہم اسکوائر فٹ ادا کی گئی جو موجودہ قیمت سے کئی گنا زیادہ تھی اور آج اس کی قیمت میں چھ گنا کمی ہو چکی ہے، اس سے جہاں متعلقہ ادارے کو اربوں روپے کا خسارہ اٹھانا پڑا وہاں کچھ افراد کی جیبوں میں قومی دولت کے اربوں روپے منتقل کر دیئے گئے۔ جس طرح اور دوسرے بدعنوانی کے مقدمات زیر سماعت ہیں اسی طرح اعلیٰ عدلیہ نے براہ راست اس معاملے کی تحقیق کیلئے ایف آئی اے کو حکم دیا لیکن اس معاملے کی تحقیقات جس سست روی سے ہو رہی ہیں اس سے یہ اندیشہ بڑھتا جا رہا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اربوں روپے کی کرپشن کے تمام ثبوت ختم یا تلف کر کے اس معاملے کو بھی بالآخر داخل دفتر کر دیا جائے گا اور قوم ہمیشہ کی طرح ان بدعنوان عناصر کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کیلئے ایک ایماندار اہلکار ڈپٹی ڈائریکٹر ظفر قریشی نے جونہی اس بدعنوانی کے مقدمے کی تحقیق کے سلسلے میں ایاز خان نیازی کا 4 نومبر 2010ء کو وارنٹ گرفتاری حاصل کیا تو اس کا فوری تبادلہ کر دیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ ایک وفاقی وزیر نے ایاز خان نیازی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور ایف آئی اے کی دسترس کو ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اس مقدمے میں بااثر لوگوں کی دلچسپی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ملزم ایاز کو کیوں بچانا چاہتے ہیں۔

یاد رہے کہ 12/اکتوبر کو سپریم کورٹ نے اپنے تحریری بیان میں یہ حکم دیا تھا کہ،، سیکرٹری تجارت نے اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ معاہدوں میں بے ضابطگیاں ہوئی ہیں..... سیکرٹری تجارت کو ہدائت دی جاتی ہے کہ فوری طور پر ایف آئی اے میں ان معاہدوں کے حوالے سے چیئرمین ایاز خان نیازی اور دیگر افراد کے خلاف فوجداری رپورٹ درج کرائیں۔ ڈائریکٹر جنرل / ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل ایف آئی اے کو ہدائت کی جاتی ہے کہ قومی فنڈ میں خرد برد اور بدعنوانی میں ملوث تمام افراد کے خلاف قانون کے مطابق مقدمات درج کئے جائیں..... ڈائریکٹر جنرل ایف آئی اے، نیب کو تفتیشی عمل کے بارے میں مکمل آگاہ رکھیں گے.... ایف آئی اے اور نیب حتمی طور پر ملزمان کے خلاف کاروائی کے امور طے کریں،،۔ اب تازہ ترین جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ نیب کے پراسیکیوٹر جنرل نے گزشتہ پیشی میں عدالت عالیہ کو مطلع کیا تھا کہ اس مقدمے کا سارا ریکارڈ قبضے میں لے لیا

گیاہے اور تمام اکاؤنٹس منجمد کر دیئے گئے ہیں لیکن انتہائی مصدقہ ذرائع سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ عدالت عالیہ کو یہ بیان دینے کے باوجود مقدمے کے ایک اور ملزم حبیب اللہ وڑائچ نے اسی اکاؤنٹ سے لاہور کے ایک بین الاقومی بینک سے پچاس کروڑ روپے نکلوالئے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ ظفر قریشی نے نیشنل انشورنش کے بورڈ کے کچھ دیگر ممبران سید حر گردیزی، سید نوید حسین زیدی، عجاز شیخ، ایوب صدیق بٹ، ممبر بورڈ آف ڈائریکٹرز، سید زاہد حسین جنرل مینجر رئیل اسٹیٹ، سید اطہر نقوی جنرل مینجر آڈٹ، اعجاز شیخ جنرل مینجر لائی، محمد ظہور ایگزیکٹو ڈائریکٹر فنانس کو بھی گرفتار کیا لیکن انہیں مجبور کیا گیا کہ ان افراد کا ریمانڈ دو یا تین دن سے زائد نہ لیا جائے۔ اس بدعنوانی کے ثبوت جو بکھرے پڑے ہیں ان تمام افراد کے عدم تعاون اور بااثر لوگوں کے دباؤ کی بناء پر اکٹھے کرنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔ اس سکینڈل کے سب سے بڑے ملزم سے ابھی تک ایک سوال بھی پوچھنے کی اجازت نہیں مل رہی کیونکہ وہ انہی بااثر لوگوں کی پناہ میں ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ نیشنل انشورنس کارپوریشن وزارتِ تجارت کے تحت کام کرتی ہے جس کے سربراہ مخدوم امین فہیم ہیں۔ اس سکینڈل کے علاوہ دیگر بدعنوانی کے شاہکار بھی اسی وزارتِ تجارت کے ساتھ موسوم کئے جارہے ہیں لیکن ابھی تک وزیر موصوف نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اب ان معاملات کی تحقیق کیلئے خاصا دباؤ بڑھ رہا ہے لیکن حکومتی اثرورسوخ کی بناء پر کئی ثبوت ضائع کر دیئے گئے ہیں۔ امین فہیم ان کرپشن کے معاملات پر اب تک میڈیا کی طرف سے ٹھوس شواہد مہیا کرنے کے باوجود کسی بھی کاروائی سے گریز کر رہے ہیں، آخر کیوں؟

☆امین فہیم جن کا ایک سیاسی مقام تھا اب پچھلے دنوں سے خود کئی الزامات کی زد میں بری طرح پھنس چکے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ خبر بھی آئی ہے کہ انہوں نے آخری بار مئی 2009ء میں بجلی کا آخری بل ادا کیا تھا اور جون 2010ء تک ان پر کے ای ایس ای کے 6 لاکھ 12 ہزار کا بل ابھی تک واجب الادا ہے۔

☆نومبر 2009ء میں مخدوم امین کی صاحبزادی ملیحہ مخدوم کو آئرلینڈ میں براہِ راست فرسٹ سیکرٹری تعینات کیا گیا، سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی اور اٹھارہ ماہ کی تربیت ضروری ہوتی ہے لیکن ملیحہ مخدوم کو دونوں شرائط کے بغیر ہی خارجہ سروس میں شامل کر دیا گیا۔

☆نومبر 2008ء میں جن 28 سیاسی چہیتوں کو وزیر اعلیٰ سندھ نے ضروری امتحان سے مستثنیٰ قرار دیا اور ترقی دے دی، ان میں مخدوم امین فہیم کے دو صاحبزادے مخدوم شکیل الزماں اور مخدوم عقیل الزماں شامل تھے۔

☆اس کے علاوہ فروری 2010ء کو یہ بات سامنے آئی تھی کہ وزارت تجارت نے ایک انتہائی غیر معمولی طریقے سے مخدوم امین فہیم کی باقاعدہ منظوری کے بعد ملتان سے تعلق رکھنے والی آئیڈیل ٹریڈنگ کمپنی کو ایک کروڑ ٹن استعمال شدہ فرنس اور لیوب آئل درآمد کرنے کی "خصوصی" اجازت دی، جس کا مطلب یہ کہ اگر وہ منظور نظر شخص یہ تمام مطلوبہ سامان درآمد کر لیتا تو اسے راتوں رات اربوں ڈالر کا نفع حاصل ہو جاتا۔ میڈیا میں اس سکینڈل کے افشاء ہو جانے کے بعد اس خصوصی منظوری کو منسوخ کرنا پڑا لیکن اس بدعنوانی کی آج تک تحقیق نہیں ہو سکی

☆اگست 2009ء میں اپنے منظورِ نظر شخص کو ٹریڈنگ کارپوریشن پاکستان کا چیئرمین مقرر کیا گیا جس نے اجناس کی درآمد اور ان کی مہنگے داموں شپنگ کیلئے خفیہ سودوں کے ذریعے غیر شفاف طریقہ کار اپنایا جبکہ درآمدات کا وقت ایسا رکھا گیا تاکہ مقامی منڈیوں سے بھی زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جاسکے۔

☆بندر گاہوں پر کارگو ہینڈلنگ کے نئے ٹھیکے پچھلے نرخوں سے تین گنا زیادہ قیمت پر دیئے گئے، یوریا کی غیر شفاف درآمد کے ذریعے قومی خزانے کو بیس ارب روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

☆ گوادر پورٹ پر گندم کی درآمد کیلئے کارگو ہینڈلنگ کے ٹھیکے مارکیٹ میں رائج قیمت سے 5 گنا زیادہ دیئے گئے۔

☆ چینی کی درآمد پر اقتصادی رابطہ کمیٹی کے فیصلوں کو سوچی سمجھی سازش کے تحت یکسر نظر انداز کیا گیا جس کی بناء پر شوگر مافیا نے غریب عوام کی جیبوں سے اربوں روپے کا صفایا کر دیا۔

☆دوسری طرف نیشنل انشورنس کارپوریشن کو کراچی اسٹاک ایکسچینج میں پانچ ارب روپے کا خسارہ اٹھانا پڑا، آج تک اس معاملے کی کوئی تحقیق نہیں ہو سکی کہ آخر اس بدعنوانی کی بہتی گنگا میں کن افراد نے غوطے لگائے ہیں!

نیشنل انشورنس کارپوریشن کیونکہ براہ راست وزیر تجارت کے ماتحت کام کرتی ہے لیکن اس سکینڈل کے بارے میں مخدوم امین فہیم نے مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی ہے اور میڈیا بار بار چیخ چیخ کر اپنے اس الزام کو دہرا رہا ہے کہ اس سکینڈل کے مرکزی ملزم ایاز نیازی ایک وفاقی وزیر اور ایک اہم شخصیت کے صاحبزادے کی تحویل میں پناہ لئے ہوئے ہے اور ان کی تصاویر انٹرنیٹ بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ پاکستانی تحقیقاتی اداروں کو بھی بخوبی علم ہے کہ ملزم اس وقت کن بااثر لوگوں کی تحویل میں ہے۔

دوسری طرف ایشیائی ترقیاتی بینک سے دو ارب ڈالر کا قرضہ منظور ہو گیا ہے اور اب سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد تعمیر نو کے نام پر اس کی لوٹ کھسوٹ کے منصوبے بھی تیار کر لئے گئے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اس سیلاب کی مد میں جو عالمی امداد ملک میں پہنچی ہے اور ان رقوم کو کہاں کہاں استعمال کیا گیا اس کی تمام تفصیلات سے قوم کو مطلع کیا جاتا لیکن اس کی پرواہ کئے بغیر ملک کو ایک بار پھر قرضوں کی دلدل میں ڈبویا جارہا ہے۔ معاشی ماہرین کی رائے میں پچھلے 25 سالوں میں اتنے قرضے نہیں لئے گئے جتنے اس حکومت نے پچھلے ڈھائی سالوں میں قوم کی کمر پر لاد دئے ہیں۔ اس وقت ہر پاکستانی پہلے ہی پچاس ہزار کا مقروض ہے اور پانچ کروڑ سے زائد پاکستانی رات کو بھوکے سوتے ہیں۔ سندھ میں تعمیر نو کے نام پر ان نہروں کی از سر نو تعمیر کا مرحلہ شروع کیا گیا ہے جس کو حالیہ سیلاب نے تہہ وبالا کر دیا تھا۔ اس کیلئے حکومت سندھ نے 72 کروڑ روپے کے مختلف منصوبوں کا آغاز کیا ہے لیکن بدنصیبی سے ان کی ابتداء ہی بدعنوانی و کرپشن سے ہوئی ہے۔

من پسند ٹھیکیداروں کو انتہائی غیر شفاف طریقوں سے نوازنے کا کام جاری ہے۔ محکمہ آبپاشی سندھ نے ان کاموں کیلئے چند اخبارات میں ٹینڈر وصول کرنے کیلئے اشتہار شائع کروائے جس میں ٹینڈر داخل کروانے کی تاریخ 4 نومبر اور کھولنے کی تاریخ 5 نومبر مقرر کی گئی لیکن بعد ازاں اپنے من پسند ٹھیکیداروں کو شامل کرنے کیلئے اس کی تاریخ بڑھا کر 8 نومبر کر دی گئی۔ میڈیا میں یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ اعلیٰ حکام کی جانب سے یہ ٹینڈر ان کمپنیوں

کے حوالے کئے گئے ہیں جو 12٪ سے لیکر 15٪ کمیشن ادا کرنے کیلئے رضامند ہوئے ہیں۔ یہ کمیشن مقامی وزراء میں تقسیم ہو گا۔ پھر ان ٹینڈرز کی تحریری وصولی کیلئے 5٪ کمیشن مزید ادا کرنا پڑے گا جو چیف انجینئر اور سپرنٹنڈنٹ انجینئرز اور ایکسئن میں تقسیم ہو گا اور پھر ہر بل کی ادائیگی کے وقت دس سے پندرہ فیصد الگ سے کمیشن ادا کرنا پڑے گا۔ اس طرح ٹھیکے کی کل مالیت کا 40٪ سے لیکر 45٪ کمیشن کی نظر ہو جائے گا اور اس طرح بقیہ ساٹھ فیصد سے لیکر 55٪ میں ٹھیکیدار کو اس کام کی تکمیل میں صرف کرنا ہو گا جس میں یقیناوہ اپنا نفع بھی کمائے گا۔ اس طرح کل 32 ٹینڈر 71 کروڑ 61 لاکھ روپے کے ٹینڈر جاری کر دیئے گئے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام ٹینڈر کے اشتہارات علاقے کے معمولی اخبارات کو جاری کئے گئے جبکہ محکمہ آبپاشی کی سرکاری ویب سائٹ پر ان کی اشاعت سے دانستہ گریز کیا گیا۔ حکومت سندھ نے اس سلسلے میں محکمہ آبپاشی کو ایک ارب روپے کے فنڈز بھی جاری کر دیئے ہیں تاکہ 15 جنوری 2011ء تک ان تمام کاموں کی تکمیل کی جاسکے۔

ملک کی ٹیکسٹائل انڈسٹری جو پہلے ہی توانائی کے بحران اور گیس کی لوڈشیڈنگ کے عذاب کا شدید شکار ہے اور اس کو مزید برباد کرنے کیلئے اب عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے حکم پر جبری ریفارمڈ جنرل سیلز ٹیکس کے ساتھ فلڈ ٹیکس لگادیا گیا ہے۔ ملک میں بجلی ناپید ہے لیکن اس کے ہوشربا بلوں میں ہر مہینے 2٪ اضافہ کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا ہے۔ شوگر مافیا بے لگام ہو چکا ہے، پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں اضافہ کر کے ملک میں مہنگائی کا جن بے قابو ہو چکا ہے۔ اسی حکومت کے سابقہ وزیر خزانہ شوکت ترین ملک میں ہر سال پانچ سو ارب کی بدعنوانی کا انکشاف کر کے مستعفی ہو کر گھر چلے گئے لیکن یہ بدعنوانی اور کرپشن کے پہاڑ نے پاکستانی عوام کو کچل کے رکھ دیا ہے اور اب پاکستانی برملا اس حکومت سے جان چھڑانے کیلئے موت کی تمنا کر رہے ہیں ۔ قارئین! یہ خبر شائد آپ کیلئے دھچکہ سے کم نہ ہو گی کہ پہلی مرتبہ لندن میں ہونے والی عالمی ایئر لائن کی نمائش میں جہاں چھوٹے سے چھوٹے ملک نے بھی شرکت کی ہے وہاں پی آئی اے کی کوئی نمائندگی یا سٹال موجود نہیں تھا گویا اس غیر حاضری سے ایک انتہائی خطرناک پیغام ارسال کر دیا گیا ہے..؟ قارئین! یہ ہے اس حکومت کی کرپشن کا ایک چھوٹا سا خاکہ، اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ تعمیر نو کے نام پر اب اور کتنی بربادیوں کا سامنا کرنا ہے!

بروز جمعتہ المبارک 6 ذوالحج 1431ھ 12 نومبر 2010ء

جگ ہنسائی

ادھر راولپنڈی میں مقیم کسی شخص کے چہرے پر خوف اور تشویش کے وہ سائے دکھائی نہیں دیتے جو ہزاروں میل دور قصرِ سفید، پینٹا گون اور سی آئی اے کے مکینوں کے چہروں سے ہویدا ہیں۔ راولپنڈی میں گھومنے والا کوئی شخص ذرہ برابر متفکر نہیں کہ ان کے گھروں سے چند کلومیٹر دور کہوٹہ جیسے قصبے میں شہروں، بستیوں، آبادیوں اور انسانوں کو آنِ واحد میں صفحہ ہستی سے مٹا دینے والا ایسا ایٹمی مواد موجود ہے جس کو ایٹمی مواد کے کچھ نو سر باز، چور یا کوئی گروہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چرا کر لیجائے گا، کیونکہ راجہ بازار کے کسی کونے میں ٹھیلا لگانے والا بھی جانتا ہے کہ یہ ایٹم بم کوئی چنے کی دال کی معمولی سی پلیٹ یا کوئی فریج میں لگی ہوئی پیپسی کی بوتل نہیں جسے کوئی دیوار پھلانگ کر بغل میں دبا کر نکل بھاگے گا لیکن حیرت کی بات یہ ہے راولپنڈی کے اس سکون کے برعکس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا دعویٰ کرنے والے واشنگٹن کے چہرے کی ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں؟ امریکا میں پچھلے انتخابات میں صدارتی انتخاب کی دوڑ میں شریک ہلیری کلنٹن نے پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے غیر محفوظ ہونے اور انہیں امریکی تحویل میں لینے کا عندیہ دیا تھا جبکہ باراک اوبامہ کا عزم تھا کہ اگر اسامہ بن لادن کی پاکستان موجودگی کا پتہ چلا تو پاکستان پر حملہ کر دیا جائے گا۔ اب ہلری کلنٹن سیکرٹری خارجہ ہیں اور باراک اوبامہ امریکا کے صدر!

قصر سفید کی جنگی پالیسی ترتیب دینے والے ادارے پہلے جارج بش کو مشورے دیتے تھے اور اب باراک اوبامہ ان کی پالیسیوں کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔ ابھی حال ہی میں امریکا کے مشہور صحافی "باب وڈوارڈ" کی کتاب "اوبامہ کی جنگیں" افغانستان، عراق اور پاکستان میں جاری امریکی جنگوں کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کتاب کے تہلکہ خیز انکشافات میں پاکستان کا ذکر تواتر کے ساتھ آیا ہے اور اس امریکی صحافی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کتاب اوبامہ کی ذاتی یادداشتوں، مرتب دستاویزات، میٹنگز کے نوٹس اور سرکردہ شخصیات کے ساتھ سینکڑوں گھنٹوں پر محیط انٹرویوز کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر امریکا پاکستان کو اس،، وار آن ٹیرر،، میں اپنا سب سے بڑا اتحادی کہتا ہے لیکن درپردہ پاکستان کی تباہی کیلئے کیا خوفناک و ہولناک منصوبے اس نے ترتیب دے رکھے ہیں۔

مصنف اپنی کتاب میں تحریر کرتا ہے،، پاکستان میں جہاں ڈرون طیارے حملہ نہیں کر سکتے وہاں کس طرح کاروائی کی جائے؟ اس کا ایک حل یہ تھا کہ امریکی کمانڈوز پاکستانی سرحد عبور کر کے پاکستان کے اندر جا کر کاروائی کریں۔ اس بہترین آئیڈیا کی منظوری کیلئے صدر بش نے 3 ستمبر 2008ء کو خصوصی احکامات جاری کئے کہ پاکستان کی سرحد کے اندر "انگوراڈہ" وزیرستان میں زمینی حملے کے دوران امریکی کمانڈوز انتہائی تیزی کے ساتھ حملہ آور ہو کر اپنے ہدف القاعدہ اور طالبان کی اہم شخصیات کو ہلاک کر کے تمام اہم دستاویزات و کمپیوٹرز کو اٹھا کر واپس افغانستان آ جائیں ۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ ان کمپیوٹرز اور دستاویزات میں ایسی معلومات ہونگی جن کی مدد سے طالبان اور القاعدہ کے اہم منصوبوں اور شخصیتوں کو بے نقاب کیا جا سکے گا۔ اس منصوبے کیلئے انتہائی اعلیٰ تربیت یافتہ اور بہترین ہتھیاروں سے لیس 20/امریکی کمانڈوز کامیابی سے اپنے ہدف تک پہنچ گئے تھے مگر ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ دنیا کے ایک ایسے علاقے میں کاروائی کر رہے تھے جہاں لوگ گولیوں اور بموں کی آواز سن کر خوفزدہ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس جگہ سے دور بھاگتے ہیں بلکہ اپنے ہتھیار اٹھا کر فوراً اس طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہیں تاکہ دیکھ سکیں کہ کیا ہو رہا ہے،،۔ میک کونیل نے اوبامہ کو بتایا کہ

،،یہ آپریشن بری طرح ناکام رہااور بھیانک خواب بن کر رہ گیا،،۔ کونیل نے اوبامہ کے سامنے اعتراف کیا کہ،،اس آپریشن کی منصوبہ بندی انتہائی ناقص تھی،،۔اس طرح وزیرستان میں امریکی کمانڈوز کا زمینی آپریشن مقامی قبائلیوں نے ناکام بنادیا۔

اس خطرناک منصوبے کی منظوری جارج بش نے اوبامہ کے صدر منتخب ہونے سے صرف دوماہ قبل دی تھی اوراب 6 نومبر 2008ء کو شکاگو میں آسمان سے بات کرتی ہوئی "کلوزینسکی فیڈرل بلڈنگ" میں امریکی نیوی کا ریٹائرڈ وائس ایڈمرل میک کونیل ڈائریکٹر نیشنل انٹیلی جنس صدراوبامہ کو اپنی پہلی بریفنگ میں اس خفیہ منصوبے کے بارے میں آگاہ کررہا تھا۔ نیشنل انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر ہی وہ واحد شخص ہوتا ہے جو پوری دنیا میں امریکی جاسوسی کے تمام خفیہ ایجنٹس اور ان کی کاروائی سے واقف ہوتا ہے۔امریکی صدر کو نیشنل انٹیلی جنس کی زبان میں،،سب سے پہلا گاہک،، کہا جاتا ہے۔اس عمارت میں میک کونیل کے ہمراہ مائیکل جے موریل بھی موجود تھا جس نے نائین الیون کے بارے میں سب سے پہلی بریفنگ سابق صدر جارج بش کو دی تھی اوراب وہ سی آئی اے کے تجزیاتی ونگ کا سربراہ ہے۔اوبامہ کو پہلی بریفنگ دینے میں اس قدر راز داری کا خیال رکھا گیا کہ اوبامہ کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں اہم ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد کو بھی اس بریفنگ میں آنے سے روک دیا گیا ۔ انہی میں سے ایک "جان پوڈیسٹا" بھی تھا جس نے بل کلنٹن کے ساتھ بھی چیف آف سٹاف کے طور پر کام کیا تھا اور اب اوبامہ کی ٹیم کا اہم رکن ہے۔میک کونیل کو جب یہ بتایا گیا کہ صدراوبامہ کے ساتھ وائٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اہم افراد بھی اس بریفنگ میں شامل ہونگے تو میک کونیل نے ایک لمحے کیلئے رک کر سب کو دیکھا اور فوری طور پر صاف صاف کہہ دیا ،،نہیں،،۔صدر بش نے اپنے دور میں ایک قانون بنایا تھا کہ امریکا دنیا بھر جو کچھ کررہا ہے وہ کبھی بھی کسی غیر متعلقہ فرد کے کان میں نہیں پڑے گا، صرف منتخب لوگ ہی اس کام سے واقف ہونگے جو عراق افغانستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فتح حاصل کرنے کیلئے کیا جارہا ہے۔

بریفنگ کے دوران امریکی صدر کو بتایا گیا کہ "عراق اورافغانستان سے امریکا کو کوئی خطرہ نہیں ہے،اگر وہ کچھ عرصہ پاکستانی انٹیلی جنس کے ساتھ کام کریں گے تو آخر کاران کو دل کا دورہ پڑ جائے گا،پاکستانی خفیہ ادارے کے کئی روپ ہیں۔اس وقت اصل خطرہ پاکستان سے ہے جس کی طویل سرحد افغانستان سے لگتی ہے اوراس کے پاس سو کے قریب ایٹم بم ہیں جو دنیا کو تباہ کرنے کیلئے کافی ہیں،اسی لئے ہر ڈرون حملے سے قبل پاکستان کو باقاعدہ اطلاع دی جاتی ہے"۔میک کونیل نے اوبامہ کے سامنے یہ معاملہ بھی رکھا کہ پاکستان کے ساتھ معاملات کس طرح طے کئے جائیں کیونکہ افغانستان میں طالبان اورالقاعدہ کے خلاف جنگ میں پاکستان امریکا کا "بے ایمان اتحادی" ہے اور "پاکستانی جھوٹ پر زندگی گزار رہے ہیں"۔"وہاں باقاعدہ ایک دفتر قائم ہے جو ہماری جڑیں کھود رہا ہے،،۔کونیل نے اپنی بریفنگ جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "پاکستانی انٹیلی جنس کے چھ سات روپ ہیں،ان میں

کچھ کو سی آئی اے نے خرید کر اپنا بنالیا ہے مگر اس کا ایک روپ وہ ہے جو طالبان اور دیگر جہادی جماعتوں کی ہر طرح سے مدد کرتا ہے اور پیچھے کوئی سراغ بھی نہیں چھوڑتا"۔

لیکن ایک راز جو کبھی بھی میڈیا میں نہیں آسکا، وہ یہ تھا کہ،، صدر بش کی منظوری سے سی آئی اے نے 3000 کمانڈوز پر مشتمل ایک غیر سرکاری خفیہ قاتل دستہ تیار کر رکھا ہے، اس میں اکثر لوگ افغانستان سے لئے گئے ہیں۔ ان تمام افراد کو انتہائی اعلیٰ قسم کی تربیت دیکر جدید ہتھیاروں سے لیس کیا گیا ہے اور ان کا کوڈ نام "سی ٹی پی ٹی" ہے۔ ان لوگوں کا کام یہ ہے کہ افغانستان بھر میں طالبان اور القاعدہ کے افراد کو ڈھونڈیں، گرفتار کریں یا مار ڈالیں۔ اس ٹیم کے کمانڈو دستے اکثر پاکستانی قبائلی علاقوں اور وزیرستان میں کاروائیاں کرتے رہتے ہیں"۔

قارئین! اس اعتراف کے بعد ان خدشات کو یقین کی حد تک تقویت ملتی ہے کہ قبائلی علاقوں کے مشیران کا بے دریغ قتل اور گاہے بگاہے مساجد اور جرگوں میں سفاکانہ خودکش حملوں کے پیچھے کون سے مکروہ ہاتھ تھے لیکن بغیر کسی تحقیق کے اس کی ذمہ داری کسی ایسے گروپ پر ڈال کر خود کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا۔ بریفنگ میں یہ بھی بتایا گیا کہ امریکی فوج کے پاس ایک ایسا خفیہ منصوبہ ضرور تھا جسے سب سے زیادہ خفیہ منصوبہ قرار دیا جاتا تھا کہ،، اگر پاکستان سے تعلق رکھنے والا کوئی گروپ امریکا یا امریکی شہریوں پر نائن الیون کی طرز کا حملہ کرتا ہے تو امریکا کا کیا جواب ہوگا؟ جواب یہ تھا کہ امریکی انٹیلی جنس اداروں نے پاکستانی شہروں اور دیہاتوں میں 150 مقامات کی نشاندہی کر رکھی ہے جن کے بارے میں یہ دعویٰ تھا کہ یہاں شدت پسندوں یا جہادیوں کے مبینہ کیمپ ہیں۔ اگر کوئی دہشتگرد گروپ حملہ کرتا ہے تو جوابی طور پر فوری پاکستان کے 150 مقامات پر بمباری کر دی جائے۔

جب ممبئی حملے ہوئے تو یہ منصوبہ زیرِ غور آیا۔ امریکی انٹیلی جنس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ اب ان میں سے کئی مقامات پر جہادیوں کے کیمپ نہیں رہے مگر بش نے کہا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اب وہاں کون رہ رہا ہے۔ منصوبہ صرف دہشتگردوں کے کیمپوں کو نشانہ بنانے کے بارے میں نہیں ہے بلکہ سادہ سی بات یہ ہے کہ پاکستان میں 150 مقامات پر سفاکانہ بمباری کر کے سزا دی جائے"۔ ممبئی حملوں کے 48 گھنٹوں کے اندر اندر یہ منصوبہ پھر تبدیل ہو گیا کہ سی آئی اے کے سربراہ ہیڈن کو انٹیلی جنس کے اداروں نے اپنی تحقیقات کے بعد مطلع کر دیا کہ اس میں پاکستانی انٹیلی جنس کا کوئی ہاتھ نہیں، اس طرح یہ معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ ٹل گیا۔ اگر بالفرض اس تحقیق میں کوئی تاخیر ہو جاتی یا جس طرح عراق کے ان مبینہ ایٹمی ہتھیاروں کو ختم کرنے کیلئے پورے عراق پر بمباری کر کے اس کو نیست و نابود کر دیا گیا ہے تو کیا آج عراق کی طرح پاکستان کی تباہی پر بھی صرف افسوس کا ایک جملہ کافی ہوتا!

لیکن اب امریکی خفیہ اداروں کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ تمام امریکی خفیہ اداروں کا یہ کہنا ہے کہ ممبئی میں اتنے کم سرمائے اور وسائل میں اتنے خوفناک اور مؤثر حملے کو کس طرح ممکن بنایا گیا؟ حملہ آوروں نے جدید ترین ٹیکنالوجی، ہدف تک پہنچنے کیلئے دستیاب گلوبنگ پوزیشن اور تازہ ترین نقشوں کیلئے انٹرنیٹ سے گوگل ارتھ اور ریموٹ کنٹرول کو معمولی رقم کے عوض کس مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اپنے رابطہ کاروں کے ساتھ سیٹلائٹ ٹیلیفون میں جو انتہائی پیچیدہ وائس اوور انٹرنیٹ پروٹوکول استعمال کی، وہ امریکی ریاست نیوجرسی میں

رجسٹرڈ تھی اس سے ان کی گفتگو کی جگہ کا پتا لگانا اگر نا ممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا اور اس طرح وہ اپنی منصوبہ بندی میں کامیاب رہے۔ ایف بی آئی اور سی آئی اے اس بات پر ششدر اور خوفزدہ تھے کہ ایک چھوٹے شدت پسند گروپ نے تھوڑے سے وسائل میں عام مارکیٹ میں دستیاب جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کر کے پورے ممبئی کو یرغمال بنالیا، اگر امریکا میں ایسا کوئی حملہ ہوا تو وہ اسے کیسے روکیں گے ؟

لیکن ہماری موجودہ حکومت کا ممبئی حملوں پر کیا ردعمل تھا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ ہمارے وزیر اعظم نے گھبراہٹ اور پریشانی میں فوری طور پر آئی ایس آئی کے سربراہ کو بھارت بھیجنے کا وعدہ کر لیا جس سے اقوام عالم کو یہ تاثر ملا کہ یہ کاروائی شائد کسی پاکستانی ادارے کے ایماء پر کی گئی ہو اور دوسری طرف اقوام متحدہ میں اپنے ہی مستقل مندوب کو پاکستان کی چند مذہبی اور دعوتی جماعتوں پر پابندی لگوانے کے احکام جاری کر دیئے گئے اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنے بہترین دوست چین سے بھی اس قرارداد کو ویٹو نہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ جماعت دعوۃ کے امیر حافظ سعید اور دیگر افراد کو گرفتار کر کے ان کے تمام دفاتر سیل کر دیئے گئے۔ اعلیٰ عدالتوں کی مداخلت پر حکومت کو اس معاملے پر بھی ندامت کا سامنا کرنا پڑا لیکن جگ ہنسائی سے پاکستان کے وقار کو جو نقصان پہنچا اس کا خمیازہ آج تک بھگت رہے ہیں۔

ہمارے ہاں میریٹ ہوٹل سے لیکر کراچی سی آئی ڈی کے دفاتر تک خودکش حملوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ہمارے ارباب اختیار کو اس بات کی جرأت نہیں کہ وہ پاکستان کے اس خفیہ دشمن کا نام عوام کو بتا سکیں۔ ہر ایسے خوفناک حملے کے فوری بعد میڈیا کے سامنے ہمارے وزیر داخلہ دو درجن سے زائد حفاظتی گارڈ کے جلو میں آکر اپنے رٹے رٹائے بیان کے ساتھ قوم کے ساتھ ایک بہیمانہ مذاق کر کے قوم کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر کے دوبارہ اسی تنخواہ پر کام کرنے کیلئے اپنے آقاؤں کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ اب عوام کی برداشت کی نسیں پھول کر پھٹنے کے قریب ہیں اور اب وہ وقت دور نہیں کہ تاریخ ایک مرتبہ اپنے آپ کو دہرائے گی جہاں ظالموں کے ساتھ معاملہ ماورائے عدالت کیا جاتا ہے ۔۔!

9ذوالحج 1431ھ 15نومبر 2010ء

بے مثال قربانی؟

فیصل آباد کی ڈی ٹائپ کالونی کا محمد بشیر، اس کی بیوی اور اس کے تین بچے مجھے سونے نہیں دے رہے، میں جب بھی آنکھ بند کرتا ہوں مجھے محمد بشیر کے ہاتھ چھری نظر آتی ہے۔ وہ مجھے اپنی بیوی کے سینے پر بیٹھا نظر آتا ہے، اس کی چھری کبھی زینب بی بی کا گلا کاٹتی دکھائی دیتی ہے، کبھی ڈیڑھ سال کے شہزاد کے گلے میں اترتی ہوئی نظر آتی ہے اور کبھی چھ سال کی کوثر کی شہہ رگ غائب ہو جاتی ہے اور آخر میں جب پورے کمرے میں خون پھیل جاتا ہے اور محمد بشیر بھی زہر کھا کر نعشوں کے ساتھ لیٹ جاتا ہے تو اس کا ساڑھے چار سال کا بیٹا سہیل اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے، صبح لوگوں کو یہ بچہ روتا ہوا بد قسمت نعشوں کے ساتھ بیٹھا ملتا ہے، اس وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں پانی پیتا ہوں اور باقی ساری رات پریشانی میں اپنے گھر کے افراد کے کمروں میں جھانک کر ان کو آرام سے سوتا دیکھ کر مطمئن تو ہو جاتا ہوں لیکن دل کی پریشانی مجھے دوبارہ بستر پر جانے کی اجازت نہیں دیتی۔

فیصل آباد کی ڈی ٹائپ کالونی مجھ سے بہت دور ہے، میں محمد بشیر اور زینب بی بی کو بھی نہیں جانتا، میں اس کے بچوں کوثر، سہیل اور شہزاد سے بھی واقف نہیں ہوں، میرا ان مرے مٹے، قتل ہوئے لوگوں سے کوئی خونی اور کوئی جسمانی رشتہ یا تعلق بھی نہیں لیکن اس کے باوجود نجانے کیوں میں عید کے دن سے خود کو ان کا مجرم سمجھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے میں ان چار نعشوں کا تن تنہا مجرم ہوں، یہ سارے قتل میری گردن پر عائد ہوتے ہیں، میں اس کہانی، اس داستان کا ایک کردار ہوں۔

محمد بشیر کی کہانی اس ملک کے پچاس فیصد لوگوں کی داستاں ہے بس ان آٹھ کروڑ لوگوں اور بشیر میں صرف ارادے اور جرأت اور موت کو قبول کرنے کے حوصلے کا فرق ہے۔ محمد بشیر ان سے زیادہ جرأت مند اور حوصلہ مند تھا۔ محمد بشیر پانڈی تھا، بوجھ اٹھا کر روزی کماتا تھا۔ چھ ماہ پہلے نوکری سے چھٹی مل گئی تھی، اس نے اپنی ماں کے ساتھ روئی کی دھنائی کا کام شروع کر دیا لیکن یہ مزدوری اسے اور اس کے بچوں کو روٹی نہ دے سکی۔ عید کے دن ان کے گھر فاقہ تھا جب پورے محلے میں قربانی کا گوشت پک رہا تھا، جب محلے کے سارے بچوں نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، ہاتھوں پر مہندی لگا رکھی تھی تو اس وقت محمد بشیر کے بچوں کے تن پر پرانے بدبودار چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ محمد بشیر کے گھر کا چولہا ٹھنڈا تھا، فاقوں نے محمد بشیر کی بیوی کو زبان دے دی۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

میاں بیوی میں خوب لڑائی ہوئی، محمد بشیر اپنی ماں کے گھر گیا۔ ماں کو اپنی پریشانی سے مطلع کیا تو اس غریب خاتون نے کسی کے گھر سے آئے ہوئے چاول اپنے منہ سے اٹھا کر اس کے حوالے کر دیئے اور خود بھوکی سو گئی۔ محمد بشیر نے ان چاولوں میں زہر ملایا اور چاول بھوکے بچوں کے سامنے رکھ دیئے ۔ زینب بی بی اور کوثر نے یہ چاول کھا لئے، شہزاد ابھی کھانے کی عمر کو نہیں پہنچا تھا، سہیل کو قدرت نے بچانا تھا، وہ مونگ پھلی کھاتا رہا جو اس کے پڑوس میں رہنے والے بچے نے اس پر ترس کھاتے ہوئے تھوڑی دیر پہلے اسے دی تھی۔ محمد بشیر نے اندر سے تالہ لگایا، بیہوش بیوی کے سینے پر بیٹھا اور چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا، وہ پھر شہزاد کے پاس پہنچا اور اسے ڈیڑھ سال کے بچے کا گلا کاٹنے میں صرف چند سیکنڈ لگے، کوثر چھ سال کی بچی تھی اور محمد اسلم کی بہت ہی لاڈلی اور پیاری تھی، وہ باپ کی چھری کے نیچے دیر تک تڑپتی رہی۔ سہیل ان مناظر کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا اور جلدی سے گھر کے کونے میں

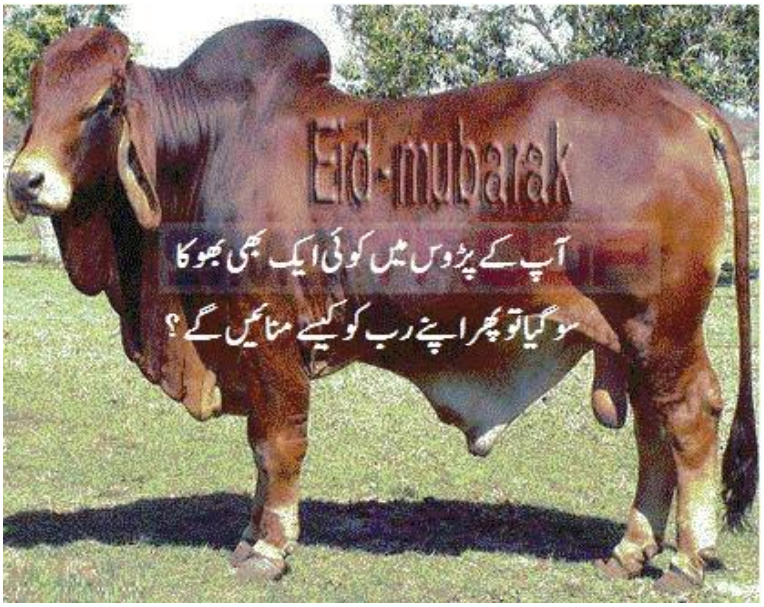

پڑے ٹرنک کے پیچھے چھپ گیا۔ محمد بشیر نے چھری پھینکی اور زہر پھانک کر نعشوں کے درمیان لیٹ گیا۔ صبح لوگ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو سہیل محمد بشیر اور خاندان کے دوسرے افراد کے سرہانے بیٹھا جیب میں مونگ پھلی چھپائے رو رہا تھا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے میں اور میرے سمیت اس ملک کے وہ تمام لوگ جنہوں نے یہ عید منائی، جنہوں نے عید کے دن اپنے بچوں کو نئے کپڑے پہنائے، جنہوں نے اپنے بچوں کو عیدی دی، جنہوں نے قربانی کے جانور ذبح کئے، جنہوں نے صرف اپنے ملنے والوں کے ہاں بڑے اہتمام کے ساتھ گوشت تقسیم کیا، جنہوں نے گوشت پکایا اور جنہوں نے یہ گوشت کھایا، وہ سب محمد بشیر اور اس کے بچوں کے قاتل ہیں۔ قتل کا یہ سلسلہ فیصل آباد کی ڈی ٹائپ کالونی سے شروع ہو کر اسلام آباد اور اسلام آباد سے پورے ملک تک پھیلتا ہے۔ ہم سب قدرت کی ایف آئی آر میں نامزد ہیں، ہم سب لوگ اللہ کی تفتیش کے دائرے میں آتے ہیں، ہم سب لوگ حضرت ابراہیم کے ملزم اور ان کے رب کے اشتہاری ہیں۔

خدا کی پناہ، محمد بشیر اس ملک میں بھوکا مر گیا جس ملک کے ایک شہر لاہور میں عید کے دن پندرہ لاکھ جانور ذبح کئے گئے تھے، محمد اسلم کے بچے عید کے دن اس ملک میں ذبح ہو گئے جس کے ایک شہر کراچی میں پچیس لاکھ جانوروں کی قربانی دی گئی۔ سنا ہے کہ کراچی کی ایک مویشی منڈی میں قربانی کے جانوروں کا میلہ حسن منایا گیا، میڈیا پر ان قیمتی جانوروں کی کیٹ واک کے مناظر بھی دکھائے گئے جہاں آٹھ لاکھ سے لیکر دس لاکھ تک کے بیل قربانی کیلئے لائے گئے۔ اسی کراچی میں جہاں چند دن پہلے ایک خود کش حملے نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا لیکن خدا کے خوف سے کوئی دل لرزتا نہیں۔ محمد بشیر کا بیٹا اس ملک میں نعشوں میں بیٹھ کر ہاتھوں میں مونگ پھلی اٹھائے روتا رہا، جس کے ایک شہر پشاور کے ایک بکرا فروش نے پانچ پانچ لاکھ کے پندرہ بکرے بیچے تھے جس میں تین تین لاکھ میں گائے اور اونٹ بکے تھے، جس میں لوگوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے امپورٹڈ بکرے خریدے تھے، جس میں لوگوں نے اس بار نیل گائے اور یاک قربان کئے تھے۔ اسی میڈیا پر لاہور کے ایک شوقین بڑے فخر سے اپنے پالتو بکرے کو قیمتی مربہ جات کے ساتھ بادام کھلا رہا تھا۔ اس بکرے کی خدمت کیلئے دو خصوصی ملازم رکھے ہوئے تھے جنہوں نے اس کو بچپن سے لیکر اب تک قیمتی خوراک کھلا کر جوان کیا تھا۔

خدا کی پناہ! اگر آپ صرف کراچی اور لاہور کے جانور جمع کریں، انہیں اوسطاً آٹھ ہزار روپے سے فی جانور ضرب دیں تو 32 / ارب پاکستانی روپے بنتے ہیں اور یہ پاکستان کے دفاعی بجٹ کے تیسرے حصے کے برابر ہے لیکن اتنی بڑی قربانی کے باوجود عید کے دن محمد بشیر اور اس کے بچے بھوکے رہے۔

ایک باپ اپنے بچوں کی گردن پر چھری پھیرنے پر مجبور ہو گیا۔ کاش اس ملک کے اہل خیر نے ایسی تنظیمیں بنائی ہوتیں جو قربانی کے نصف بکروں کے برابر رقم جمع کرتیں، جو لوگوں کو سمجھاتیں کہ آپ پانچ لاکھ کی بجائے پانچ ہزار کا بکرا خریدیں اور باقی چار لاکھ 95 ہزار روپے ہمیں دے دیں، جو لوگوں کو بتاتیں آپ ایک بکرے کی قربانی دیں اور ایک بکرے کی قیمت فنڈ میں جمع کروادیں، جن کے کارکن عید سے چند دن پہلے محمد بشیر جیسے لوگوں کے گھروں میں جاتے اور چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں تھوڑی سی رقم دیتے اور انہیں عید کے حوالے سے عید کا تحفہ کہہ کر آٹا گھی دال اور چاول پہنچاتے، ان کے بچوں کو نئے کپڑے، چوڑیاں اور مہندی دے آتے تو شائد محمد بشیر اور اس کے بچے بچ جاتے لیکن شائد اللہ کے نام پر بکروں کی گردنوں پر چھریاں پھیرنے والے اہل ایمان کو محمد بشیر جیسے بندے نظر نہیں آتے، شائد یہ لوگ لوگوں کی آنکھوں کی بھوک اور بچوں کی جلتی بجھتی حسرتیں نہیں دیکھ سکتے۔

نجانے کیوں میرے دل سے اک ہوک سی اٹھتی ہے اور اندر سے اک آواز سنائی دیتی ہے کہ اس سال جب اللہ تعالیٰ نے حساب مانگا ہو گا تو فرشتوں نے عرض کیا ہو گا کہ اے ابرہیم و اسمعیل اور سب جہانوں کے پروردگار! اس برس مملکت خداداد پاکستان میں قربانی تو صرف ڈیڑھ برس شہزاد اور چھ سال کی کوثر کی ہوئی ہے جہاں ایوان صدر کے یومیہ اخراجات 28 لاکھ روپے اور وزیر اعظم ہاؤس کے یومیہ اخراجات 22 لاکھ روپے ہیں!

بروز جمعتہ المبارک 13 ذوالحج 1431ھ 19 نومبر 2010ء

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

بھارت میں اس عید الاضحی کے موقع پر بھی گائے کی قربانی پر مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ ان کے گھروں کو نذر آتش کیا گیا۔ پاکستان کے وجود کا مقصد مسلمانوں کو مذہبی اور انسانی حقوق کی آزادی دلانا تھا، جس ملک میں ایک مسلمان کی جانور ذبح کرنے کی جرم کی سزا انسانی جان کا قتل ہو، اس ملک میں مسلمانوں کے حقوق اور مذہبی آزادی غیر محفوظ تصور کی جاتی تھی۔ پاکستان کے حصول کا مقصد عظیم تھا۔ قربانیاں عظیم تر تھیں۔ لیڈر بے مثال تھا لیکن اس ملک کو سنبھالنے اور چلانے والے بے ایمان اور بے وفا نکلے۔ ہر سال دسمبر کی پچیس تاریخ کو "بابائے قوم کا یوم پیدائش نہایت جوش و جذبے کے ساتھ منایا گیا" کارٹار ٹایا جملہ بولا جاتا ہے جبکہ اس قوم میں وہ جوش رہا اور نہ ہی جذبوں میں وہ حرارت باقی ہے۔

بنانے والے اپنی جانوں کا نذرانہ دیکر پاکستان بنا گئے۔ اپنے گھروں کو اجاڑ کر ایک آزاد ملک دئے گئے۔ اپنے گھر والوں کو لٹوا کر ایک پاک سرزمین دے گئے جبکہ اس نعمت کو پانے والوں نے اسے باپ دادا کی جاگیر سمجھا۔ اس ملک کو فار گرانٹڈ لیا۔ اپنا پیٹ، بنک اور گھر بھرنے والوں نے اس ملک کو غیروں کے ہاں گروی رکھ دیا ہے۔ شیخ سعدی کی ایک حکایت ہے کہ ایک بار شہر بغداد آگ کی لپیٹ میں آگیا، اس حادثے کے باعث ہر شخص سوگوار تھا لیکن ایک شخص اس بات پر خوش دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی دکان سلامت رہی۔ کسی نے اس کی حالت پر کہا "اے سنگدل شخص! آدھا شہر جل کر خاک ہو گیا مگر تجھے اپنی سلامتی کی خوشی ہے؟

پاکستان میں ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ بے یقینی کا ماحول ہے۔ خوف خدا کا تصور اب صرف انبیاء اور اولیاء کی تاریخ میں پڑھنے کو ملتا ہے، ملک جل رہا ہے، بے گناہ لوگ مر رہے ہیں، اس میدان جنگ میں بدر ہے نہ احد۔ کوئی شہید ہے نہ غازی۔ کوئی ہار ہے اور نہ جیتی ہوئی بازی ۔ قائد اعظم کی یوم پیدائش پر عام تعطیل اس قوم کے سونے کا ایک اور سنہرا موقع ہے۔ میں نے یہ جملہ ایک تقریب میں کہا تو مہمانان گرامی میں سے ایک صاحب علم بولے کہ جب تک یہ قوم سوئی رہتی ہے، اس ملک میں امن رہتا ہے۔ یہ قوم نہیں ایک فتنہ بن چکی ہے اور فتنے کا سویا رہنا ہی اچھا ہے۔ بیہوش طبقے کو دھماکوں کی آوازوں سے بھی ہوش نہیں آسکتا۔ آزادی کے نام پر معرض وجود میں آنیوالی اس اسلامی ریاست پاکستان نے اپنے پہلے 24 برس میں اپنے وجود کا ایک حصہ اپنا ایک بازو کٹوا دیا۔ ایٹم بم کی پیش بہا دولت ملی تو اسے بھی گنوانے کے درپے ہے۔

امن کی جنگ لڑنے والا امریکا اس ملک کے لہو میں زہر بن کر دوڑ رہا ہے۔ امن کے داعی کی دہشت گردی کا یہ عالم ہے کہ روسی انقلاب میں 19 لاکھ افراد لقمہ اجل بنے، 20 لاکھ انسانوں کو ہولناک سزائیں برداشت کرنا پڑیں اور تقریباً ۵۰ لاکھ انسانوں کو جلا وطن کیا گیا۔ روسی انقلاب سے قبل تاتار کے فتنے میں کم و بیش 10 لاکھ انسانی جانیں تلف ہوئیں ۔ نپولین کی لڑائیوں میں 17 لاکھ بندے ہلاک ہوئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں طرفین کے ایک کروڑ افراد ہلاک ہوئے جبکہ دو کروڑ کے قریب زخمی ولاپتہ ہوئے۔ روسی انقلاب کے بعد عالمگیر جنگ دوم میں پانچ کروڑ سے زائد انسان ہلاک اور زخمی ہوئے۔ امریکا کی دہشت گردی، ظلم و بربریت کی ایک طویل فہرست پر خود امریکیوں نے بے شمار کتابیں رقم کی ہیں۔

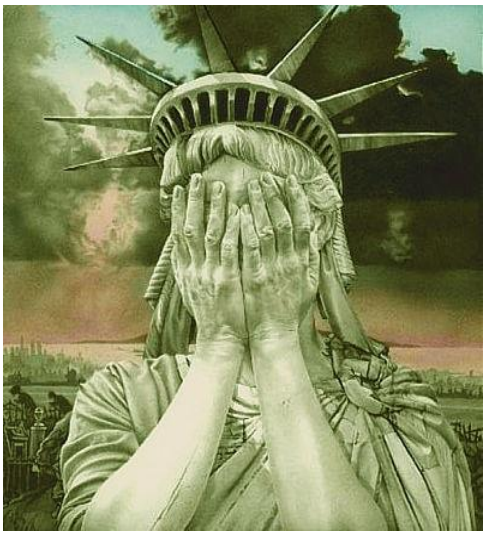

اس مختصر کالم میں کربناک تفصیل میں جانے سے اپنے زخموں کو بار بار کریدنا اچھا نہیں، بات کا مقصد بابائے قوم کی یتیم مملکت کی حالت زار بیان کرنا ہے۔ ایک امریکی تاریخ دن چارلس برڈ کا امریکا کی نفسیات کے بارے میں ایک مقولہ مشہور ہے کہ "دیرپا امن کے لئے دیرپا جنگ "ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مذکورہ مقولے کے پیش نظر امریکا دنیا بھر میں 1945ء سے تقریباً 200 سے زائد حملوں کا مرتکب ہوا ہے اور امن قائم کرنے کے لئے دنیا کو میدان جنگ بنا دیا لیکن امن پھر بھی قائم نہ کر سکا۔ امریکا کی جنگ امن کے لئے نہیں دنیا کا امن چھین کر دنیا پر اپنی دھونس جمانا اصل مقصد ہے۔ امن کے لئے طویل جنگ کی منصوبہ بندی کرنے والی سپر پاور نے پاکستان کو افغانستان اور عراق سمجھ رکھا ہے۔ بھارت میں گائے ذبح ہوتی ہے تو مسلمان مارے جاتے ہے۔ پاکستان میں عید ہوتی ہے تو مسلمان مارے جاتے ہیں۔ بھارت میں ہندو مار رہا ہے تو پاکستان میں مسلمانوں کے بھیس میں شیطان مار رہے ہیں۔

کس قدر شرمندگی ہے کس قدر رسوائی ہے
عید کے دن عید آکر بھی بہت پچھتائی ہے

پاکستان ایک ایسی بدنصیب ریاست ہے جس کے اپنے اس کے ساتھ مخلص نہیں۔ کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے، ہنستے، گاتے، بجاتے، کماتے اس ملک میں ہیں جبکہ گیت غیروں کے گاتے ہیں۔ حکومت اس ملک پر کرتے ہیں اور دولت غیروں کے بنکوں میں جمع کرتے ہیں۔ پاکستان کی معاشرتی تباہی کا سبب یہاں کے لوگوں میں حسد اور وی آئی پی کلچر کا سرطان ہے جبکہ اسی اقتصادی حالت کے ذمہ دار اس ملک کا سیاستدان اور بیوروکریٹ طبقہ ہے۔ اس ملک کے یہی حالات رہے تو پاکستان کے اقتصادی وسائل، اسباب اور ایٹمی طاقت کا مستقبل بھیانک دکھائی دے رہا ہے۔ مسلمانوں کی آزادی اور اسلام کے نام پر حاصل کے جانے والے پاکستان میں اس نبیؐ کی امت بستی ہے جس نبیؐ کے جلال و جمال کی رعنائیوں، آغوش، رحمت اور شمشیر کے آئینے میں آنسو جھلکتے تھے، لفظوں سے نگینے جڑے تھے، جس کی مٹھی میں سنگریزے بول اٹھتے تھے، جس کے قدموں کی چاپ پر تارے رقص کرتے تھے، جس کے ایک اشارے پر چاند شق اور قبلہ بدل جاتا تھا۔ اس حبیبؐ کی امت آج غیروں کے در کی بھکاری ہے؟ دور حاضر کے مسلمان بادشاہ اور حکمران کالی کملی اور سیاہ غلاف والے گھر کی غلامی کی بجائے قصر سفید (وائٹ ہاؤس) کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جبکہ بے سکون، بے بس اور مظلوم امت گنبد خضراء کے سائے تلے اور کبھی غلاف کعبہ تھامے گڑگڑا رہی ہے

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

بروز سوموار 16 ذوالحج 1431ھ 22 نومبر 2010ء

انہیں بھی یاد کرلیں

عید آئی اور آکر گزر بھی گئی۔ عید خوشی کا موقع ہے، اللہ کے انعام پر شکر ادا کرنے کا دن۔ لیکن جب میں اپنے وطن کے ان بے شمار لوگوں کو دیکھتا ہوں جن کے پاس عید کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانے کو ہے نہ ان اور ان کے بچوں کیلئے نئے تو کیا صاف ستھرے کپڑے بھی نہیں تو نجانے یہ شعر کیوں بے ساختہ میری زبان پر آجاتا ہے۔

ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بدلتے یہ لباس سوگواراں

اور ایسے لوگ بھی تو بے شمار ہیں جو اللہ کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں سے کچھ حصہ ان کو دے دیتے جو بے وسیلہ ہیں تا کہ ان کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آجائے، ان کی آنکھوں سے اداسی ایک دن کیلئے ہی سہی، مفقود ہو جاتی اور خوشیاں رقص کرنے لگتیں۔ مجھے مدینہ منورہ کا وہ یتیم بچہ بھی یاد آجاتا ہے جس کے سر پر رحمت العالمین رسول اکرم ﷺ نے ہاتھ رکھا تھا تو اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی تھی۔ کیا اس کے امتیوں کو رحمت العالمین رسول اکرم ﷺ کی یہ سنت یاد نہیں رہی؟ کیا قرآن کریم میں یہ نہیں کہا گیا کہ "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ) میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو"۔ اور پھر فرمایا "تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا"۔

یعنی نہ اپنے نفس کو اس کام پر آمادہ کرتا ہے، اور نہ اپنے گھر والوں سے کہتا ہے کہ مسکین کو کھانا دیا کریں، اور نہ لوگوں کو مسکین کی مدد پر اکساتا ہے ۔ سبحان اللہ! رب العزت نے یتیموں اور مسکینوں سے بد سلوکی کرنے اور کھانا نہ دینے یا دوسروں کو اس کیلئے آمادہ نہ کرنے کا تعلق "یوم دین" کو جھٹلانے سے جوڑا ہے۔ یعنی یتیموں اور مسکینوں کی مدد نہ کرنے والے وہ ہیں جو یوم آخرت اور جزا و سزا پر ایمان نہیں رکھتے اور ظاہر ہے انہیں مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔ تو گویا مسلمان ہونے اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ یتیموں کو گلے لگایا جائے، ان سے شفقت سے پیش آیا جائے اور یتیموں، ناداروں اور مسکینوں کو خود بھی کھانا کھلایا جائے اور دوسروں کو اس پر آمادہ کرنے کیلئے باقاعدہ مہم بھی چلائی جائے ۔ ان آیات مبارکہ کی روشنی میں آج اپنے اپنے کردار اور عمل کا جائزہ لیجئے۔ بیشک بنیادی ذمہ داری تو حکمرانوں کی ہے جو عوام سے ٹیکس اسی لئے وصول کرتے ہیں کہ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ بینکوں کے ذریعے سال پورا نہ ہونے اور نصاب کو نہ پہنچنے والی رقم پر بھی زکوٰۃ کاٹ لی جاتی ہے تا کہ ناداروں پر صرف کی جائے، لیکن پھر بھی ناداروں، غریبوں اور مسکینوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا مسلمانوں کے حکمران یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے، یا نظام زکوٰۃ صحیح طور پر نافذ نہیں کر سکے۔

اپنے اطراف میں نظر ڈالئے آپ کو کتنے ہی نادار، مسکین اور یتیم بچے کوڑے پر رزق تلاش کرتے نظر آجائیں گے۔ کل ٹیلیویژن پر دو معصوم سی بچیوں کو دکھایا جارہا تھا جو کچرے میں پھینکے گئے گلے سڑے اناروں سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کر رہی تھیں، ایسے بچے تو اب ہر جگہ اور ہر شہر میں آپ کو ملیں گے۔،، کیا تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو جزا و سزا کو جھٹلا رہے ہیں؟،، کیا ہم بھی تو ان میں شامل نہیں؟ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسلم معاشرے میں، ایک اسلامی ملک میں جگہ جگہ ننگے بھوکے لوگوں کی بھیڑ نظر آئے اور معاشرہ ان سے آنکھیں چرالے؟ فرمان الٰہی تو یہ ہے کہ مسلمان اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک وہ اپنی ایسی چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر دیں جو ان کو بہت عزیز و محبوب ہیں۔ ہم روزے رکھ کر، نماز پڑھ کر، حج اور عمرے کی ہر سال سعادت حاصل کر کے خود کو نیکوکاروں میں شمار تو کرتے ہیں، پڑوسی بھوکا ہو، محلے میں یتیم ، مسکین اور نادار بیوائیں بے سہارا ہوں اور ہم عمرے کیلئے دوڑے چلے جائیں جو فرض نہیں ہے۔

حج بھی زندگی میں صرف ایک بار مخصوص شرائط کے ساتھ فرض کیا گیا ہے، پھر بھی کتنے ہی لوگ فخریہ گنواتے ہیں کہ انہوں نے کتنے حج کر لئے ۔ گھر کے باہر نام کی تختی پر جلی حروف میں،، الحاج،، لکھوا رکھا ہے۔ ہر کسی سے،، حاجی صاحب،، سننے میں سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتائیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کیا، کتنے یتیموں، ناداروں اور مسکینوں کو سہارا دیا، اپنی کتنی محبوب اشیاء اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں، ایسا ہو تا تو آج کوڑے کے ڈھیر پر یہ بچے نظر نہ آتے جنہیں دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ انسان کے بچے ہیں یا پھر اسی کوڑے کرکٹ اور کچرے کا حصہ!

اللہ کا شکر ہے کہ کئی تنظیمیں ان حالات میں بھی یتیم، مسکین اور نادار بیوائوں کی نہ صرف خود مدد کر رہی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اکسا رہی ہیں۔ شاید اسی لئے زلزلے آآ کر پلٹ جاتے ہیں اور آسمان سے بارش بھی برس جاتی ہے کہ کھیتیاں سوکھنے نہ پائیں۔ لیکن ہر کوشش ناکافی ہے کہ غربت میں اضافے اور یتیموں، مسکینوں ناداروں کی تعداد بڑھانے کی منظم مہم اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ آگے بڑھئے آپ کو اپنے عزیزوں رشتہ داروں میں ایسے سفید پوش، نادار غریب تو مل ہی جائیں گے جو آپ کی توجہ اور مدد کے طالب ہیں لیکن اس وقت سیلاب سے متاثرین آپ کی توجہ اور محبت کے طالب ہیں اور ان کی مدد کرتے ہوئے ان کی عزت نفس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ جب میں نے باباجی سے عزت نفس کے خیال رکھنے کا بہترین طریقہ دریافت کیا تو حسب عادت مسکرائے کہ پگلے دنیا میں سب سے آسان کام بھی یہی ہے اور سب سے مشکل بھی۔

"آپ آسان زباں میں کیوں نہیں بتاتے، ایسے جواب سے تو الجھن بڑھتی ہے۔،، فرمانے لگے، مشکل اس لئے ہے کہ اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار کو دیتے ہوئے دل کے کسی گوشے میں برتری کا احساس ہر نیکی برباد کر دینے کا احتمال رہتا ہے لیکن اگر یہی کام اس طرح کیا جائے کہ اس عزیز یا رشتہ دار کو پتہ نہ چلے کہ یہ مدد آپ کر رہے ہیں، یہی کام اپنے کسی ایسے دوست کے ذریعے کریں جو ان کیلئے اجنبی ہو تو پھر دونوں اطراف میں خیر باقی رہتی ہے"۔

اس وقت حالات بہت ہی خراب ہیں، سیلاب نے تقریباً تین چوتھائی ملک کو متاثر کیا ہے۔ دو مہینے سے زائد گزر جانے کے باوجود اب تک متعدد متاثرین کو سر چھپانے کی جگہ فراہم نہیں کی جا سکی حالانکہ کئی ممالک کی مدد کے علاوہ مقامی طور پر پاکستان کے مخیر حضرات بھی ان امدادی کاموں میں دن رات شریک ہیں۔ بیرون ملک کام کرنے والے پاکستانی بھی اپنے بھائیوں کی دل کھول کر مدد کر رہے ہیں۔ چند دنوں سے حکومت پاکستان کے بڑے بڑے دعوے بھی شامل ہو گئے ہیں لیکن اس سے بھی بڑا بے یقینی کا سیلاب کچھ عرصے سے قبائلی علاقوں میں برپا ہے۔ سنا ہے کہ قبائلی علاقوں سے اجاڑے جانے والوں کے قافلوں کے قافلے افغانستان میں ہجرت کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں، ایسے بھی ہیں جو صرف اپنے بدن پر موجود کپڑوں میں گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان جبری مہاجرین میں عورتوں اور بچوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ یہ وہ مہاجرین ہیں جنہیں انصار مدینہ کا سہارا بھی حاصل نہیں، خیموں میں پڑی ہماری ماؤں، بہنوں، بچوں، بوڑھوں اور ضعیف العمر لوگوں نے عید کیسے گزاری، اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

تنگ گلیوں اور سسکتی خیمہ بستیوں میں زندگی کے روز و شب سے لڑتے ہوئے، مرتے اور جیتے ہوئے ان لوگوں کو بھی دیکھیں، انہیں بھی کچھ ضرورت ہے کہ ان کا سب کچھ لٹ چکا ہے، ہم اپنی زیست کے پیہم مسرت خیز لمحوں سے ایک ساعت ہی سہی، کچھ بھیک ہی دے دیں، انہیں صرف یاد ہی کر لیں۔ کیا عید کے موقع پر سیلاب کے ہاتھوں یا اپنی زمینیں اور دیگر املاک بچانے کیلئے سیلاب کا رخ موڑ کر اپنوں ہی کے ہاتھوں اجاڑے جانے والوں، یتیم بنائے جانے والوں بچوں کیلئے بھی ہمارے پاس کچھ ہے؟ یاد اپنی جگہ لیکن یاد کر لینے سے نہ پیٹ بھرتا نہ تن ڈھکتا ہے اور نہ ہی ہم نیکی کو پہنچ سکتے ہیں کہ ہم نے تو اپنی محبوب اور عزیز چیزوں، مال و متاع کو اپنی بغل میں داب رکھا ہے کہ کہیں خرچ نہ ہو جائے۔ عجیب بات ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے اور اللہ ہم سے مانگتا ہے، اپنے لئے نہیں، ہمارے ہی بہن بھائیوں کیلئے، تب بھی ہمارے ہاتھ ہماری گردنوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھا اس شخص کو جو روز جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا پیٹ نہیں بھرتا۔ دیکھئے یہ ہم خود تو نہیں؟

بروز جمعرات 19 ذوالحج 1431ھ 25 نومبر 2010ء

کہیں دیر نہ ہو جائے؟

اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے! بھیانک تضادات سے بھری پڑی ہے ہماری زندگی۔ آپ ناراض نہ ہوں، میں بھی تو آپ ہی میں سے ہوں ۔ بہت پہلے مجھے ایک دانا نے کہا تھا: تسلیم کرنا سیکھو۔ بحث کرتے کرتے میں نڈھال ہو گیا لیکن پھر ماننا ہی پڑا۔ بالکل ٹھیک ہے یہ بات کہ تسلیم کیا جائے اپنی ہر کوتاہی کو، ہر غلطی کو۔ اگر انسان کی دل آزاری کی ہے تو اس سے معافی طلب کرو، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو رب سے۔ ہاں ندامت دھوتی ہے گناہو ں کو۔ اس سے رجوع کرنا ہی بندگی ہے۔ اپنی نہیں، رب کی ماننے میں ہی عافیت ہے، سکون ہے، قرار ہے۔ اپنی دانش وری کو کچھ دیر کے لئے ہم کیوں ترک نہیں کرتے!

ہماری عجیب سی عادت ہے، ہر وقت تبصرہ کرنا۔ مجھے معلوم ہو نہ ہو، میں دانش وری ضرور بگھارتا ہوں۔ سیدھی سی بات سے ہر انسان کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ انسان سب کچھ جان سکے! میری انا کو کتنی ٹھیس پہنچتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ میں نہیں جانتا، لیکن میں تسلیم نہیں کرتا ۔ کوئی بھی بات ہو میدان میں اتر آتا ہوں اور اپنی بلند کے زور پر دوسروں کو چت کر ڈالتا ہوں۔ اور پھر اس پر اتراتا پھرتا ہوں۔

جب میرا کوئی دوست، عزیز بیمار ہو جائے تو میں سر توڑ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ماہر اس کا علاج کر دے۔ مجھے گوارا ہی نہیں کہ اُسے کسی ایرے غیرے کے سپرد کر دوں۔ جب میں دوا لیتا ہوں تو اس پر دوا کی میعاد ضرور دیکھتا ہوں۔ میں اپنے بچوں کے لئے معیاری درس گاہ دیکھنے میں اپنی صلاحیت اور وسائل کھپا دیتا ہوں۔ میں اپنے کپڑوں کی سلائی کے لئے بہترین درزی کا انتخاب کرتا ہوں۔ اپنے بالوں کی نگہداشت کے لئے اچھے شیمپوز کی تلاش میں ہلکان رہتا ہوں۔ مکان بنوانا ہو تو میں ایک ماہر نقشہ نویس کو ڈھونڈتا ہوں اور اعلیٰ معمار کی خوشامد کرتا ہوں۔ اسے زیب و زینت دینے کیلئے ماہرین آرائش و زیباش کے در پر پہنچ جاتا ہوں۔ بس میں اعلیٰ معیار اور بہترین ہنر مند سے ہی رجوع کرتا ہوں اور اپنی پوری زندگی اس میں صرف کر ڈالتا ہوں۔ ایسا ہی ہے ناں!!

یہ سب تو خارجی چیزیں ہیں جن کے لئے ہلکان ہوں۔ اور وہ جو میرا باطن ہے، اول تو میں اس پر دھیان ہی نہیں دیتا، اور اگر کبھی دینا پڑ جائے تو ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں۔ عجیب تضاد ہے ناں یہ... جو اصل ہے اس پر میری نگاہ ہی نہیں جاتی اور جو رہ جانے والا ہے اس پر میں جان لڑا دیتا ہوں۔

اسلام تو نام ہی سلامتی کا ہے، امن کا ہے، آشتی کا ہے، بھائی چارے کا ہے، قربانی و ایثار کا ہے، تسلیم کا ہے، رضا کا ہے، رحمت کا ہے، اسلام دینِ فطرت کا نام ہے۔ رحمت اللعالمین ﷺ کی زندگی ہی روشنی ہے۔ آپ ﷺ کا اسوہ ہی راہ نجات ہے۔ میرے آقا و مولا ﷺ نے تو اپنے جانی دشمنوں کو معاف کر دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر اپنے دشمنوں کے گھروں کو بھی جائے پناہ بنایا۔ اسلام تو وہ دین ہے جس نے جنگوں کے بھی اصول بتائے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ فصلوں اور درختوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، دوسرے مذاہب کے دینی رہنماؤں سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ جو تم سے نہ لڑے اُسے امان دی جائے گی۔ بس انہی کا مقابلہ کیا جائے گا جو دوبدو مقابلے پر آجائیں۔

مجھے تو بچپن میں یہی بتایا گیا تھا،، اب نجانے کیا کیا سننا رہتا ہوں جس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں وہ اسلام کا سپاہی بنا گھومتا ہے۔ کوتوال بنا دندنا تا پھر رہا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے کسی نے کہا تھا،، ہر انسان کو اپنے حصے کے بیوقوف اور احمق مل جاتے ہیں۔ طرح طرح کی تشریحات اور قسم قسم کی تفسیریں۔ ہر ایک اسلام کا شارح بنا پھر رہا ہے۔ ہم عطائی ڈاکٹروں سے بچتے ہیں اور خود ساختہ، جعلی اور انا پرستوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ جہاں دین کا مسئلہ ہو تب میں کسی ماہر کو کیوں نہیں تلاش کرتا؟ اقبالیات خواجہ میں ہے کہ اقبال سے کسی نے پوچھا: ،،،، سب سے مظلوم کون ہے؟،،، تو بابے نے کہا: ،،،، قرآنِ عظیم سب سے زیادہ مظلوم ہے،،،،۔ وہ حیرت سے بولا:،،،، جناب وہ کیسے؟،،،، تو اقبال بولے: ،،،، جنہیں عربی کی قواعد تک نہیں آتی وہ قرآنِ عظیم کی تشریح کرتے پھر رہے ہیں۔،،،، ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔ آپ تو میری تلخی سے درگزر کرتے رہتے ہیں،، آپ کی اسی محبت نے مجھے بے ساختگی سے اپنی بات کہنے کو حوصلہ بخشا ہے۔

ایک بار پھر تین مذاکرات کاروں کو مسئلہ کشمیر کے الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانے کا کام دیا گیا ہے۔ ایسی ہی لاحاصل کوشش بیس سال پہلے بھی کی گئی تھی لیکن معاملہ وہی پر اٹکا ہوا ہے۔ ہم اس بات کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ ہم نے کبھی بھی اخلاص کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ طاقت کے بل بوتے پر پچھلے تریسٹھ سالوں سے پانچ لاکھ سے زائد مسلح سیکورٹی فورسز کو خصوصی قوانین کے تحت ظلم و جبر کی اجازت دیکر اپنا غلام بنانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ ماورائے عدالت ایک لاکھ سے زائد نہتے کشمیریوں کو صفحہ ہستی سے مٹا کر بھی ان کے جائز حق خودارادیت کے مطالبے کو دبانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ آج تک کشمیر میں ہزاروں بے روزگاروں کو روزگار کا لالچ اور کبھی کشمیر میں ترقیاتی کاموں کا جھانسہ دیکر فریب دینے کی کوشش بھی دل جیتنے میں کارگر ثابت نہیں ہو سکی۔

اب اس بات پر بغلیں بجائی جا رہی ہیں کہ اقوام متحدہ نے اس سال کشمیر کو اپنے ایجنڈے میں جگہ نہیں دی ۔ ساری دنیا اس بات سے واقف ہے کہ اقوام متحدہ اب چند طاقتوں کی ایک لونڈی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جو ان طاقتوں کی مرضی و منشاء کے مطابق فیصلے صادر کرتی ہے۔ ساری دنیا میں عراق میں فوج کشی کے خلاف مظاہرے ہوئے بلکہ خود اقوام متحدہ بھی اس فیصلے کے خلاف تھی،، لیکن ہوا کیا؟ طاغوتی طاقتوں نے ایک ہنستے بستے ملک کو آن کی آن میں ایسا تاراج کر دیا کہ اب اس کی تعمیر میں صدیاں درکار ہیں لیکن پھر بھی فتح کی بجائے ذلت و رسوائی حصے میں آئی۔ عراقیوں نے بھی طاقت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور اب قصر سفید کا فرعون بمعہ اپنے تمام ساتھیوں کے اپنا بوریا بستر باندھ کر رخصت ہونے کی تیاری میں مصروف ہے۔ فلسطینی نوجوان بچوں نے پتھروں کے ساتھ اسرائیلی ٹینکوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا اور اب تمام مغربی اقوام کی بھرپور حمائت بھی اسے حزب اللہ کے ہاتھوں رسوائی سے نہ بچا سکی۔

ایسی ہی حماقت روس نے افغانستان میں کی،، وہ افغانیوں کو تو زیر نہ کر سکا لیکن خود اپنی عظیم ریاست کے کئی ٹکڑے کروا کر اپنے زخموں کو سہلا رہا ہے۔ حیرت ہے کہ امریکا کو نو سال کے بعد بارہ کھرب ڈالر آگ میں جھونک دینے اور اپنے ہزاروں فوجی مروانے کے بعد سمجھ آئی ہے اور اب وہ اپنی جان چھڑانے کیلئے دن رات کوشاں ہے۔

لیکن ان تمام انسانی المیوں کے باوجود دلی سرکار تاریخ سے کوئی سبق حاصل کرنے کو تیار نہیں۔ بیس سالوں کے بعد ایک دفعہ پھر متعصب ذہنیت ،، جارحانہ قومی انا کی پرورش کی خاطر ظلم و ستم اور قتل و غارت کے سلسلے کو دراز کرنے کی کوششوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ آج تک کشمیر میں حقیقی جمہوری قدروں،، سیاسی و عوامی تائید کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ کبھی آٹھ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا جاتا ہے اور کبھی مذاکرات کا جھانسہ دیکر کشمیریوں کی تحریک کو سرد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب بھارت کے اپنے دانشور دلی سرکار کی ان پالیسیوں کی مخالفت کرتے ہوئے ہوش کے ناخن لینے کا مشورہ دیتے ہیں تو اسی جمہوری ملک میں ان کے خلاف غداری کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیکر ان کو خاموش اور خوفزدہ کرنے کی مہم جاری کر دی جاتی ہے۔ آج بھی کشمیر میں دلی سرکار کے گماشتے روایتی فوجی بے رحمی کو روکنے میں ناکام ہو چکے ہیں اور خود بی جے پی کے رہنما کشمیر میں بھارت کے سالانہ نو سو چالیس ارب روپے کے اخراجات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اسے ایک بوجھ قرار دے چکے ہیں لیکن دلی سرکار ابھی تک اس بے پناہ فوجی اخراجات کے علاوہ دنیا بھر میں دن بدن عالمی خجالت کا شکار ہو رہا ہے اور اس عالمی خجالت کو رفع کرنے کیلئے کروڑوں ڈالر جھونک رہا ہے۔

دلی سرکار اگر اخلاص کے ساتھ چاہتی ہے کہ اس خونی مسئلے کا حل ہو اور یہ خطہ مستقبل میں کسی ایٹمی تصادم سے محفوظ ہو جائے تو اسے کشمیری رہنما سید علی گیلانی کا ہاتھ تھامنے میں کسی تاخیر سے گریز کرنا چاہئے۔ دنیا کے تمام مسائل بالآخر ایک میز پر بیٹھ کر ہی حل ہوئے ہیں۔ اگر دلی سرکار نے اب بھی حیلوں بہانوں سے وقت حاصل کر کے کشمیریوں کو فریب دینے کی کوشش جاری رکھی تو مجھے شدید خدشہ ہے کہ کشمیری لیڈر یٰسین ملک کی وہ پیش گوئی ضرور پوری ہو گی کہ کشمیری آخری حربے کے طور پر فدائی حملوں کا راستہ اختیار کر لیں گے جس کا تدارک آج تک دنیا کی کسی طاقتور حکومت کے پاس بھی نہیں!

آج انسان کا چہرہ تو ہے سورج کی طرح
روح میں گھور اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

بروز اتوار 22 ذوالحج 1431ھ 28 نومبر 2010ء

فرق سمجھ کا نہیں سمجھنے کا ہے

انسان کی تخلیق بے شک خداوند قدوس کا ایک بہت عظیم کارنامہ ہے پھر اس تخلیق کو خالق نے اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی عظمت کا معیار بھی مقرر کر دیا، ساتھ ہی زمین آسمان، سورج، پانی ہوا بلکہ ساری کائنات کی تخلیق کر کے انسانی زندگی کے تسلسل کا سامان ہی پیدا کر دیا بلکہ یہ حکم بھی صادر فرما دیا کہ کسی ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کا قتل سمجھا جائیگا۔ ان واضح احکامات کے باوجود بہت سے فرعونوں، ظالم بادشاہوں، فوجی اور سیاسی آمروں نے انسانیت کا بے دریغ قتل کر کے اپنے ہاتھ انسانی خون سے رنگے۔ پہلی جنگ عظیم میں انسانوں کا قتل، دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے ہاتھوں انسانی جانوں کا ضیاع، جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکا کا ایٹمی حملہ جس میں نہتے لوگوں کی ہڈیاں بھی راکھ بن گئیں ویت نام، کوریا، بوسنیا، ایران عراق، فلسطین، عرب اسرائیل اور گلف کی لڑائیوں میں بے پناہ لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ حالیہ دور میں عراق اور افغانستان میں جو ہو رہا ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور صرف پچھلی دو دہائیوں میں ایک لاکھ سے زائد بے گناہ کشمیریوں کو محض اس لئے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا کہ وہ انسانیت کے نام پر اپنے ان بنیادی حقوق (حق خود ارادیت) کا مطالبہ کر رہے تھے جس کا اقوام عالم کے ایک معتبر ادارے اقوام متحدہ میں دلی سرکار نے ان سے وعدہ کیا تھا لیکن ظلم و ستم کا دور اور کربناک آزمائش اب بھی جاری و ساری ہے۔

مشہور زمانہ امریکی مصنف،، باب ووڈورڈز،، کی کتاب،، اوبامہ کی جنگیں،، کے تہلکہ خیز انکشافات نے قصر سفید اور اہم امریکی اداروں کی غلام گردشوں میں پلنے والے خوفناک رازوں سے پردہ اٹھایا ہے جس میں ایک انکشاف یہ بھی ہے کہ کس طرح قصر سفید کے فرعون جارج بش اور امریکی جنگی عزائم رکھنے والے اداروں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنے کے پروگرام مرتب کئے اور اب اس کی تصدیق وکی لیکس سے بھی ہو گئی ہے جس کو امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نہ صرف امریکا بلکہ بین الاقوامی برادری پر حملہ قرار دے رہی ہیں۔

ان دستاویزات میں کئی ہوشربا انکشافات کئے گئے ہیں جس میں امریکی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اس نے گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو اپنی تحویل میں لینے کیلئے کمانڈو ایکشن کے آپشن پر غور کیا تھا۔ یہ غور کرنے کی وجہ لال مسجد کا وہ بحران بھی تھا جس کیلئے فاسق کمانڈو مشرف نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے مدرسے کے تمام بچوں اور بچیوں کو فاسفورس بموں کے ساتھ بھسم کر دیا تھا۔ کیونکہ امریکیوں کو یہ خوف دامن گیر ہو گیا تھا کہ کہیں لال مسجد کے انقلابی کہوٹہ کی طرف مارچ کرتے ہوئے ایٹم بم پر قبضہ نہ کر لیں۔ کیا عجب کہ لال مسجد کے دو ڈھائی سو طلبہ و طالبات نصف درجن کلاشنکوف، رائفلوں اور بانس کے ڈیڑھ دو سو ڈنڈوں کے ذریعے اسلام آباد سے نکل کر کہوٹہ پر قبضہ کر لیتے اور درمیان میں انہیں کوئی روک ٹوک بھی نہ ہوتی۔ کہوٹہ پر قبضہ کرنے کے بعد عبدالرشید غازی ڈنڈے کے ساتھ ایٹمی وار ہیڈ باندھ کر شمال اور جنوب کی طرف پھینکتے چلے جاتے، ادھر ممبئی اور کلکتہ تک تباہی ہو جاتی اور دوسری جانب بگرام ایئر بیس اور کابل ہدف ہوتے اور پھر بانس کے ڈنڈے پر بندھا ہوا کوئی ایٹمی وار ہیڈ بحرۂ عرب عبور کر کے تل ابیب تک جا پہنچتا۔

لال مسجد کے بحران پر آبپارہ مارکیٹ میں،، رشید المعروف چھیدے،، موچی سے بھی اس مفروضے پر بات کی جائے تو وہ بھی اسے ایک لطیفہ سمجھ کر ہنسی میں اڑادے گا کیونکہ چھیدے موچی نے نہ صرف لال مسجد کی طرف آنے جانے والے ہر شخص کو بغور اور بے ساختہ دیکھا ہے بلکہ مدرسے کے بچے اور بچیاں اکثر پھٹی پرانی چپلیں اور جوتے بھی اسی سے سلائی اور مرمت کرواتے تھے۔ وہ لال مسجد کی انتظامیہ اور طلبہ کی صلاحیتوں سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور خود اپنے معاشرے اور سماج کا رمز آشنا بھی، کہ جو دن بھر ایسے سینکڑوں پاکستانیوں سے ملتا ہے جو اپنی جوتی کی سلائی کراتے ہوئے وقت گزارنے کیلئے چھیدے موچی کے سامنے مہنگائی کا رونا روتے ہیں، بڑھتی ہوئی مہنگائی کو معاشرے کیلئے عذاب قرار دیتے ہیں۔ حکمرانوں کو مہنگائی کا تدارک نہ کرنے پر بے نقط سناتے ہیں اور تھوڑی دیر میں جوتی تیار ہوتی ہے تو اسے پہن کر مارکیٹ میں گم ہو جاتے ہیں۔ قریب سے مہنگائی کے خلاف گزرنے والے جلوس سے نظریں بچا کر گزر جاتے ہیں لیکن جس بات کو راجہ بازار اور آبپارہ کا ایک عام محنت کش سمجھتا ہے وہ امریکا کے اہل دانش و بینا کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟

لال مسجد بحران کو جسے ہر دوسرا آدمی ایک مصنوعی بحران سمجھ رہا تھا، امریکی اس کو بنیاد بنا کر اس آڑ میں کہوٹہ میں کمانڈو ایکشن کا فیصلہ کر رہے تھے۔ امریکیوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ پاکستانی سیاسی مزاج کے اعتبار سے ایک قدامت پرست اور روایت پرست سماج ہے جو اوّل تو مختلف سیاسی رجحانات رکھنے والے یونٹس پر مشتمل وفاق ہے اور ان یونٹس کے اندر بھی جاگیر دار، قبائلی سردار اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور راجواڑے قائم کئے ہوئے ہیں جنہوں نے ریاستی ڈھانچے کے ساتھ بقائے باہمی کے معاہدات کر رکھے ہیں۔ کراچی اور لاہور جیسے چند شہر جاگیر دارانہ اثرات سے باہر تھے لیکن کراچی جیسے بڑے شہر کا انقلابی، سیاسی مزاج ایم کیو ایم کے بعد جاگیر دارانہ ہو گیا ہے۔ یوں بھی پاکستان کی رائے عامہ کی اکثریت دیہاتوں میں آباد ہے جہاں لوگ اپنے سردار یا چوہدری کے ساتھ تاحیات وفاداری کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ ایسے معاشروں میں سب کی بقاء،، اسٹیٹس کو،، میں ہوتی ہے۔ سب کی ترجیح اسی میں ہوتی ہے کہ سسٹم کا پہیہ رواں دواں رہے۔ اس ہیئت ترکیبی کے حامل معاشروں میں لوگ زلزلے کی ہنگامی حالت میں ریفلکس ایکشن کے طور پر گھروں سے باہر نکل تو سکتے ہیں لیکن وہ کسی انقلابی اور ہمہ گیر تبدیلی کیلئے ساتھ نہیں چلتے۔ مہنگائی اس معاشرے کیلئے ایک نئے جاگیر دار اور سردار کے روپ میں سامنے آئی ہے۔ عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ غم روزگار کو دل سے لگائے بیٹھا ہے۔ اسے سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے غرض نہیں کیونکہ اس کا مسئلہ آٹا، دال چینی ہے۔ ایسی سوسائٹی میں امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ سوات یا وزیرستان سے پاکستان کا کوئی ملا عمر گھوڑوں اور گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ سیاہ پرچم لئے اسلام آباد کی طرف مارچ کرتا چلا جائے گا اور راستے میں لوگ جابجا پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے اس قافلے میں شامل ہو جائیں گے اور اک روز یہ کارواں کہوٹہ میں جا کر مورچہ زن ہو جائے گا اور یوں خطے میں ایک خوفناک تباہی کا آغاز ہو جائے گا۔ وائٹ ہاؤس، پینٹاگون اور سی آئی اے پاکستان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، وفاقی اور انتظامی ڈھانچے کی روشنی میں یہاں کے حالات کا تجزیہ کرنے کی بجائے امریکن "ہالی ووڈ " کے فلمی اور افسانوی انداز میں پاکستان کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امریکی سیدھے اور آسان انداز سے معاملے

کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ان کے خیال میں فلسطین کے مسئلے کی وجہ سے مسلمان ایک مدت سے صدمے اور رد عمل کی کیفیت میں ہیں اور اس انسانی کیفیت کے ساتھ مہلک ہتھیاروں کا ہاتھ میں ہونا دنیا کیلئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ جس طرح یہودیت اور صہیونیت ایک نظریاتی اور عالمگیر تحریک ہے، امریکیوں کے خیال میں اس کے رد عمل میں مسلمان بھی ایک اور ہمہ گیر تحریک ہیں۔ اس لئے عراق کا ایٹم بم عریبک بم، ایران کا بم پرشین بم، لیبیا کا ایٹم بم افریقن بم اور پاکستان کا ایٹم بم اردو بم نہیں ہوتا بلکہ ان کے نزدیک یہ سب اسلامی بم ہیں۔ بھارت کا ایٹم بم ہندو بم نہیں ، امریکا اور مغرب کے ایٹم بم قطعاً عیسائی بم نہیں کہ یہ بم انسانیت کی تباہی کیلئے نہیں بلکہ پھولوں کی بارش برسانے کا کام آتے ہیں!

اسی خوف نے 1981ء میں عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی کا سامان کیا تھا۔ یہی خوف اس کے چند برس بعد سے ہی پاکستان کے ایٹم بم کے تعاقب میں ہے۔ یہی خوف کرنل قذافی کے خیمے تک جا پہنچا تھا۔ یہی خوف ایران کے گلے کا پھندہ بنانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ نائن الیون کے بعد تو یہ خوف اور بھی بڑھ گیا ہے اور یہ طے کر لیا گیا ہے کہ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک کی ساری پٹی ایٹم بم کیلئے موزوں اور مناسب نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ساری پٹی مسلمان آبادی پر مشتمل ہے۔ پاکستان پر عدم استحکام، بے چینی اور شورش کا عذاب بھی اسی لئے نازل ہو رہا ہے کہ اسے ایٹم بم کے حوالے سے غیر ذمہ دار، نااہل اور ناکام ثابت کرنا اور اس کی سرزمین کو ایٹم بم کیلئے ناموافق اور غیر موزوں ثابت کرنا مقصود ہے۔ اسی لئے چھید اموچی جس بات کو آسانی سے سمجھ رہا ہے، قصر سفید، پینٹاگون اور سی آئی اے مکیں اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ راولپنڈی خوف کے جن سایوں سے آزاد ہے وہ سائے ہزاروں میل دور واشنگٹن کی گلیوں میں لہراتے اور دندناتے پھر رہے ہیں اور ایک خاص منصوبے اور پالیسی کے تحت لندن، پیرس اور فرینکفرٹ کو اپنا ساتھی اور خوفزدہ بنائے رکھنے کیلئے ان سایوں کا احساس دلانا بہت ضروری ہے۔

چھیدے اور ہلری کلنٹن کا یہ فرق سمجھ کا نہیں سمجھنے کا ہے۔ ہلری چھیدے سے بہت سمجھدار ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ مسئلے کو سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔

یہ جو ہم نے غیروں سے کچھ رنگ لئے کچھ روپ لئے
اچھے خاصے چہروں کا سب رنگ گیا بہروپ بھرے
عالم عالم لرزاں تھا جن شاہینوں کی دہشت سے
ان کی بربادی کی خاطر زاغ و زغن سب ایک ہوئے

بروز منگل 24 ذوالحج 1431ھ 30 نومبر 2010ء

کڑی آزمائش

روس کی شکست وریخت اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کے ناتے خود کو پوری دنیا کا حاکم سمجھ بیٹھا۔ اس نے کئی ایسے قدم اٹھائے جو اس کی خوش فہمی اور حد درجہ غرور کا پتہ دیتے تھے۔ دیگر چھوٹے چھوٹے تنازعات کے علاوہ افغانستان اور پھر عراق پر حملہ ایک ایسی ہی خوش فہمی کا نتیجہ تھے جن کے دور رس اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہے اور امریکا اب پچھتا رہا ہے۔ حالات کہہ رہے ہیں کہ شکست اس کا مقدر بن چکی ہے۔ امریکا کے ایک سابق کمانڈر جو عراق میں امریکی فوج کی کمان بھی کرتے رہے ہیں، کا کہنا ہے کہ عراق اور افغانستان میں امریکی فوج اس وقت صرف شکست ٹالنے میں مصروف ہے۔ یہ بیان کسی مسلمان صحافی یا غیر جانبدار تجزیہ نگار کسی دوسرے ملک کے باشندے یا صحافی کا نہیں بلکہ ایک امریکی کا ہے، امریکی بھی ایک فوجی کمانڈر جس نے خود عراقی جنگ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، عراقی مزاحمت کاروں کے جذبات، وہاں کے عوام کی امریکا سے نفرت اور امریکی فوج اور اس کے ٹوٹتے ہوئے حوصلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مجاہدین کے خلاف کارروائی میں خود شرکت کی اور خود ملوث ہو کر ہر زاویے سے اس جنگ کو دیکھا۔ ایسے آدمی کے تجزیے کو جھٹلانا اس پر شک کرنا یقیناً مشکل ہے۔

دوسری طرف افغانستان میں طالبان کی کارروائیاں روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ طالبان کی حالیہ کارروائیوں میں افغان و اتحادی فوجوں کے نقصان کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ طالبان عراقی مجاہدین کی طرح اب کامیابی کے ساتھ جدید ٹیکنالوجی کا بھی استعمال کر رہے ہیں۔ وہ اپنی کارروائیوں کی ویڈیو فلمیں بھی بنا رہے ہیں۔ ان کی نئی آنے والی ویڈیو فلموں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کے طول و عرض میں بے خوفی اور آزادی کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ وہ جہاں چاہتے ہیں کارروائیاں کرتے ہیں۔ کئی صوبے ایسے ہیں جہاں عملاً ان کی حکومت ہے، بہت سے اضلاع پر وقتی قبضہ کر کے انہوں نے اس بات کا ثبوت بھی مہیا کر دیا، لیکن وہ صرف اس وجہ سے منظر عام پر نہیں آ رہے ہیں کہ شہروں میں اتحادی افواج ہوائی جہازوں اور بموں کا بے تحاشا استعمال کریں گی جس کی وجہ سے نہتے عوام شہید ہو جائیں گے۔

ایک حالیہ مستند رپورٹ کے مطابق جنوری سے اکتوبر 2010ء تک ۱ دو ہزار سے زائد افغان فوجی طالبان سے جا ملے ہیں۔ جنگ میں کسی ایک فریق کے ارکان دوسرے فریق سے اُس وقت ملتے ہیں جب انہیں اپنے فریق کی شکست کے آثار واضح طور پر نظر آ جائیں اور فریق ثانی کی دہشت اور دھاک ان پر بیٹھ جائے۔ اندھا دھند کارروائیوں اور بمباری سے افغان عوام میں غیر ملکی افواج سے نفرت میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ افغانستان بھر میں پانی کی طرح بہایا جانے والا پیسہ بھی امریکا کے کام نہیں آ سکا ہے۔

عراق و افغان جنگ امریکا کی دو بڑی حماقتیں تھیں ۔ امریکا کی ان دو تاریخی غلطیوں کے پیچھے یہ تصور کار فرما تھا کہ روس کے بعد اب دنیا میں ہمیں شکست دینے والا کوئی نہیں رہا۔ امریکا یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ ہر طالع آزما کو بالآخر شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ تاریخ کا علم تو لوگ حاصل کرتے ہیں لیکن اس سے سبق کوئی نہیں سیکھتا۔ امریکا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔

عراق پر امریکی حملے کے پیچھے صہیونی لابی کار فرما تھی اور امریکا نفع ونقصان کی پرواکئے بغیر حملہ کر بیٹھا۔ امریکا میں صہیونی لابی کی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی کسی بھی چاہت کے آگے نفع ونقصان کی پرواہ کئے بغیر امریکی حکومتیں اپنا سر تسلیم خم کر دیتی ہیں، لیکن امریکا افغانستان پر حملہ کرنے کی غلطی اس لئے کر بیٹھا کہ اس پر نائن الیون کے حملے کے وقت ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اُس وقت روس اور چین کا خاموش اور کسی حد تک مثبت کردار امریکا کے لئے تقویت کا باعث بنا۔ معلوم نہیں یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا یا امریکا کی ناپسندیدہ پالیسیوں کا ردعمل کہ دونوں ممالک اب دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکا کے ساتھ نہیں رہے۔ بلکہ حالات وواقعات بتارہے ہیں کہ ایک اور سرد جنگ چھڑ چکی ہے جس میں چین اور روس شانہ بشانہ ہو کر امریکا کو عبرت ناک شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں۔ اکتوبر 2007ء میں یہ خبر منظر عام پر آئی کہ تائیوان نے امریکا کی مدد سے کروز میزائل تیار کر لیا ہے جو چین کی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگلے روز ہی امریکی ترجمان کا یہ بیان بھی سامنے آیا کہ ایرانی سرحد سے متصل افغانستان کے علاقے میں طالبان سے ایک طویل جھڑپ کے بعد اتحادی افواج کو ایرانی سرحد سے متصل افغانستان کے علاقے میں طالبان سے ایک طویل جھڑپ کے بعد اتحادی افواج کو ایرانی اور چینی ساختہ ہتھیار ملے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چین اب افغانستان میں کود چکا ہے اور امریکی چیرہ دستیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ٹھان چکا ہے۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ اب خاموش رہ کر پس منظر میں بیٹھنے کا وقت گزر چکا ہے۔ یہ ایک سنہری موقع ہے کہ امریکا خود شکست کھانے کے لئے اس کے پڑوس ہی میں چل کر آیا ہے۔ امریکا چین کو مسلسل دبانے کی کوشش کرتا آیا ہے لیکن چین نے ہمیشہ وسیع الظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگست 2007ء میں ملاعمر کی طرف سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ پڑوسی ممالک غیر ملکی قبضہ کے خلاف مزاحمت میں ان کا ساتھ دیں۔ طالبان سپریم کمانڈر کے اس بیان کو اگر اسی تناظر میں لیا جائے تو صورت حال اور واضح ہو جاتی ہے۔ چین کو فوراً دبائو میں لانے کے لئے سابقہ امریکی صدر بش نے تبت کے جلاوطن روحانی پیشوا دلائی لامہ سے ملاقات کا پروگرام بنایا جس پر چین نے سخت تشویش کا اظہار بھی کیا تھا اور کوئی ایسا قدم اٹھانے سے باز رہنے کا انتباہ کیا تھا تاہم ان واقعات نے اس نئی کشمکش کو ایک نیا راستہ دکھا دیا جسے ایک نئی سرد جنگ کا نام دیا جارہا ہے۔

اس سرد جنگ میں امریکا کا مدمقابل صرف چین نہیں ہے، روس بھی جواب بھی کئی یورپی ممالک میں اثرورسوخ رکھتا ہے اور آج بھی کئی ایسے ممالک موجود ہیں جو امریکی وروسی بلاک میں تقسیم ہیں، جن میں دونوں ممالک آج بھی مفادات کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ روسی صدر پیوٹن نے جب ایران کا دورہ کیا تو جوہری توانائی کے حصول کو ایران کا بنیادی حق قرار دیا۔ کسی بھی روسی صدر کا ایک طویل عرصے کے بعد یہ ایران کا پہلا دورہ تھا۔ اور پہلا موقع تھا کہ روس نے مکمل طور پر اس معاملے پر ایرانی مؤقف کی حمایت کی ہے اور اب بھی اپنے اس مؤقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ جس طرح روس کے مظالم سے تنگ آکر دنیا کے بہت سے مظلوم ممالک اور عوام کی ہمدردیاں روس مخالف بلاک کے ساتھ تھیں، ٹھیک اسی طرح

آج امریکا کے ستائے ہوئے ممالک بھی موجود ہیں جو امریکا کے ٹوٹنے کے متمنی اور کسی نجات دہندہ کی تلاش میں ہیں۔

تازہ کشمکش میں چین کو کئی مضبوط معاون میسر ہوں گے جب کہ امریکا کے اتحادی محدود ہیں۔لاطینی امریکا میں وینزویلا کی سربراہی میں کئی ممالک امریکا مخالف بلاک بنائے بیٹھے ہیں اور وہ ہمہ وقت کسی بھی امریکا مخالف اقدام پر آمادہ رہتے ہیں، جبکہ امریکا کے جنوب میں کیوبا جیسا ملک ہے جو کئی دہائیوں سے امریکی استعمار کو چیلنج کرتا آرہا ہے اور مزاحمت کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔اس کے علاوہ مسلم ممالک کے اندر پائی جانے والی امریکی مخالفت کی عمومی حس بھی اس جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہے۔مشرق وسطیٰ کے عوام کے امریکی مظالم کے خلاف مزاحمت پر مبنی اقدامات کی حمایت نے بھی چین کو ایک انصاف پسند ملک کا درجہ دے دیا ہے۔خوش قسمتی سے چین خطرناک صہیونی لابی کے زیر اثر بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں آزادانہ ومنصفانہ پالیسیاں ترتیب دے سکتا ہے۔

عراق اور افغانستان میں جاری مقامی جدوجہد نے کشمیریوں کو ایک نیا اور تازہ ولولہ اور عزم عطا کیا ہے کہ اگر دنیا کی سپر طاقت امریکا اپنے تمام اتحادیوں کے ساتھ اپنے بے پناہ وسائل اور قہرمانی کے ساتھ شکست وریخت کے عمل کے ساتھ ساتھ فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے تو دلی سرکار کب تک کشمیریوں کی جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے سامنے ٹھہر سکے گی۔ادھر دوسری طرف چین نے کشمیریوں کو بھارتی پاسپورٹ پر ویزہ دینے کی بجائے سفید کاغذ پر ویزہ دینے کا اعلان کر کے کشمیریوں کی تحریک حق خودارادیت کی عملی حمائت کا جو واضح اشارہ دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ چین اپنے پڑوس میں ہونے والی سازشوں سے مکمل باخبر ہے۔پہلی مرتبہ ایران نے بھی کشمیریوں کی جائز حمائت کا اعلان کر کے دلی سرکار کی اس ساری خوشی کو کافور کر دیا ہے جو اسے امریکی صدر کے دورے سے ملی تھی۔

اس موقع پر سید علی گیلانی کا ایران اور چین کا دورہ یقیناً دورس نتائج کا حامل ہو گا۔لیکن کیا جمہوریت کا نعرہ بلند کرنے والی دلی سرکار سید علی گیلانی کو ایسا کرنے کی اجازت دے گی؟اقوام متحدہ میں مستقل سیٹ کا خواب دیکھنے والی دلی سرکار کیلئے یہ کڑی آزمائش کو وقت ہو گا!

بروز جمعتہ المبارک 27ذوالحج 1431ھ 3دسمبر 2010ء

اک شخص اندھیرے میں اجالے کی طرح تھا

یوں نہ پھر ہو گا کوئی نغمہ سرا میرے بعد
اور ہی ہو گی گلستاں کی فضا میرے بعد
راہ سنساں مکاں خستہ مکیں افسردہ
کیسا ویراں ہوا شہر وفا میرے بعد

سرو قد و سجیلا، بلند و بالا کسرتی بدن، سرخ و سفید رنگت، کشیدہ قامت، گلابی و معصوم چہرہ، فراخ جبیں، منفرد و حسیں، خوبصورت سرمگیں آنکھیں جن میں بلا کی چمک بلکہ ہیرے کی دمک، پھر ان میں شب زندہ داری کی وجہ سے لال لال ڈورے، جائزہ لیتی ہوئی نگاہیں، ستواں اور اونچی ناک، خوبصورت نازک پتلے ہونٹ، کشادہ و غنچہ دہن، سرخ رخسار بمثل قندھاری انار، سلیقے و قرینے کی ملائم و ریشمی ریش مبارک جس میں سیاہی سے سفیدی ہم آغوش ، قریب تھا کہ سینہ ڈھانپ لے، ترشی ہوئی مونچھیں، سر منڈا ہوا مگر قراقلی ٹوپی سے ڈھکا ہوا، لہجے میں سوز و عاجزی، آواز میں اقبال، چال میں کمال، طبیعت میں جلال، سر تا پا استقلال، رفتار میں حکومت، گفتار میں سطوت، عظمت کشمیر کی معنوی صفات کا عکسِ جمیل، صبا کی طرح نرم اور رعد کی طرح گرم، ایک جیتی جاگتی کہانی، ارض کشمیر جنت نظیر کی نشانی، ایک حصار جس کی قربت سے حشمت کا احساس ہوتا ہے اور جس کی دوری میں عقیدت نشو و نما پاتی ہے، گویا شکل میں شہنشاہ تو عادات میں بے پناہ، یہ ہے ان کی جھلک جن کا نام نامی ہے حبیب اللہ ملک!

جن کی یادوں سے رگِ جاں میں دکھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا دل بھی رونے لگے

پینتالیس برس قبل آج ہی کے دن 3 دسمبر 1965ء جمعتہ المبارک بوقت تین بجکر تیرہ منٹ بمقام سول ہسپتال کمرہ نمبر 5 میں ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے اس عارضی زندگی کی بہاروں سے منہ موڑ لیا کہ جیسے انہوں نے جان لیا ہو کہ اب میر اٹھکانہ ایسے دار بقاء میں ہے جہاں سدا بہار خوشبوؤں کے گلستان ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی قدر و قیمت کا ایک معیار ہے اسی طرح اس جہاں کے گلستاں میں داخلہ کا ٹکٹ بھی ایسا ارزاں نہیں۔ زندگی جیسی قیمتی دولت دیکر موت نصیب ہوتی ہے اور پھر موت ہی تو وصل حبیب اور بقائے حبیب کا سبب اور ذریعہ ہے۔ بقائے حبیب سے بڑھ کر اور نعمت بھی کیا ہو گی! کیا خوب کہ آج ہزاروں دلوں کا حبیب اپنے حبیب کے حضور حاضر ہو گیا۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے اتنی دور بسائیں ہیں بستیاں

کہتے ہیں دنیا میں ایسی جھیلیں بھی ہیں جن کا پانی بیک وقت شیریں بھی ہے اور نمکین بھی، ان کے ایک حصے میں میٹھا اور شیریں پانی بہتا ہے اور دوسرے حصے میں نمکین اور کڑوا کسیلا۔ قدرت کا کیسا معجزانہ کمال ہے کہ ان میں پانی کی دونوں سطحیں الگ الگ رہتی ہیں اور ہر حصے کا پانی اپنا ذائقہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جب بھی ان کا مبارک خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں ایک ایسی ہی جھیل کا تصور جاگ اٹھتا ہے۔ کئی سال گزر گئے، ہزاروں دفعہ

قصد کیا کہ ان تصورات اور خوبصورت یادوں کو الفاظ کی زبان دوں لیکن ایک غیر مرئی خوف کی بناء پر ایسا نہ کر سکا، شائد بزدل، خوفزدہ اور کمزور ہوں کہ ان تمام یادوں کا احاطہ نہ کر سکوں گا۔ لیکن آج تو حد ہو گئی، بعض اوقات گم گشتہ یادوں کے بارود کے ڈھیر میں حالات وواقعات کا آتش گیر مادہ جمع ہوتا رہتا ہے لیکن دھماکے کیلئے کوئی چنگاری میسر نہیں آتی یا یوں سمجھ لیں احتیاط کی بناء پر چنگاری سے محفوظ رکھنا اصول حیات ٹھہر جاتا ہے لیکن آج انجانے کیوں دل نے ایسی چنگاری دکھائی کہ تمام یادوں کو ایک دھماکے سے اڑا کر رکھ دیا ہے۔

3 دسمبر 1965ء بروز جمعتہ المبارک کو میں جب آپ کے پاس فیصل آباد کے سول ہسپتال کے کمرہ نمبر 5 میں بیٹھا تھا تو آپ نے نیم کھلی آنکھوں سے پوچھا کہ "آج کون سا دن ہے؟" تایا جان نے جواب دیا کہ آج جمعہ ہے تو آپ نے اپنی رفیق حیات کی طرف نگاہ اٹھائی جو فوراً آپ کی نگاہوں کا مطلب بھانپ گئیں۔ آپ کو بستر پر ہی وضو کروا دیا گیا۔ آج پچھلے دس دنوں کی نسبت طبیعت میں خاصا سکون تھا۔ چہرے پر کمزوری کے باوجود رونق بھی لوٹ آئی تھی۔ دیرینہ ساتھی حافظ صاحب سے خصوصی فرمائش پر کافی دیر تک قرآن کریم سنتے رہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ حافظ صاحب خوش الحانی کے ساتھ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی آیات پر پہنچے تو آپ کی آنکھوں سے ساون بھادوں شروع ہو گیا۔ میں نے فوراً اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر لیا کہ برداشت کا یارانہ تھا۔ آپ نے ہم سب کو جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا۔

سب ہی ہسپتال سے ملحقہ مسجد کی طرف چل دیئے لیکن نجانے کیوں میرے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ رکھتا کہیں تھا، پڑتے کہیں تھے۔ مڑ مڑ کر نگاہیں کمرے کا طواف کر رہی تھیں، ایک انجانا سا خوف دل کو بے قرار کر رہا تھا۔ پچھلے دس دن والدہ محترمہ ایک پل کیلئے آپ سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ میرے میٹرک کے امتحان چل رہے تھے بس یوں سمجھیں کہ خانہ پری اور آپ کے احکام کی اطاعت ہو رہی تھی۔ میری امتحانات میں ہمیشہ یہ حالت رہی کہ مقررہ وقت ختم بھی ہو جاتا تھا اور مجھے لکھنے سے فرصت نہیں ملتی تھی لیکن اب کئی دنوں سے صورتحال بالکل مختلف تھی۔ اب شائد سب سے پہلے میں ہی اپنے پرچے سے فارغ ہو کر ہسپتال کی طرف بھاگتا تھا۔ میرے اسکول کے تمام اساتذہ کرام اور خصوصی طور پر میرے ہیڈ ماسٹر جناب ذکاء اللہ صاحب کو پوری توقع تھی کہ امسال پورے ضلع میں نمایاں کامیابی میں میرا نام ضرور ہو گا لیکن اس انجانے حادثے کی کس کو خبر تھی۔ یہ تو شائد آپ ہی کی دعاؤں کا کمال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی کرم فرمایا وگرنہ میری محنت اور کارکردگی تو آپ کی بیماری کی خبر نے سلب کر لی تھی۔

آپ جب سے ہسپتال میں صاحبِ فراش تھے، سارا شہر امڈ آیا تھا۔ کئی دفعہ ہسپتال کے عملہ نے اس طرف توجہ دلائی کیونکہ ڈاکٹروں کی ایک پوری جماعت ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ ہسپتال کا دوسرا عملہ بھی کوئی ایمرجنسی ڈیوٹی کی طرح حاضر رہتا تھا۔ بعض اوقات آپ کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ آپ ناقابل برداشت تکلیف کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں لیکن منہ سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ آپ پچھلے چند ہفتوں سے مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے بے خانماں مہاجرین کے استقبال کیلئے ملک کی اگلی سرحدوں پر پہنچ گئے تھے۔ آپ فیصل آباد سے تیسری مرتبہ پورا ٹرک گرم کپڑوں اور دیگر ضروری اشیاء کا لیکر نہ صرف امدادی کاموں میں مصروف تھے بلکہ اپنے بھائی عصمت اللہ ملک اور دوسرے عزیز واقارب کو بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ میرے ننہیال کی ایک خاصی تعداد جونہی پہنچی تو ان کو لیکر فوری فیصل آباد پہنچے مگر تیسری مرتبہ

بھی اپنے بھائی کے بغیر بہت مایوس لوٹے۔ آپ کے اندرونی کرب کا بخوبی آپ کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا۔ ایک شام آپ نے مہاجرین کی بے بسی اور غریب الوطنی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ سننے والے سب افراد آبدیدہ ہو گئے۔ کئی ایک خاندان کی آبادکاری کے باوجود آپ کا دل مسلسل مہاجرین کشمیر میں اٹکا ہوا تھا شائد اپنے مہاجر ہونے کے مصائب دوبارہ دل میں تازہ ہو گئے تھے۔ آپ پھر سے مہاجرین کی آبادکاری کی کوششوں میں مصروف تھے کہ کمر کی اچانک درد نے بے حال کر دیا۔ رات بھر کمر کی سخت درد میں مبتلا رہے۔ دوسری صبح اپنے دوست حکیم ریاست علی سے جو ذکر کیا تو اس نے بغیر دیکھے زائد المعیاد پنسلین کا انجکشن بائیں بازو میں لگا دیا، گویا آپ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا اعلان جاری ہو گیا۔ وہ دن بڑی مشکل سے گزرا، درد کی شدت نے بے حال کر دیا، فوری ہسپتال پہنچایا گیا ۔ معلوم ہوا کہ درد میں افاقے کی بجائے زائد المعیاد ٹیکے نے سارے جسم میں شدید قسم کا انفیکشن پیدا کر دیا ہے۔ سب ڈاکٹر حیران تھے کہ پچھلے چوبیس گھنٹے کس طرح گزر گئے حالانکہ اس انفیکشن کے بعد تو زندگی چند گھنٹوں کی مہمان ہوتی ہے۔ یقیناً دمِ واپسی کے معین دن کا انتظار تھا۔

فوری طور پر سارے جسم کا مکمل خون تبدیل کر دیا گیا۔ پہلے تین دن طبیعت سخت خراب رہی لیکن چوتھے دن طبیعت کافی سنبھل گئی۔ لیکن یکایک طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے بازو کاٹنے کا مشورہ دیا کہ دوبارہ اس انفیکشن کو سارے جسم میں پھیلنے سے روکنے کیلئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چچا جان جو خود ڈاکٹر تھے اور پہلے ہی دن سے سایہ کی طرح اس سارے عمل کی نگرانی کر رہے تھے، فوری آپریشن کی اجازت دے دی گئی۔ دوسری طرف مقامی اخبارات میں یہ خبر شائع ہونے سے حکیم ریاست علی کی گرفتاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ شہر بھر میں غم و غصہ کی ایسی لہر اٹھی کہ حکیم صاحب اپنا مطب بند کر کے شہر سے فرار ہو گئے۔ ایک دن اچانک حکیم صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہسپتال آپ کے قدموں پر سر رکھ کر گڑگڑا کر معافی مانگ رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ آپ بستر مرگ سے بھی ان کو تسلیاں دے رہے تھے۔ ہم سب کی طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا: "میں نے حکیم صاحب کو اس غیر دانستہ عمل پر معاف کر دیا ہے، آج کے بعد جو بھی ان کو تکلیف پہنچائے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا"۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ آپ کے ساتھ تعلق کو ختم کیا جائے، آپ کے تعلق پر تو پوری دنیا کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اغیار کو آپ کے تعلق پر فخر تھا پھر بھلا اہل خاندان سے کون ایسی جرأت کر سکتا تھا۔ حکیم صاحب کو عزت کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ مولوی اسماعیل اپنی ریڑھی پر باہر بیٹھا آپ کی صحت کیلئے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا تھا۔ آپ نے کس محبت کے ساتھ اس کو بھیک مانگنے سے منع کیا تھا حالانکہ وہ دونوں ٹانگوں بلکہ جسم کے نچلے مفلوج دھڑ کے ساتھ سڑکوں پر گھسٹ کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ آپ نے نہ صرف اس کیلئے ریڑھی کا بندوبست کیا بلکہ اپنے ہوٹل کے باہر اس کو ایک چھوٹا سا، کھوکھا، سامان کے ساتھ لگوا دیا کہ محنت کے ساتھ رزق کماؤ حالانکہ آپ کو اس جگہ کیلئے کئی دفعہ ہزاروں روپے کی آفر بھی ہو چکی تھی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ یہ میرا عمل میری عقبیٰ و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن جائے۔

آپ کا برسوں سے دستور تھا کہ علی الصبح فقیروں اور محتاجوں کی ایک لمبی قطار کو ہوٹل سے روزانہ چائے اور ناشتے کا بندوبست کرر کھا تھا اور اس عمل کو اپنے فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ ملازمین کو سختی سے ہدائت تھی کہ اس عمل میں کوئی سستی اور بداخلاقی کا اظہار نہ کرے۔ پھر ملازمین سے بھی اولاد جیسی شفقت اور محبت تھی۔ کشمیر سے محبت کا ایک ایسا اعلیٰ ثبوت کہ تمام ملازمین جن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا برسوں سے کام کر رہے تھے، گویا اپنا ایک چھوٹا سا کشمیر بسائے بیٹھے تھے۔ شہر کے شرفاء، دانشوروں اور علماء سے دوستی کا یہ عالم کہ میلوں دور سے ان حضرات کی روزانہ آمد پر محفل سجائی جاتی تھی جہاں شہر کا مقامی مسئلہ ہو یا قومی سیاست کا، اس میں پھر پور اجتماعی دلچسپی اور شرکت فرماتے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ قومی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کا بھی از حد احترام تھا مگر ایوب خان کی حمائت محض اس لئے کہ اسلام میں عورت کو گھر کی حکمرانی کا درس دیا گیا، حالانکہ ہم سب محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی کیلئے دعا گو تھے۔ ایک دفعہ اہلیہ جو کہ سیاست کے حرف سے بھی واقف نہیں تھیں، محض عورت ہونے کے ناطے محترمہ فاطمہ جناح کی حمائت میں کچھ ہمدردی کے الفاظ کہہ ڈالے، بس پھر کیا تھا کہ جھیل کا میٹھا پانی کچھ لمحوں کیلئے تو کڑوا ہو گیا لیکن فوری اپنے اس رویہ پر معذرت کرتے ہوئے دلجوئی فرمادی۔

علمائے دین کا از حد احترام اور ان کی مجالس میں بیٹھنا باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ جہاں مولانا صدیق صاحب سے مراسم تھے وہاں صاحبزادہ فیض الحسن سے بھی یاداللہ تھی۔ مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل سے تو خصوصی محبت تھی۔ مجلسِ احرار کے ناطے صاحبزادہ فیض الحسن کی خطابت کے بھی بہت معترف تھے۔

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالب بے مثال کی صورت

بات پھیل گئی مگر یادیں بدستور پرے جمائے صف در صف کھڑی ہیں۔
کس کو لوں اور کس کی چھوڑوں! مجھے اس بات کا تو علم ہے کہ محبت کے پھول آنکھوں کے گملوں میں ہوتے ہیں جو پلکوں کی حفاظت میں سینچے جاتے ہیں لیکن برسوں کی فصل پک کر آج ان صفحات پر جمع ہو رہی ہے۔ شائد ایسا آج بھی نہ ہوتا اگر یہ 3 دسمبر کا دن انمٹ نقوش لئے مطالبہ اور تقاضہ نہ کرتا۔ دراصل دکھوں کے چراغ جب انسان اپنی ہتھیلی پر لیکر پھرتا ہے تو اس کا اجالا چہرے پر سہانی یادوں کے داغ نمایاں کر دیتا ہے اور پھر بعض اوقات انسان محبت میں ایک تماشہ بن جاتا ہے لیکن اگر یہی دکھ کا چراغ چھپ کر دل میں جلایا جائے تو اس کی روشنی سے روح روشن اور مہک اٹھتی ہے۔ پھر انسان دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً پچھلی چار دہائیوں سے زائد آپ کی یادوں کے چراغوں کی لو دھیمی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی!

اندر بھی زمیں کے روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

میں جانتا ہوں آپ کیوں اور کہاں چلے گئے ہیں اس کے باوجود کم و بیش ہر روز اپنے دل میں ایسے ان گنت سوالات کلبلاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اب تو آپ کے ہاں اڑوس پروس میں کئی اپنے ہی چلے آئے ہیں۔ ایک طرف ماں کی محبت کو پہلو میں لٹا رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی رفیقہ حیات کو بھی

بلار کھاہے۔ جہاں تایا جاناور چچا جان اس محفل میں شریک ہیں وہاں نوجوان بیٹے اعجاز ملک اوراحسان ملک بھی آپ کے ساتھ محفل سجائے تشریف فرماہیں۔

معشوق ریاض اٹھ گئے اس بزم سے کیا کیا
جاتی ہوئی دنیا ہے رہے نام خدا کا

مجھے آپ کی کہانی سنانے کا ناصحانہ انداز اچھی طرح یاد ہے کہ کس حکمت ودانائی کے ساتھ ہمارے دلوں میں مطلوبہ نصیحت گھر کر جایا کرتی تھی۔ آپ نے کبھی بھی اپنی غریب الوطنی کے مصائب کو نہیں چھپایا بلکہ ہمیشہ اس کو عبرت کے انداز میں یاد بھی رکھا اور ہمارے دلوں میں بھی اتارا ۔ پاکستان کو ایک معجزاتی ریاست اور جان سے زیادہ عزیز رکھنے کی تلقین کی کہ دنیا میں اس سے بڑی اور کوئی نعمت نہیں جو لاکھوں جانوں کی قربانی اور ایثار سے حاصل کیا گیا۔ شب وروز کی محنت نے زندگی کے تمام انعامات سے نوازر کھا تھا لیکن کشمیر کی یاد اکثر آبدیدہ کر دیتی تھی۔ ہم سب کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کنبہ پروری میں اپنی مثال آپ تھے۔ توفیقِ ایزدی سے جب گھر بنوایا تو خاندان کے کئی بے گھر افراد کو گھر کے ایک حصے میں رہنے کی تمام آسائشیں مہیا فرمادیں۔ آپ کی ساری عمر کوشش رہی کہ کسی بچے کی جائز خواہش "حسرت" نہ بن جائے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ "کاش! ایسا ہوتا۔" آپ کو یہ سننا پسند نہ تھا۔ خود بھی قناعت برتی اور عملاً اس کی تلقین بھی کی۔

ایک مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات میں اسکول کے طلباء کا ایک گروپ مطالعاتی سیر کیلئے سوات اور گلگت کیلئے تیار ہوا۔ میں نے بھی اپنا نام لکھوادیا۔ آپ سے اجازت مانگی تو آپ نے بڑے اصرار کے بعد اجازت تو دے دی لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ آپ مجھے رخصت کرنے کیلئے خود ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے آئے اور علیحدگی میں میرے ہیڈ ماسٹر جناب ذکاء اللہ صاحب اور دوسرے اساتذہ کرام سے کافی دیر محو کلام رہے۔ یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ ایک خاصی رقم زادِ راہ کیلئے خاموشی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے حوالے کر دی کہ میری کسی خواہش کو حسرت میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے۔ پھلوں کے کئی ٹوکرے بھی ساتھ لائے جس سے تمام طلباء ساتھی بھی خاصے لطف اندوز رہے۔ جب مہینہ بھر کی سیر سے واپس پہنچا تو گھر والوں سے معلوم ہوا کہ آپ نے ہر شب خصوصاً پھل کھانے کی مجلس میں بہت یاد فرمایا بلکہ بے تابی کا یہ عالم تھا کہ میں نے جو خطوط لکھے تھے ان کو دن میں کئی مرتبہ سنتے تھے۔ میں نے اس سفر میں "سواتی سٹائل" کی ایک ٹوپی خریدی جو آپ نے میری دلجوئی کیلئے کئی دن اوڑھے رکھی حالانکہ مجھے علم تھا کہ آپ ہمیشہ قراقلی ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔

خواب بن کر رہ گئیں ہیں کیسی کیسی محفلیں
خیال بن کر رہ گئے ہیں کیسے کیسے آشنا

اپنی والدہ کی دلجوئی کا کس قدر خیال تھا۔ ساری عمر آپ کے پاس قیام رہا حالانکہ دوسرے بچوں کے گھر بھی قریب تھے۔ ایسی بے مثال محبت، ایک دفعہ سردیوں میں ان کیلئے ایک گرم چادر سو روپے میں خریدی، گھر میں والدہ کی خدمت میں پیش کی تو والدہ نے فوراً محبت میں اوڑھ لیا۔ ان کے دل میں

نجانے کیا آیا کہ انہوں نے اس گرم چادر کی قیمت پوچھ لی۔ آپ کافی ٹال مٹول سے کام لیتے رہے لیکن بالآخر جب بتانے پر مجبور ہو گئے تو انتہائی غیر معمولی قیمت محض اس لئے بتائی کہ اصل قیمت سن کر والدہ فضول خرچی گردان کر ناراض نہ ہو جائیں۔

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کیلئے

آپ کی بڑی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرونِ ملک کا سفر کروں۔ اس کیلئے اپنے قریبی دوست محمد حنیف صاحب کو بستر مرگ سے تلقین بھی کی۔ میں بھی سن رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اس خواہش نے مجھے بے شمار رکاوٹوں کے باوجود سہارا دیئے رکھا اور اب ایک ایسا وقت بھی آیا کہ آدھی دنیا کی سیاحت کر چکا ہوں لیکن پھر بھی ہر سال کوئی نہ کوئی بیرونی سفر انتظار میں رہتا ہے۔

آپ تو اپنے ہر تعلق رکھنے والے کے دل میں اپنی بے پناہ یادیں چھوڑ کر اپنے محبوب رب کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ موت کوئی نئی چیز نہیں، اس کا ذائقہ تو ہر کسی نے چکھنا ہے، موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ ولی، جو بھی آتا ہے اپنا مقررہ وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، کسی کا حالتِ ایمان میں اس دنیا سے رخصت ہو جانا اس کے حق میں ایک بڑی نعمت ہے۔ پھر اس دنیا میں آنا ہی درحقیقت جانے کی تمہید ہے مگر بعض جانے والے اپنی دائمی جدائی کا ایسا غم دے جاتے ہیں جو بڑا ہی جانکاہ اور ہوشربا ہوتا ہے بلکہ اس صدمے سے سنبھلنے میں عمر صرف ہو جاتی ہے۔ آخر آپ بھی تو اپنی والدہ محترمہ کا تین مہینے سے زائد انتظار نہ کر سکے۔

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

بعض لوگوں کے جانے کی اطلاع پڑوسی کو بھی نہیں ہوتی، اگر ہو بھی جائے تو دو چار آنکھوں کے علاوہ ان پر رونے والا کوئی نہیں ہوتا، بعض لوگوں کے جانے سے دو چار خاندان غمزدہ ہوتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے سے ایک عالم غمگیں اور اندوہگیں ہو جاتا ہے، جس تک بھی خبر پہنچتی ہے اس کی چشم نم اور دل غم سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جن کے رخصت ہونے سے محبت والفت کی مسند سونی ہو جاتی ہے، پیار و شفقت کی بساط الٹ جاتی ہے، پورا کنبہ ان کی دعاؤں اور برکات و توجہات سے محروم ہو جاتا ہے۔

آپ کی موت ایک انسان کی موت نہیں بلکہ ایک عمل کی موت ہے جس کا خلاء ابھی اور برسوں رہے گا۔ آپ کی موت تو ایک انکساری و تواضع کی موت ہے، شرافت و نجابت کی موت ہے، شفیق باپ، محبت کرنے والے شوہر اور پرخلوص رفیق کی موت ہے۔ ایک ایسے عظیم انسان کی موت ہے جن کے نقشِ پا سے زندگی راستہ ڈھونڈتی ہے۔ ایک ایسے بلند پایہ خلیق باپ کی موت ہے جس سے محبت کا ایک باب مکمل طور پر بند ہو گیا ہے۔ آپ کے دل کی دھڑکن نے بند ہو کر سینکڑوں دلوں کی دھڑکن کو بری طرح پامال کیا ہے۔

آپ ہمارے لئے پند و نصائح کا مینارہ نور تھے جس کی روشنی میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت عود کر آتی تھی۔ آپ خود شمع کی مانند پگھل کر اک جہاں کو روشنی مہیا کرتے تھے۔ دنیا کی سخت دھوپ میں نہائت فرحت بخش سایہ بن کر ہر کسی کے سر پر موجود تھے، خود بے قرار ہو کر ہر کسی کو سکون کی دولت تقسیم کرتے رہتے تھے۔ بولتے تو منہ سے ایسے انمول موتی جھڑتے کہ ہر کسی کو سمیٹنے میں اپنی جھولی تنگ نظر آتی۔ اگر خاموش رہتے تو وقار و سکینت کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے۔ کس کس خوبی کا ذکر کروں اور اب کس کس محرومی کی نشاندھی کروں، گویا اب تو تپتی دھوپ میں ان سنگلاخ پتھروں پر ننگے پاؤں چلنے کی بھی ایک عادت سی ہو گئی ہے۔

غم مختلف شخصیتوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں پر غم کی خبر بجلی کے کرنٹ کی طرح گرتی ہے، کچھ لوگوں پر غم کا دھارا چل کر انہیں بھگو دیتا ہے، کچھ لوگ غم کی خبر سن کر خالی الذہن ہو جاتے ہیں، پھر غم بوند بوند گرتا چلا جاتا ہے۔ آپ کو بھی جب منوں پھولوں میں سجا ہوا دیکھا تھا تو دفعتاً میں خالی الذہن ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب غم بوند بوند گرے گا، گرتا رہے گا، میرا سب سے بڑا محسن جو چلا گیا تھا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مشاہدہ، وہ جو مجھ پر اللہ کی عظیم ترین کرم نوازی تھا، جس کے جانے کے بعد میں بالکل اکیلا رہ گیا، جیسے کسی مٹی کے پیالے سے دودھ نکال لیا جائے اور اب صرف خالی برتن رہ جائے!

آپ تو ایک عطیہ خداوندی تھے جس سے ہم سب استفادہ کرتے رہے اور اب اللہ نے آپ کو واپس بلا لیا ہے۔ آپ نے سفر آخرت کیلئے بھی کیسا دن پایا۔ جمعتہ المبارک کی نماز پڑھ کر ہم سب تیزی سے لوٹے تو معلوم ہوا کہ مسلسل ایک گھنٹہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی رفیقہ حیات کو دنیا کی گرم سرد ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی نصیحتیں فرماتے رہے، بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے معاملات کی صفائی طلب کرتے رہے، آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر بڑی بے بسی سے دعا کی۔

"اے غفور الرحیم! اپنے کھوٹے اعمال کے ساتھ تیرے دربار میں تیری رحمت کا امیدوار بن کر حاضر ہو رہا ہوں، اگر تو معاف کر دے تو کوئی

بڑی بات نہیں، دنیاوی سفر بھی زادِ راہ کے بغیر تیرے سہارے طے کیا ہے اور اب بھی ایسا ہی معاملہ ہے"۔

جونہی کمرے میں داخل ہوتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں، دم واپسیں ہے۔ سانس بدستور چل رہا ہے، آخری نگاہ سب پر ڈالتے ہیں اور آنکھیں موند لیتے ہیں جیسے نیند کا شدید غلبہ طاری ہو گیا ہے۔ چند لمحوں کے بعد آنکھیں بند کئے ہوئے علامہ اقبال کی یہ رباعی دہراتے رہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر..... روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینم حسابم ناگزیر..... از نگاہ مصطفی پنہاں بگیر

کمرے میں موجود افراد کو گواہ بنا کر بلند آواز سے کلمہ شہادت اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ پڑھتے ہوئے 48 برس کی عمر میں اپنے رب سے جا ملے۔

صبح سے بڑی خنکی تھی، سورج تو صبح سے منہ چھپائے کھڑا تھا جیسے اس کو پیشگی علم ہو گیا ہے۔ یکایک کڑاکے کی بجلی چمکی اور پل بھر میں جل تھل ہو گیا گویا آسمان نے بھی خراجِ تحسین پیش کر دیا ہو۔ پندرہ بیس منٹ کے اس عمل کے بعد موسم بالکل نکھر گیا۔ سارے شہر میں نجانے کیسے اطلاع ہوئی کیونکہ ادھر تو کسی کو بھی اتنی ہوش نہ تھی۔ ہزاروں لوگوں کا اجتماع رخصت کرنے آیا ہوا تھا۔ بڑے اہتمام کے ساتھ رخصتی کا وقت آن پہنچا۔ رات کے اندھیرے میں ایک اور چاند زمین میں دفن کر دیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

آج بھی صبح سے ہوا میں بہت خنکی ہے اور اتفاق سے جمعتہ المبارک کا دن بھی ہے۔ موسم بدل چکا ہے، چند ہفتوں کے بعد نیا موسم بھی شروع ہو جائے گا، گرمیاں، سردیاں، بہار، خزاں سب باری باری آئیں گے مگر آپ.....! آپ تو کبھی نہیں آئیں گے۔ اداسی جو ایک سیاہ بادل کی طرح میرے دل میں اترتی چلی جا رہی ہے، نیچے ہی نیچے..... نیچے ہی نیچے، میں دل تھام کر ان کیلئے دعا کرتا ہوں کہ:

اے غفور الرحیم! آپ رب ہیں ہم عبد ہیں، ہمارا رشتہ ساجد و مسجود کا ہے، آپ دینے والے ہم لینے والے ہیں، آپ رحمٰن ہیں ہم طلبگار ہیں، ہم سب کی اور مرحومین کی تمام غلطیوں سے درگزر فرما اور والد محترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرما۔ ثم آمین

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

(والد مرحوم کی 45ویں برسی کے موقع پر)

بروز اتوار 29 ذوالحج 1431ھ 5 دسمبر 2010ء

وکی لیکس۔ حقیقت یا افسانہ

دنیا کا شائد ہی کوئی اور ملک ہو جہاں وکی لیکس دستاویزات نے وہ تہلکہ برپا کیا ہو جو پاکستان میں کیا ہے۔ پاکستان کے حوالے سے تقریباً اٹھارہ ہزار دستاویزات اب تک سامنے آچکی ہیں جو دنیا کے مختلف ممالک اور بالخصوص اسلام آباد پاکستان سے امریکی سفارتکاروں نے امریکی وزارتِ خارجہ کو لکھے ہیں، جو پاکستان کے اندرونی سیاسی معاملات، سیاسی رہنماؤں کے خفیہ بیانات سے لیکر حساس دفاعی محکمے کے ذمہ داران کی مکمل گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے کئی درجن ایسی دستاویزات سامنے آئی ہیں جنہوں نے ملکی سیاسی طوفان میں زبردست تلاطم برپا کر دیا ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ان مخصوص انکشافات کے علاوہ دوسری دستاویزات ابھی سربستہ راز کیوں ہیں لیکن جو دستاویزات سامنے آئی ہیں ان کے مطابق ملک کی کئی متنازعہ شخصیات مزید متنازعہ بن کر سامنے آئی ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں شکوک وشبہات اور گہرے ہو گئے ہیں بلکہ کئی ایک شکوک وشبہات پر تو اب یقین کی مہر ثبت ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ دستاویزات بہت ہی منظم مگر مختصراً سامنے لائی گئی ہیں۔ امریکی حکومت نے وکی لیکس کی ویب سائٹ کو فوراً بند کرنے اور اس کے سربراہ اور آپریٹر کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کرتے ہوئے انٹرپول سے مدد طلب کر لی ہے جبکہ معتبر مغربی ذرائع سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ چھ درجن سے زائد ممالک نے بھی انٹرپول سے ایسی ہی اپیل کی ہے۔ ممکن ہے کہ اب مزید انکشافات سامنے نہ آسکیں یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ انہی انکشافات کے بعد ہدف حاصل ہو گیا ہو، اس لئے مزید کاروائی کو دنیا کی آنکھوں سے فی الحال اوجھل رکھنے کا فیصلہ ہو گیا ہو۔

پاکستان میں جن مشکوک اور متنازعہ شخصیات کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں ان کے بارے میں عوام کو شائد اس قدر حیرت نہ ہوئی ہو لیکن ان دستاویزات میں پاکستان کے اس ادارے کے بارے میں بھی ہوشربا انکشافات کئے گئے ہیں جس کی عوام کے دلوں میں ایک گہری عقیدت ہے اور جس نے پچھلے ڈھائی سالوں میں اپنے وقار اور عمل سے اپنی ساکھ کو ایک مرتبہ پھر منوایا ہے۔ اس ادارے کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کو ایسے چند جملوں کی بنیاد پر متنازعہ بنانے کی سازش کی گئی ہے جس کا مقصد عوام کے دلوں میں ان کی محبت کو مشکوک کرنا مقصود ہے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی کے بارے میں ان دستاویزات میں جو انکشافات کئے گئے ہیں ان کا حوالہ پاکستان میں سابقہ امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن سے ملاقاتوں پر مبنی گفتگو کے وہ چند مراسلات ہیں جو اس نے اپنی حکومت کو تحریر کئے۔

ان مراسلات میں انہوں نے جنرل کیانی کے بارے میں یہ تاثر دیا ہے کہ "جنرل کیانی کو اس بات کی یہ بھی فکر نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کے صدر آصف علی زرداری اپنے منصب پر رہتے ہیں یا ان کی بہن فریال تالپور کو پاکستان کا نیا صدر مقرر کیا جاتا ہے "۔ اس موقع پر وہ اتنے غیر ذمہ دار بتائے جاتے ہیں کہ وہ (جنرل کیانی) کہتے ہیں کہ "میں آصف زرداری کو فارغ کر دوں گا اور پھر وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ میں عوامی نیشنل پارٹی کے صدر اسفندیار ولی کو ملک کا نیا صدر مقرر کر دیں گے "۔ جنرل کیانی کے بارے میں یہ چند جملے جس طرح شائع ہوئے ہیں اس سے لگتا یہ ہے کہ اس باوقار ادارے کے سربراہ کو متنازعہ بنا کر پاک افواج کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کیلئے مزید بلیک میل کیا جا سکے ۔ جنرل کیانی کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف زرداری کو فارغ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ملک کی دوسری سیاسی جماعت کے سربراہ نواز شریف کو بھی اقتدار

سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان کو پاکستان کی نہ تو فکر ہے اور نہ ہی کوئی پرواہ اور اس طرح وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بھی اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔

ان چند جملوں کی بناء پر غیر ملکی میڈیا بھی پاکستان کے اس انتہائی حساس ادارے کو دن رات مطعون کرنے میں مصروف ہے اور پاکستانی میڈیا کے چند اینکرز بھی کوئی تحقیق کئے بغیر غیر ملکی میڈیا کے مدد و معاون کا کردار ادا کرتے نظر آرہے ہیں۔ اب یہ انتہائی اہم ہو گیا ہے کہ پاکستانی عوام کو سامنے چند اہم معلومات بھی رکھیں جائیں تا کہ ان کو ان تمام معاملات کا تجزیہ کرتے وقت اصل حقیقت کا بھی اندازہ ہو سکے۔ اس لئے ان چند سطروں کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے پاک امریکا کے حالیہ ڈیڑھ ماہ کے عسکری حالات کو سمجھنا بہت ضروری ہے اور ان اہم حالات کے پس منظر میں ان وکی لیکس کے انکشافات کی وجہ تسمیہ بخوبی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم پس منظر کی پہلی کڑی واشنگٹن میں اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں پاکستان اور امریکا کے درمیان اسٹریٹیجک مذاکرات ہیں جن میں پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی، کابینہ کے دوسرے اہم وزراء اور پاک فوج کے سربراہ جنرل کیانی کی امریکا کے اہم عہدیداروں سے بڑی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس سلسلے کی اہم ملاقات 20 اکتوبر کو وائٹ ہاؤس میں باراک اوبامہ کے ساتھ ہے جس کو میڈیا میں ،،اچانک ملاقات ،،کا نام دیا گیا لیکن پاکستانی وفد کو اس کی پیشگی اطلاع تھی۔ دوران ملاقات جہاں باراک اوبامہ نے پاکستانی وفد کے ساتھ گفتگو کی وہاں جنرل کیانی نے اس ملاقات میں پہلی مرتبہ بارہ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ براہ راست باراک اوبامہ کے حوالے کی جس میں انہوں نے پاک امریکا تعلقات کا خلاصہ پیش کیا جس میں انتہائی دوٹوک انداز میں بڑے واضح اور باوقار طریقے سے اس وقت امریکا اور پاکستان کے درمیان جو مسائل ہیں، ان کو اجاگر کیا۔

اطلاعات کے مطابق ان دستاویزات میں انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی اور جرأت کے ساتھ پاکستانی عوام کے امریکا کے بارے جذبات و تاثرات کا ذکر کیا اور ان تمام نکات کی نشاندہی کی جن سے پاکستانی عوام سخت نالاں ہیں۔ ان دستاویزات میں جن نکات کی طرف باراک اوبامہ کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے، اس کی مختصر اًفہرست آپ بھی ملاحظہ فرمالیں:

1۔ امریکا پاکستان کے اقدامات اور تعاون کی قدر نہیں کرتا بلکہ امریکا پاکستان کو کسی خاطر میں نہیں لاتا۔

2۔ امریکی حکمت عملی کا بنیادی ہدف پاکستان کو جوہری صلاحیت سے محروم کرنا ہے۔

3۔ امریکا مداخلت کرتا ہے جو ناقابل برداشت ہے، امریکا ہر معاملے اور ان سے جڑے چھوٹے چھوٹے امور پر قابو پانا چاہتا ہے۔

4۔ امریکا پاکستان میں منظم افراتفری کا ذمہ دار ہے اور اس کو برقرار بھی رکھ رہا ہے۔

5۔ بھارت کے ساتھ تنازعات کے حل میں امریکا پاکستان کو تعاون فراہم کرنے کو تیار نہیں۔

6۔ کچھ حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ امریکا کے نزدیک پاکستان کی کوئی اہمیت نہیں، اس لئے ہر بار تعاون فراہم کرنے پر پاکستان کو امریکا کے سخت رویہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

7۔ پاکستان کو قربانی کا بکرا بنایا جارہا ہے۔

8۔پاکستان سب سے قابل گرفت اتحادی ہے اور سب سے زیادہ دباؤ میں آنے والا اتحادی بھی ہے۔
جنرل کیانی نے پہلی مرتبہ دوٹوک انداز میں براہ راست امریکی صدر باراک اوبامہ کو پاکستانی عوام کے دلوں میں پائے جانے والے خدشات سے آگاہ کرتے ہوئے پاک امریکا کے بہتر تعلقات میں ان رکاوٹوں کی نشاندہی کی اور ساتھ یہ بھی وضاحت کی کہ پاکستانی عوام پاک فوج کو اپنی امنگوں کا امین دیکھنا چاہتی ہے۔اس رپورٹ میں جنرل کیانی نے مزید یہ بھی بتایا کہ:

☆پاکستان اور امریکا کے خیالات کبھی ایک نہیں ہوسکتے اور ہمیں ایک دوسرے کی پوزیشن سمجھنے اور اس کو سراہنے کی ضرورت ہے۔پاکستان کے تحفظات اور حدود کے درست ادراک سے ہی ہمیں بہتر مدد دی جاسکتی ہے۔ہم پر ہر وقت زیادہ اقدامات اٹھانے کا دباؤ ہوتا ہے جو کہ مددگار ثابت نہیں ہورہا۔صورتحال اس صورت میں مزید گھمبیر ہو جاتی ہے جب پاکستان یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے ایک ایسے مختلف راستے کی طرف دھکیل دیا گیا ہے جو آگے چل کر امریکا کے حتمی راستے سے مختلف ہے۔

یہ تھا جنرل کیانی کا براہ راست اندازِ بیاں جو کہ اب تک شائد کسی پاکستانی جنرل یا کسی سیاسی لیڈر کے وہم وگماں میں بھی نہیں آیا اور اگر یہ اندازِ بیاں نو برس پہلے استعمال کر لیا ہوتا تو آج ساری قوم ذلت ورسوائی کے اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتی۔پاکستانی افواج کا اب تک اجتماعی طور پر تمام جنگوں میں اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر اس نام نہاد،،وارآن ٹیرر،،میں ہو چکا ہے۔اس لئے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ پاکستانی جنرل کا یہ دو ٹوک مگر مبنی برحق رویہ امریکا کے ان اداروں کو یقیناً انتہائی ناگوار گزرا ہے جو اس "وارآن ٹیرر" کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اس جنگ کی آڑ میں خدانخواستہ پاکستان کے وجود کے درپے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وکی لیکس میں پاکستان کے بارے میں اٹھارہ ہزار مراسلات میں ان چند سطروں کو شہرت دیکر پاک افواج کے ادارے اور اس کے سربراہ جنرل کیانی متنازعہ بنا کر نقصان پہنچانے کی ایک نئی سازش تیار کی گئی ہے۔ان وکی لیکس میں ان چند سطروں کا پس منظر دراصل پاکستانی قوم کا عدلیہ کے ججوں کو بحال کروانے کا مارچ 2009ء کا وہ تاریخی لانگ مارچ بتایا جارہا ہے جہاں جنرل کیانی نے آصف زرداری کو رخصت کرنے اور اسفندیار ولی کو نیا صدر مقرر کرنے کا اشارہ کیا تھا حالانکہ جنرل کیانی نے تو ملکی سلامتی کے پیش نظر ایک تاریخی رول ادا کیا تھا۔

جب یہ لانگ مارچ لاہور سے روانہ ہوتا ہوا گوجرانوالہ پہنچا تو اس کے شرکاء کی تعداد لاکھوں میں ہوگئی تھی اور اسلام آباد میں کئی گنا اضافے کی توقع بھی تھی اور دوسری طرف پشاور کی جانب سے جماعت اسلامی اور عمران خان جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اسلام آباد کی طرف بڑھ

رہے تھے۔ ایوان صدر کو اس نئی صورر تحال پر سخت تشویش ہو رہی تھی اور اس وقت ملک میں کچھ بھی ہونے کا امکان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایوان صدر میں جاری اجلاس میں صدر زرداری اپنی منی کابینہ کے ساتھ صلاح و مشورہ میں مبتلا تھے جہاں جنرل کیانی کو بھی بلایا گیا لیکن اسلام آباد جانے والی تمام سڑکوں کا عوامی محاصرہ ہو چکا تھا اور جنرل کیانی مجبوراً ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایوان صدر پہنچے جہاں انہوں نے عدلیہ کے ججوں کی بحالی کا مکمل اختیار جمہوری حکومت کی صوابدید پر چھوڑتے ہوئے یہ کہا کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے میں لانگ مارچ کی قیادت تک آپ کا پیغام پہنچادوں گا۔

وکی لیکس میں یہ انکشافات جن میں امریکی سفیر نے یہ تاثر دیا کہ جنرل کیانی خود اقتدار پر قبضہ کرنے کی خواہش رکھتے تھے، مارچ 2010ء میں امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن کے ان دو مراسلوں سے لئے گئے ہیں جس میں کراچی بلاول ہاؤس میں صدر آصف زرداری سے ملاقات کے بعد انہوں نے اپنی حکومت کو تحریر کیا کہ،، آصف زرداری نے ان سے کہا ہے کہ میں نے بلاول کو یہ وصیت کر دی ہے کہ اگر مجھے قتل کر دیا جاتا ہے تو میرے بعد میری بہن کو پیپلز پارٹی کا سربراہ بنا دیا جائے اور بعد میں اس ملک کا صدر بنا دیا جائے۔ ایک اور مراسلہ جو مارچ 2010ء میں تحریر کیا گیا کہ " ایک ملاقات میں جنرل کیانی نے امریکی سفیر سے وکلاء کے لانگ مارچ کو ایک بڑا سیاسی تنازعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر ملکی صورتحال خراب ہوتی ہے تو وہ صدر زرداری کو رخصت کرنے اور اسفندیار ولی کو صدر بنانے کا سوچ رہے ہیں۔ امریکی سفیر نے جب زرداری کی وصیت کا تذکرہ کیا تو جنرل کیانی نے کہا کہ ممکن ہے کہ فریال تالپور زرداری سے بہتر صدر ثابت ہوں"۔

6/اکتوبر 2009ء کو وکلاء تحریک کے سربراہ اعتزاز احسن نے خود میڈیا پر ایک انٹرویو میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے جنرل کیانی کو کریڈٹ دیا کہ اعلیٰ عدلیہ اور ججوں کی بحالی کا معاملہ حل ہی اس وقت ہوا جب آرمی چیف نے اس معاملے میں مداخلت کی۔ اس کے علاوہ اس تحریک کی قیادت کرنے والے میاں نواز شریف نے بھی 2 ستمبر 2009ء کو برملا میڈیا پر آکر جنرل کیانی کی تحسین کرتے ہوئے کہا،، ہمیں اس بات کا اعتراف اور احترام بھی کرنا چاہئے کہ کیانی صاحب نے ججوں کی بحالی میں ایک بڑا مثبت رول ادا کیا تھا اور یہ عین جمہوری اسپرٹ کے عین مطابق تھا،،۔ ادھر دوسری طرف امریکا میں بھی اعلیٰ ترین حکومتی حلقوں میں جنرل کیانی کے اس کردار کو سراہا گیا۔ امریکا کے ایک ممتاز میگزین "ٹائمز" جب دنیا کے ممتاز اور طاقتور لوگوں کے پروفائل تیار کر رہا تھا تو اس وقت جنرل کیانی کو دنیا کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ امریکی افواج کے سربراہ جنرل مائیک مولن نے "ٹائمز" میں ایک غیر معمولی مضمون تحریر کیا تھا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"جنرل کیانی ایک ایسے شخص ہیں جن کے پاس ایک طے شدہ منصوبہ ہے، ایک ایسے قائد جنہیں اپنی منزل کا پورا ادراک ہے..... یہ دیکھنا اہم ہے کہ جنرل کیانی نے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے فوج کو سیاست میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی اور فوجی ذمہ داریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جنرل کیانی نے عدلیہ بحالی تحریک سے پیدا ہونے والے آئینی بحران کے پر امن حل کیلئے مدد فراہم کی"۔

بے نظیر کے قتل کے بعد 28 جنوری کو کراچی میں آصف زرداری سے ملاقات کا احوال این ڈبلیو پیٹرسن اپنے ایک اور مراسلہ میں اس طرح کرتی ہیں: زرداری نے اپنی بات کا آغاز یہ کہتے ہوئے کیا کہ "امریکا ہماری سلامتی کی ضمانت ہے اور بتایا کہ کس طرح بے نظیر بھٹو جان کو درپیش خطرات کے باوجود امریکا کے تعاون اور کلیئرنس کے بعد ہی وطن پہنچیں تھیں.....! زرداری نے کہا کہ بے نظیر کی میراث کو آگے بڑھانے کیلئے انہیں امریکا کی مدد کی ضرورت ہے..... ایسا لگ رہا تھا کہ زرداری وزیر اعظم کے عہدے کیلئے امریکی حکومت کی آشیر باد چاہتے ہیں"۔ امریکی سفیر اپنے اپریل 2008ء کے مراسلے میں تحریر کرتی ہیں: "اچھی خبر یہ ہے کہ زرداری امریکا کے حامی اور انتہا پسندوں کے خلاف ہیں۔ پیٹرسن کا خیال ہے کہ حکومت میں زرداری امریکا کے سب سے بڑے اتحادی ہیں"۔

26 مئی 2008ء میں صدر زرداری کی دو امریکی ایوان نمائندگان ایڈم شیف اور ایلی شوارنز کی ملاقات کا احوال یوں تحریر کرتی ہیں: "صدر زرداری نے پاکستان میں شفاف پارلیمانی انتخابات میں تعاون دینے پر امریکی حکومت کا شکریہ ادا کیا جس کی وجہ سے زرداری کی پارٹی برسر اقتدار آئی۔ زرداری نے امریکی نمائندوں سے کہا کہ وہ ان کی وجہ سے اقتدار میں ہیں اور وہ امریکیوں کی مشاورت کے بغیر کچھ نہیں کریں گے"۔
20 جون 2009ء کو امریکی سفیر پیٹرسن نے امریکا کی قومی سلامتی کے مشیر جنرل جیمز کے پاکستان کے دورے کے موقع پر ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا: "آپ زرداری کو امریکا کا حامی، شدت پسندوں کا مخالف اور امریکی حکومت کے ساتھ تعاون کا تاثر دینے والا پائیں گے۔ سویلین حکومت کے تمام امور زرداری خود چلاتے ہیں لیکن وہ ایک مقبول قائد نہیں ہیں، وہ خود جانتے ہیں کہ وہ ایک منتخب سیاستدان کی حیثیت سے کام کرنے کا کوئی تجربہ نہ رکھنے کے باوجود عہدے پر فائز ہوئے ہیں۔ زرداری سیکولر اور مغربی اقدار کے حامی ہیں اور تاثر دیتے ہیں کہ عالمی امور پر ان کا نکتۂ نظر امریکی سوچ کا عکاس ہے۔ ان کی یہی سوچ عوام میں ان کے خلاف جاتی ہے"۔

قارئین! اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان میں وکی لیکس کے انکشافات نے پاک فوج کے سربراہ جنرل کیانی اور فوج کے بارے میں قصداً اس پروپیگنڈے کا مقصد کیا ہے! جہاں تک جنرل کیانی کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی بات ہے تو اس کے بارے میں وکلاء تنظیم کے سربراہ اعتزاز احسن، مسلم لیگ (ن) کے سربراہ نواز شریف اور امریکی افواج کے سربراہ مائیک مولن کے اعترافات کے بعد این ڈبلیو پیٹرسن کے مراسلات کی سچائی کا بھانڈہ خود ہی پھوٹ جاتا ہے۔
30 اپریل 2010ء کو جنرل کیانی نے پاسنگ آؤٹ پریڈ میں تقریر کرتے ہوئے بھی یہ ایک واضح پیغام دیا تھا:
"پاکستان ایک جغرافیائی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک مسلّم نظریہ بھی ہے۔ یوں اس ارضِ پاک کی حفاظت نہ صرف ایک پیشہ وارانہ اور قومی ذمہ داری ہے بلکہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے۔ ماضی بعید کے معرکے ہوں یا موجودہ دور کے وسیع چیلنجز، پاک فوج مکمل یکسوئی، تیاری اور جذبہ حب الوطنی کے

ساتھ پاکستان کے دفاع کیلئے ہمیشہ سر بکف رہی ہے۔ میرا یقین ہے کہ سترہ کروڑ عوام پر مشتمل پاکستانی قوم جب فوج کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی ہو تو کوئی طاقت اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہزار شکر کہ ہم جاگ رہے ہیں اور ہمارے ساتھ پوری قوم بھی جاگ رہی ہے۔ پاکستان فوج نے ہمیشہ فرض کی پکار پر لبیک کہا ہے اور مستقبل میں ایسا کرنے کا عزم رکھتی ہے"۔

بروز منگل یکم محرم الحرام 1432ھ 7 دسمبر 2010ء

چپ ہوں تو تجھے ناداں سمجھ کر

قارئین! یقیناً آپ کو یاد ہو گا جب صدر زرداری صاحب نے حلف اٹھانے کے بعد ایوانِ صدر میں پہلا قدم رکھا تو اپنے ایک بیان میں انہوں نے پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کو اپنا دوست قرار دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہماری بھارت کے ساتھ کبھی کوئی دشمنی نہیں رہی اور ہم بھارت کے ساتھ میں نے اس آزادانہ تجارت کیلئے پاکستان کی تمام سرحدیں کھولنے کیلئے بھی تیار ہیں اور پاک بھارت کے درمیان ویزہ کی پابندی کو اٹھانے کو تیار ہیں۔ وقت بھی ان تحفظات کا اظہار کیا تھا کہ زرداری رجیم دراصل اندر سے پاکستانی افواج کو اب بھی اپنے اقتدار کیلئے خطرہ سمجھتے ہوئے ایسے اقدامات کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ کسی طرح ملک کی حفاظت کرنے والے سب سے بڑا ادارے کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ پاکستان کی حالت بھی بنگلہ دیش کی طرح ہو جائے کہ اب جس کے دفاع کی ذمہ داری بھارت کے کندھوں پر ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" نے ایک سازش کے تحت فروری 2008ء میں بنگلہ دیشی فوج بنگلہ رائفلز کے جونیئر آفیسرز کے ہاتھوں بغاوت کروا کے ایک میجر جنرل سمیت 56 سنیئر آفیسرز کو قتل کروا دیا تھا جس کے بعد جہاں بھارت بنگلہ دیش میں اپنی مرضی کی کٹھ پتلی حکومت لانے میں کامیاب ہو گیا وہاں اس نے بنگلہ دیش افواج کو بھی ہمیشہ کیلئے اپنے زیر نگیں کر لیا ہے۔

پاکستان نہ صرف ایک بہترین اور بہادر فوج رکھتا ہے بلکہ ایک مضبوط ایٹمی طاقت کا مالک بھی ہے۔ پاکستان کے دشمنوں کی شدید خواہش ہے کہ کسی طرح پہلی مسلمان ایٹمی ریاست کو اس کی جوہری طاقت سے محروم کر دیا جائے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان کو سب سے پہلے اس کے وفادار دوستوں سے محروم کر کے اس کو یکتا و تنہا کر دیا جائے تا کہ بنگلہ دیش کی طرح پاکستان بھی ایک باجگزار ریاست کی طرح اس خطے میں باقی رہے (خاکم بدہن)۔ یوں لگتا ہے کہ پاکستان کے دشمن اپنی چالوں میں کامیاب ہو رہے ہیں اور پاکستان کو یکتا و تنہا کرنے کا عمل بڑی سرعت کے ساتھ جاری و ساری کر دیا گیا ہے۔

آج تک پاکستان کی تاریخ میں کبھی ایسا سیاسی بھونچال نہیں آیا جو اب دیکھنے میں آ رہا ہے اور یوں لگتا ہے کہ موجودہ حکومت نے یہ ٹھان لی ہے کہ پاکستان دوست ممالک سے اپنے تعلقات کو اس طرح برباد کرنا ہے کہ پاکستان دنیا میں یکتا و تنہا ہو کر رہ جائے۔ سعودی عرب جس نے نہ کے تمام قریبی برادر صرف پاکستان کی عملی مدد کر کے اسے کئی مرتبہ دیوالیہ ہونے سے بچایا ہے بلکہ پاکستان پر جب بھی کوئی ناگہانی مصیبت آئی تو سعودی عرب نے پاکستان کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نہ صرف پاکستان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ مالی اعانت سے بھی پاکستان کی معیشت کو ڈوبنے سے بچایا ہے۔ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر نے وہ اوچھی حرکت کی ہے جس کی تلافی کیلئے ان کو عہدے سے فی الفور ہٹا کر ان کو خاطر خواہ سزا دینا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔

اس کی ابتداء بھی وکی لیکس کے ان مراسلوں سے ہوئی جس کا شہرہ اس وقت ساری دنیا میں ہے۔ وکی لیکس نے سعودی فرمانروا جناب شیخ عبداللہ خادم حرمین شریفین "متحدہ امارات کے سربراہ" برطانیہ کے سیاسی رہنماؤں اور امریکی سیاسی اور فوجی سربراہوں کے صدر آصف علی زرداری کے بارے میں

برادر ملک سعودی منسوب ان آراء کا ذکر کیا جس میں انہوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں پاکستان کے اہم ترین اور عزیز فرمانروا جناب عبداللہ خادم حرمین شریفین کے بارے میں پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر نے بغیر کسی تحقیق کے جو نازیبا اور شرمناک تحریری ریمارکس دیئے ہیں' اس کو پڑھ کر ہر پاکستانی خون کے آنسو رو رہا ہے اور یہ شک یقین میں تبدیل ہو رہا ہے کہ سلمان تاثیر وطن دشمن عناصر کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کی ساکھ کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وکی لیکس میں بعض ریمارکس نواز شریف کے بارے میں بھی آئے ہیں لیکن حکومتی سطح پر سلمان تاثیر نے اپنی نوکری پکی کرنے کیلئے صرف زرداری صاحب سے وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی نامعقول اور بے شرمی کے ساتھ جس رد عمل کا اظہار کیا ہے وہ انتہائی قابل مذمت ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے سربراہوں اور سیاسی رہنماؤں نے بھی آصف زرداری کے بارے میں کہیں شدید نفرت کا اظہار کیا ہے لیکن سلمان تاثیر نے شاہ عبداللہ ہی کو تنقید کیلئے کیوں چنا ہے اور ان پر ایسے رکیک حملے کئے ہیں؟ سلمان تاثیر نے یہ ریمارکس ٹوٹر پر اپنے خصوصی صفحہ پر سوموار 29 نومبر 2010ء کو اپنے مداحوں اور دوستوں کو ارسال کئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں شائد پہلی مرتبہ ایسی نازیبا زبان کسی پاکستانی عہدیدار کی طرف سے استعمال کی گئی ہے۔ سلمان تاثیر لکھتے ہیں:

Why should we be surprised that beacon of enlightened thinking king Abdullah criticized Przdnt zardari after molty coddling Nawaz & family. 29 Nov 07:49hrs

نواز اور ان کے خاندان کی ناز برداریوں کے بعد شاہ عبداللہ کی جانب سے صدر زرداری پر نکتہ چینی پر ہمیں کیوں حیرانگی ہو گی

The day the ageing king who want to bomb Iran & uses his pocked money 2 finance madrassas starts prasing u then I'd be worried. 29 Nov 08:06hrs

ایران پر بم گرانے کی آرزو رکھنے اور مدارس کو مالی تعاون فراہم کرنے والا بوڑھا شاہ جس دن آپ کی تعریف کرنا شروع کر دے گا اس دن مجھے تشویش ہو گی۔

BTW the Saudies being extreme wahabis hold the same negative opinions about BB Love of their life who they personally paid bns$ were Sharifs. 29 Nov 08:10hrs

سعودی راسخ العقیدہ وہابی ہیں اور بے نظیر کے خلاف بھی منفی رائے رکھتے تھے 'ان کو شریف خاندان سے انسیت ہے اور جن کو اربوں ڈالر دیئے گئے۔

As reactionary monarchists who allow no institutions 2 develop Saudis always take the "head" as the be all & end all of the system. Pathetic 29 Nov 08:14hrs

اور خود کو ہی اوّل و آخر سمجھتا ہے۔ دقیانوس بادشاہتی سوچ رکھنے والا سعودی عرب کسی بھی ادارے کو ارتقاء کی اجازت نہیں دیتا

جی ہاں یہ تمام ریمارکس گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے ہیں جو انہوں نے عالم اسلام کی سب سے ممتاز شخصیت جناب شاہ عبد اللہ کیلئے استعمال کئے ہیں اور جب ان سے ان ریمارکس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کسی تاسف کا اظہار کرنے کی بجائے نہ صرف اسے تسلیم کرتے ہوئے واپس لینے سے بھی انکار کر دیا بلکہ انتہائی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ " جو کہہ دیا سو کہہ دیا"۔

ہم سب اس بات سے باخبر ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستان کی موجودہ حکومت کے پچھلے ڈھائی سالوں سے سعودی عرب کے ساتھ تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں۔ نومبر 2008ء سے لیکر آج تک صدر زرداری، وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی یا کسی اعلیٰ سرکاری اعلیٰ عہدیدار نے سعودی عرب کا کوئی دورہ نہیں کیا اور نہ ہی جواب میں سعودی عرب سے کسی نے پاکستان کا رخ کیا ہے۔ کسی بھی ملک کی کامیاب خارجہ پالیسی ہمیشہ اس کے دوستوں میں اضافے سے پہچانی جاتی ہے اور جن ملکوں سے تعلقات خراب ہوں تو ان سے استوار کرنے کیلئے ایسا سیاسی طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے کہ کسی مشکل وقت میں ان ملکوں کی حمائت حاصل رہے کہ دنیا کے معاشی اور عسکری لحاظ سے طاقتور ممالک بھی دوستوں کی تعداد میں اضافے کیلئے دن رات کوشاں رہتے ہیں لیکن ان حالات کو درست کرنے کی بجائے سلمان تاثیر کے ان ریمارکس نے عالم اسلام میں ایک انتہائی ممتاز حیثیت کی حامل شخصیت کے بارے میں جس نفرت و کدورت کا اظہار کیا ہے اس سے لگتا یہ ہے کہ پاکستان کو اسلامی دنیا سے الگ تھلگ کرنے کی ایک سازش پر عمل ہو رہا ہے تاکہ پاکستان جو کہ پہلے ہی گوناگوں مصائب کا شکار ہے اسے مزید تنہا کر دیا جائے۔

سعودی عرب ایک ایسا انتہائی ممتاز ملک ہے جس کو عالم اسلام نہ صرف اپنا رہنما مانتے ہیں بلکہ شاہ عبد اللہ کی تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں ایسی قدر و منزلت ہے کہ ان کے قائدانہ رول کو تمام عالم اسلام تسلیم کرتا ہے۔ خود عالم عرب میں ان کو ایک شفیق باپ اور مربی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس وقت سعودی عرب میں لاکھوں کی تعداد میں پاکستانی کام کر رہے ہیں جو پاکستان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کا کام دے رہے ہیں۔ انہی اوور سیز پاکستانیوں کی طرف سے کمائے ہوئے اربوں ڈالر کے زر مبادلہ سے ملکی معیشت کا پہیہ چل رہا ہے۔ موجودہ حکمران تو ملکی دولت کو دونوں

ہاتھوں سے لوٹ کر غیر ملکی بینکوں میں محفوظ کر رہے ہیں لیکن سلمان تاثیر جیسے وطن فروش ملکی سلامتی کو خطرہ میں ڈال کر محض اپنی نوکری پکی کرنے کیلئے پاکستان کی تقدیر سے کھیل رہے ہیں۔

سعودی عرب سے پاکستان کی موجودہ حکومت کے شدید تناؤ کا وکی لیکس کے اس مراسلے سے بھی پتہ چلتا ہے جس میں سعودیہ میں پاکستانی سفیر کی امریکی سفیر کی گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ 26/اکتوبر 2009ء کو اپنے ایک مراسلے میں سعودی عرب سے امریکی سفیر جیمز اسمتھ پاکستانی سفیر عمر خان علی شیر زئی سے فاٹا آپریشن اور سعودی عرب سے پاکستان کے تعلقات کے بارے میں اپنی ملاقات کا احوال یوں تحریر کرتے ہیں:

20/اکتوبر 2009ء کو پاکستانی سفیر علی شیر زئی سے رسمی ملاقات ہوئی، انہوں نے پاکستانی قبائلی علاقوں میں کامیاب فوجی آپریشن کا ذکر کیا، پاک سعودی تعلقات میں تناؤ پر افسوس کا اظہار کیا اور علاقائی معاملات کے پاکستان پر اثرات کا ذکر کیا۔ جب ان سے سعودی عرب اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں استفسار کیا گیا تو علی شیر زئی نے اعتراف کیا کہ آصف علی زرداری کے منتخب ہونے کے بعد باہمی رابطوں میں تناؤ ہے۔ علی شیر زئی نے سعودی نظریے کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے کہا کہ سعودی عرب یہ سمجھتا ہے کہ زرداری ایران اور شیعہ کمیونٹی کے حامی ہیں۔ علی شیر زئی کے مطابق سعودی عرب کے سخت برتاؤ کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے صدر ایرانیوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی سعودی قیادت تک اچھی رسائی ہے اور وہ باہمی تعلقات میں بہتری کیلئے کام کرتے رہیں گے"۔

گویا پاکستانی سفیر بھی پاک سعودیہ تعلقات کی کشیدگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو گورنر پنجاب سے یہ دریافت کیا جانا چاہیے کہ وکی لیکس میں ان ریمارکس کا جواب دینا اگر مقصود ہے تو اس کا اختیار تو پاکستانی وزرات خارجہ کے پاس ہے پھر انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے پاکستان کے ایک انتہائی محترم دوست کے ساتھ تعلقات خراب کرنے کا جرم کس کے ایماء پر کیا۔ ان کی شخصیت پہلے ہی ان کے اعمال بد کی بناء پر انتہائی متنازعہ ہے اور انہوں نے میڈیا پر توہین رسالت کے قوانین کو ظالمانہ قرار دیتے ہوئے جس زبان درازی کا اظہار کیا ہے' اس پر پاکستانی قوم کے شدید تحفظات ہیں۔ اس لئے بہت ضروری ہو گیا ہے کہ نہ صرف سلمان تاثیر کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے بلکہ ان پر قومی سلامتی کو شدید نقصان پہنچانے کے جرم میں مقدمہ بھی چلایا جائے!

میں جو چپ ہوں تو تجھے ناداں سمجھ کر
نہ دکھا زباں درازی مجھے بے زباں سمجھ کر

بروز جمعرات 3 محرم الحرام 1432ھ 9 دسمبر 2010ء

بمبینو کا عذاب

پوری دنیا اس وقت جمہوریت کے سحر میں مبتلا ہے اور جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں کوئی بھی انہونی ہونی بن سکتی ہے۔ کوئی اندازہ کر سکتا تھا کہ پاکستان کی ساری سیاست آصف زرداری کے گرد گردش کرنے لگے گی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہو جائیں گے !اس وقت وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر ہیں۔ اس منصب کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنی شخصیت میں بھی تبدیلی لاتے 'اپنے قول و فعل کے تضاد کو دور کرنے کی کوشش کرتے اور اس منصب کے ساتھ وابستہ ملکی وقار کا بھی لحاظ رکھتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کو بھی کراچی کے بمبینو سینما کی طرح چلانا چاہتے ہیں جہاں اپنے کچھ خاص آدمیوں کے ذریعے فلم دکھانے کے نام پر تماشائیوں کو پہلے بلیک ٹکٹ فروخت کر کے اپنا کمیشن کھرا کر لیا جاتا تھا اور اسی سینما کے ایک حصے میں کیسینو جیسی خرافات کے ذریعے شہر کے بگڑے رئیس زادوں کو تفریح فراہم کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔

پھر زرداری صاحب اب تک کہہ کر مکر جانے کی سائیکی سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ ایوان صدر میں قدم رکھتے ہی اپنی کینچلی اتار پھینکتے اور ایک نئی شخصیت کے روپ میں اس منصب پر براجمان ہوتے۔ اب دیکھئے کہ صدارت کا حلف اٹھاتے ہی انہوں نے اعلان کیا کہ وہ سب سے پہلے عوامی جمہوریہ چین کے دورے پر جائیں گے ' اس سلسلے میں انہوں نے چین کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کے لگاؤ کا بھی ذکر کیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ بھٹو کے راستے پر چلیں گے جو چین کو پاکستان کا سچا اور کھرا دوست سمجھتے تھے۔ لیکن ابھی ایوان صدر کی راہداریوں میں اس اعلان کی گونج باقی تھی کہ وہ پہلے دبئی ' پھر برطانیہ چلے گئے ' اس کے بعد امریکا تشریف لے گئے جہاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ڈائس پر پہنچ کر چیونگم کو نکال کر اپنا منہ صاف کر کے اپنی اہلیہ بے نظیر بھٹو کی تصویر کو سجا کر اپنے خطاب کے دوران ملکی مسائل کو بیان کرنے کی بجائے اپنی اہلیہ کی تصویر سے باتیں کرتے رہے اور بعد میں اپنی وفاداری کا یقین دلانے کیلئے قصر سفید کے فرعون جارج بش کو شکریہ ادا کرنے وائٹ ہاؤس تشریف لے گئے جہاں پاکستان کے بارے میں نئی امریکی پالیسی کی حمایت کے لیے ان کے منتظر تھے۔ باخبر ذرائع کہتے ہیں کہ صدر زرداری نے دورۂ چین کا اعلان اپنے امریکا نواز ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کر دیا تھا 'جب انہیں معلوم ہوا تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ پاکستان امریکا کے مقابلے میں چین کو ترجیح دیتا! امریکا تو اس خطے میں سیاست ہی اس لیے کر رہا ہے کہ چین کو خطے سے بے دخل کر دیا جائے۔

ہمارے دوست کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ زرداری صاحب نے بغیر سوچے سمجھے چین کا نام لے دیا تھا اصل میں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کا کوئی قول قرآن و حدیث تو نہیں کہ اس سے پھرا نہ جا سکے۔ آخر ججوں کی بحالی کے معاملے میں وہ اپنے اس کمال کا بڑی مہارت سے مظاہرہ کرتے رہے ہیں اور مسلم لیگ (ن) کو اس بری طرح نظر انداز کیا ہے کہ وہ کان پکڑنے پر مجبور ہو گئی ہے اور بقول شیخ رشید ' نمک مرچ لگائے بغیر زرداری نے نواز شریف صاحب کو کھا لیا ہے اور انہیں پتہ بھی نہیں لگنے دیا۔

لیکن چین کا معاملہ مسلم لیگ (ن) سے مختلف ہے۔ وہ کوئی سیاسی جماعت نہیں، اس خطے کا سب سے بڑا اور سب سے اہم ملک ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ وہ پاکستان کا انتہائی قریبی اور معتمد ساتھی ہے۔ بے شک اس وقت ہم امریکا کی غلامی کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں اور امریکا کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن پاکستان کو اس صورت حال کا کب سامنا نہیں رہا؟ اس کے باوجود پاکستان نے چین کو اپنی ترجیحات میں سر فہرست رکھا اور کبھی یہ تاثر ہی نہیں ہونے دیا کہ چین کو نظر انداز کر کے امریکا سے پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ زرداری صاحب کا کمال یہ ہے۔ کہ انہوں نے صدر بنتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا ہے کہ چین کے مقابلے میں امریکا کو فوقیت دینے کا براہ راست مظاہرہ کر ڈالا ہے' اب اس مظاہرے کے جو نتائج بھی نکلیں ان کی بلا سے۔ سیاسی مبصرین اس بات سے آگاہ ہیں کہ باوجود زراری صاحب اس کے بعد کئی مرتبہ بن بلائے چین بھی گئے لیکن چین کی سرد مہری کا اب ہم سب کو اندازہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خطے میں چین کی اپنی مجبوریاں ہیں جس کی بناء پر پاکستان کے ساتھ اس کا عسکری تعاون جاری وساری ہے۔

زرداری صاحب نے جمعیت علماء اسلام کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے حضرت مولانا فضل الرحمان سے فوجی آپریشن بند کرنے کے علاوہ مذہبی امور اور دفاع کی وزارتیں دینے کی یقین دہانی بھی کروائی تھی لیکن جہاں تک زرداری صاحب کا تعلق ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ یہ وعدہ کوئی قرآن وحدیث تو نہیں جسے لازماً پورا کیا جائے۔ حضرت مولانا سے زیادہ قرآن وحدیث کی اہمیت کو اور کون جان سکتا ہے' اس لیے مولانا صاحب قرآن وحدیث کے مقابلے میں زرداری کے وعدے کو فروتر قرار دے کر نظر انداز کر گئے اور اپنے بھائی مولانا عطاالرحمان کیلئے وزارت سیاحت کو غنیمت جان کر دوسرے فوائد سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

زرداری صاحب نے اپنا منصب سنبھالنے کے بعد کشمیریوں کو بھی جلد خوشخبری دینے کا وعدہ کیا۔ ان کا یہ بیان بھی سیاسی نوعیت کا تھا۔ لیکن سب سے پہلے تو بھارت نے اس بیان کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے اس پر ردعمل ظاہر کرنا ضروری سمجھا اور صدر زرداری کو یہ باور کرایا کہ وہ تو مسئلہ کشمیر پر بات کرنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے پھر خوشخبری کیسی' رہے کشمیری' تو وہ زرداری صاحب کے بیان پر بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ سید علی گیلانی نے فوراً پوچھا کہ زرداری صاحب بتائیں وہ کیا خوشخبری دینا چاہتے ہیں؟ انہوں نے واضح کیا کہ حق خودارادیت سے ہٹ کر کوئی خوشخبری قابلِ قبول نہیں ہو گی۔ زرداری صاحب گیلانی صاحب کا جواب کیا دیتے' منافقت کی چادر اوڑھ کر لمبی تان کر سو گئے مگر کشمیریوں کو فوری پتہ چل گیا کہاں کی خوشخبری یہ تو صرف دل لگی تھی۔ "کسی کی جان گئی، ان کی دل لگی ٹھہری"

ہمارے دوست سچ کہتے ہیں کہ زرداری صاحب صدر بن گئے ہیں لیکن ابھی تک کہنہ مکرنیوں سے پیچھا چھڑا کر صحیح معنوں میں صدر نہیں بن سکے' سب سے اعلیٰ ریاستی منصب کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ کرپشن کے مقدمات گلے کی پھانس بن کر تعاقب کر رہے ہیں' اپنا زیادہ وقت انہی مقدمات سے خلاصی کیلئے صرف کر دیتے ہیں' نورتنوں کا ایک ٹولہ بابر اعوان کی معیت میں ہر وقت جوڑ توڑ کی سازشوں میں مصروف ہے۔ قوم مہنگائی اور کرپشن کی جس دلدل اور عذاب میں مبتلا ہے' اس کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔

روم کے زوال پر ایک معروف تاریخ دان نے کہا تھا "سلطنت روم میں اس وقت تک زوال نہ آیا جب تک اس حکومت میں دو فیصد تک افراد ایماندار تھے۔ تہذیب و تمدن کی تقریباً تین ہزار سالہ تاریخ میں قوموں کی عروج و زوال کی داستانیں کرپشن اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاریوں کے نقوش ہیں جو کھنڈرات کی شکل میں جابجا بکھرے ہیں۔ ابن خلدون نے کہا تھا" بدعنوانی' اخلاقی پستی اور احتسابی اداروں کی ناکامی سے تہذیبیں اندر ہی اندر سے ختم ہو جاتی ہیں۔ کرپشن کا آسیب پورے معاشرے کو آہستہ آہستہ لپیٹ میں لیکر احساسِ جرم ختم کر دیتا ہے"۔

مہ و غم رہے بزمِ شہریاراں میں نگاہ خلق ترستی رہی کرن کیلئے
تو کیا یہی غم جمہور کے تقاضے ہیں نظر اٹھا کہ دیکھے کوئی مرے کہ جئے

پاکستان کی خارجہ پالیسی جو بری طرح ناکام ہو چکی ہے اس کی طرف کسی کا کوئی دھیان ہی نہیں۔ پاکستانی شہریوں کی امن و سلامتی کی فکر کرنے کی بجائے جہازی سائز کی کابینہ کی حفاظت کو مکمل سیکیورٹی فراہم کرنے میں ملکی دولت کو بری طرح خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہر سال ملک میں پانچ سو ارب روپے کی کرپشن کی دہائی دی جا رہی ہے' ابھی حال ہی نے سپریم کورٹ نے رینٹل پاور زوالوں سے چوبیس گھنٹوں کے نوٹس پر سوا دو ارب روپے قومی خزانے میں واپس منگوائے ہیں لیکن کیا اس کرپشن میں ملوث کسی حکومتی فرد سے کوئی باز پرس ہوئی ہے؟ اس عید پر غربت کے ہاتھوں چار درجن افراد نے خودکشیاں کر لی ہیں جبکہ ایوان صدر کے یومیہ 28 لاکھ روپے اور وزیر اعظم ہاؤس کے یومیہ 22 لاکھ روپے کے خراجات میں کوئی کمی نہیں آئی! ان افراد کے قتل کی ایف آئی آر آخر کس کے نام پر کٹوائی جائے؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ بمبینو کا عذاب کب ختم ہو گا؟

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے حال سے واقف ہے!

بروز اتوار 6 محرم الحرام 1432ھ 12 دسمبر 2010ء

شہادت وخلافت

اسلامی سال کا آغاز ماہ محرم الحرام سے ہوتا ہے۔ امم سابقہ میں بھی اس کو ماہ معظم سمجھا جاتا تھا اور آج بھی ماہِ محرم کی عظمتوں سے کسی کو انکار نہیں اور خصوصاً یوم عاشورہ محرم کی دس تاریخ تو ملت اسلامیہ کا ناقابل فراموش دن ہے۔ گو اس کی وجہ تسمیہ میں علماء کا اختلاف ہے اور اس کی وہ مختلف توجیہات بھی بیان فرماتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے جو بزرگیاں دنوں کے اعتبار سے امت محمد ﷺ کو عطا کی ہیں اس میں یہ دن دسویں بزرگی کا ہے اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب انبیاء پر مختلف انعامات اسی دن فرمائے! اس حدیث سے یوم عاشورہ کی اہمیت قدرے واضح ہو جاتی ہے کہ:

سیدنا ابی عباس رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عاشورہ کے دن آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کو پیدا فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق بھی اسی دن فرمائی ، حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ بھی اسی دن باریاب ہوئی، اسی دن ان کو جنت میں داخل فرمایا گیا۔ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ حضرت ایوب بھی اسی دن پیدا ہوئے، اور ان کے بیٹے کا فدیہ قربانی بھی عاشورہ کے دن دیا گیا۔ فرعون کو بھی اسی دن دریائے نیل میں غرق کیا گیا اور علیہ السلام کی تکلیف بھی اسی دن دور فرمائی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش بھی یوم عاشور کو معاف فرمائی گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ لسلام ابن مریم کی ولادت بھی اسی دن ہوئی اور قیامت بھی یوم عاشورہ کے دن ہی واقع ہو گی (غنیۃ الطالبین)

لیکن پاک وہند اور چند اسلامی ممالک میں محرم الحرام کی ان تمام عظمتوں کے علاوہ اس کی وجہ تسمیہ شہادتِ حسین بھی ہے بلکہ اس عظیم واقعہ کی چھاپ ہماری اسلامی تاریخ پر اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے علاوہ اب عملاً ہمارے لئے کسی اور واقعے کی اتنی اہمیت ہی نہیں رہی اور نہ ہی ہم اس سے واقف نہ ہی اس کی ہیں۔ شہادت حسینحق کی ایسی تصویر کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کے مقابلے میں اس دن کی دوسری عظمتوں کا نہ تو ہم ذکر کرتے ہیں اور ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

اسلام کی روح یہ ہے کہ وہ ناحق اور باطل کے سامنے سر کٹادے لیکن ہر گز اس کو جھکنے نہ دے، اس عظیم عمل کو شہادت کہتے ہیں اور اس شہادت کی اعلیٰ ترین مثال اور تکمیل کا نام بلاشبہ ،، شہادتِ حسین ،، ہے جنہوں نے چھ ہزار کے لشکر کے سامنے عام روایت کے مطابق بہتر (72) مجاہدوں کے ساتھ ٹکر لی اور ان ظالم حکمرانوں کے سامنے سر جھکانے کی بجائے لڑ کر اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ یہی وہ کردار ہے جس کی بناء پر ہم یوم عاشورہ کی یاد مناتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے جھروکوں کو بغور دیکھیں تو ہمیں حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام دو مختلف قسم کے طریقہ کار کی علامت نظر آتے ہیں۔ ہمیں جہاں حضرت حسین سیاسی طریقہ کار کے علمبردار نظر آتے ہیں وہاں حضرت حسن غیر سیاسی طریقہ کار کی حکمت کے مینار دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت حسین نے حاکم وقت کے ساتھ جنگ کر کے جو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی وہاں یہی مقاصد حضرت حسن نے جنگ کے میدان سے واپسی کے ذریعے حاصل کئے۔ اس اہم اور لطیف فرق کو سمجھنے کیلئے ہمیں تاریخ کی اس تصویر کے ہر پہلو کو بڑی ایمانداری سے دیکھنا ہو گا اور ان تاریخی واقعات کو سامنے رکھ کر ان عظمتوں کی مینارۂ ہدائت کو اپنی قوموں کی زندگی کیلئے مشعلِ راہ بنانا ہو گا۔

تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مکہ میں قدیم زمانے سے قریش کے دو خاندان بنو ہاشم اور بنو امیہ آباد تھے اور ان میں خاندانی رقابت بھی چلی آرہی تھی۔ لیکن جب بنو ہاشم کے ایک فرزند نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مخالفت میں بنو امیہ سب سے آگے تھے۔ لیکن فتح مکہ (8ھ) کے بعد عرب کے دوسرے قبائل کی طرح بنو امیہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور عہد رسالت میں اور خلافتِ راشدہ میں بنو امیہ کے لائق افراد نے مختلف اسلامی عہدے بھی حاصل کئے جس کی ایک درخشاں مثال حضرت عثمان ابی عفان ہیں۔ اس دور میں (25ھ تا35ھ) میں بنو امیہ کا اثر ورسوخ تمام دوسرے قبائل سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ اس کے بعد جب حضرت علی ابن طالب کا انتخاب بطور امیر المومنین ہوا تو اس وقت بنو امیہ نے محض شہادت عثمانؓ کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر پہلے ہاشمی خلیفہ کے خلاف پرانی رقابت کو از سر نو زندہ کر دیا جس کی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا پورا زمانہ خلافت (35ھ تا40ھ) باہمی خانہ جنگیوں اور شورش میں گزرا، اور آخر اس کی انتہاء ایک جنونی عبد الرحمان ملجم کے ہاتھوں شہادت کے ذریعے ہوئی۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد آپ کے لختِ جگر حضرت حسن کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ صرف عراق اور خراسان کی خلافت امام حسن کے حصے میں آئی جبکہ شام، فلسطین، یمن، حجاز اور مصر وغیرہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے زیر قبضہ تھے جنہوں نے خونِ عثمان کے مسئلے کی بناء پر حضرت علی کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بھلا اب حضرت امام حسن کو خلیفہ کیسے تسلیم کر لیتے ۔ ربیع الاوّل ٤١ھ کو صورتحال اس نوبت کو آن پہنچی کہ امام حسن کے ساتھ چالیس ہزار سے زائد مسلح افراد تھے اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے جھنڈے تلے ساٹھ ہزار کا لشکر مرنے مارنے کیلئے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ یہاں پر حضرت امام حسن کا وہ تاریخی، غیر سیاسی کردار سامنے نظر آتا ہے جس کے متعلق عام قاری تو کجا ہمارے دانشور اور علماء حضرات بھی بے خبر نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امام حسن کا یہ عظیم کردار لوگوں کے سامنے ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آسکا جس طرح امام حسین کی شہادت کا واقعہ ہے۔

حضرت حسن نے اپنے والد کے پانچ سالہ خلافت کے پر آشوب زمانے میں مسلمانوں کو خود بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوتے دیکھا تھا اس لئے باہمی خون خرابہ اور نہ ختم ہونے والے سلسلے کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کیلئے خود میدان سے ہٹ گئے اور خلافت کا عہدہ حضرت امیر معاویہ کے حوالے کر دیا، اگرچہ حضرت حسن حق پر تھے اور امت کے جائز خلیفہ تھے۔

اس کے بعد دو عشرے (41ھ تا60ھ) تک حالات پر سکون رہے اور اسلامی سلطنت کی سرحدوں میں بھی خاصی توسیع ہوئی۔ امیر معاویہ کے انتقال (رجب60ھ) تک حالات بڑے پر سکون رہے لیکن جب خلافت کا مسئلہ دوبارہ کھڑا ہوا تو امام حسین جو اپنے باپ کی شہادت اور بھائی کی خلافت سے دستبرداری سے خوش نہ تھے، انہوں نے یزید کی خلافت سے اسی طرح انکار کیا جس طرح اس سے پہلے حضرت معاویہ نے ان کے والد محترم حضرت علی کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہیں سے امام حسین (4ھ تا61ھ) کا وہ کردار شروع ہوتا ہے جس کی یاد اب یوم عاشورہ کو منائی جاتی ہے۔

عتبہ بن ابی سفیان نے جب مدینے میں یزید بن معاویہ کیلئے لوگوں سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا تو امام حسین نے معذوری کا اظہار کر دیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو لیکر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کی آمد سے قبل مکہ کے لوگ عبداللہ بن زبیر پر بیعت کر چکے تھے اور یہ صورتحال حضرت حسین کو قابل قبول نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حسین اور آپ کے اہل خانہ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جو عملاً اس وقت مکہ کے حاکم تھے۔ شہادت حضرت عثمان کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیلئے مکہ و مدینہ کے حالات سازگار نہیں تھے جس کی بناء پر اسلامی ریاست کا دارلخلافہ ۳۶ھ میں مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا تھا۔ اس طرح امام حسن نے بھی خلافت سے دستبرداری کے بعد 41ھ میں کوفہ کو خیر باد کہہ دیا تھا اور مدینہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ اب جب یزید کو خلافت ملی تو اہل کوفہ کی محبت اہل بیت کیلئے جوش میں آئی اور انہوں نے خطوط کے ذریعے امام حسین کو خلافت کیلئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ امام حسن اہل کوفہ کی نفسیات اور صورتحال کی نزاکت کو اچھی طرح جان چکے تھے، اسی لئے اپنے بھائی کو وصیت میں اہل کوفہ کے بارے میں اپنی آراء سے آگاہ کر چکے تھے کہ:

"کوفہ والوں کے فریب میں مت آنا اور میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ نبوت اور خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں ہو سکتیں اس لئے تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملے میں خاموش رہو"۔

لیکن حضرت حسین اپنے لئے ایک کردار کا انتخاب کر چکے تھے وہ تھا،، خلافت منہاج نبوت کا تحفظ،، اور اس ادارے کے انہدام سے اہل اسلام کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس سے بھی امت مسلمہ کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کے سامنے شہادتِ عثمان کا واقعہ رونما ہوا، ان شورشوں نے حضرت حسین کے اعصاب پر بھی بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف فتنوں نے پہلے اموی خلیفہ کے زمانے میں قصرِ خلافت کو بری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ حضرت عثمان نے بھی مسلمانوں کو باہم خانہ جنگی سے بچانے کیلئے اپنی جان قربان کر دی حالانکہ اس وقت مدینے کے وفادار مسلمانوں کی جماعت آپ کے مکان پر موجود تھی اور بنو ہاشم کی تو ایک بڑی جماعت ان کی معاون و مددگار بھی تھی لیکن حضرت عثمان نے ان سب کو قسم دلا کر اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ سے روک رکھا تھا اور اپنے گھر بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے رہے۔ دراصل وہ بھی شریعت کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے کہ:

"اپنی طرف سے جارحیت کا آغاز بندۂ مومن کیلئے کسی طور پر بھی جائز نہیں کہ مسلمان دعوت و نصیحت کے ذریعے کوئی خیر کی راہ نکالتا ہے نہ کہ قتال کا راستہ اختیار کر کے، اس کے بعد اگر دوسروں کی طرف سے جارحیت کا آغاز ہو تو دو صورتیں ہیں، جارحیت کا آغاز اگر کفار کی طرف سے ہو تو پھر بھی مخصوص شرائط کے تحت اس کے دفاع کا حکم ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" (سورۃ بقرہ۔190)

لیکن اگر جارحیت کا آغاز اگر مسلمان کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ دفاع کے طور پر بھی اپنے دینی بھائی پر وار نہ کیا جائے۔"

لَئِن بَسَطتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ

اور اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر ہاتھ چلائے گا تو میں تجھ کو قتل کرنے کے لئے تجھ پر ہاتھ نہیں چلاؤں گا مجھے تو خدائے رب العالمین سے ڈر لگتا ہے،،(سورۃ المائدہ۔28)

ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے آنے والے فتنے سے جب ڈرایا تو لوگوں نے پوچھا کہ ہم کو آپ ﷺ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اس میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالو، اپنی تانت کو کاٹ ڈالو، اپنی تلواروں کو پتھر پر پٹک دو، اپنے گھروں کے اندر بیٹھے رہو، اگر تم کو مارنے کیلئے کوئی تمہارے گھر میں گھس آئے تو تم آدم علیہ السلام کے دو لڑکوں میں سے بہتر لڑکا بنو، قتل ہو جاؤ مگر قتل نہ کرو"۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے اصول شریعت کی اتنی بڑی عملی مثال قائم کر دی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بہتر بیٹا بن گئے لیکن حضرت امام حسین کے سامنے اس عظیم المرتبت کارنامے کے بعد آنے والے واقعات نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی کہ اگر حضرت عثمان ،، خلافت علیٰ منہاج نبوت،، کا دفاع کرتے (اور اس ادارہ خلافت کی حفاظت کی خاطر چند ہزار انسان مار دیئے جاتے تو یقیناً خلافت کا ادارہ انتشار اور انار کی سے محفوظ رہتا اور حضرت علی جو ساری توانائیوں کے باوجود اپنے دور خلافت کے پانچ سال ان شورشوں اور باہنی جنگ و جدل پر قابو نہ پا سکے اور بالآخر ان منہ زور فتنوں نے ان کی جان لے لی) تو آج خلافت کیلئے مسلمانوں میں آپس میں ایسی خونریزی نہ ہوتی اور تاریخ اسلام میں جنگ جمل اور جنگ صفین اور بعد کے سانحات کیلئے کوئی جگہ نہ ہوتی۔

اسی طرح حضرت حسن کو مسلمانوں نے اپنی آزاد مرضی سے بلا جبر و اکراہ خلیفہ مقرر کیا تھا، وہ نہ صرف برحق خلیفہ تھے بلکہ ان کی خلافت بھی منہاج نبوت پر قائم تھی، ان کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہ کا دعویٰ خلافت ویسا ہی بلا جواز تھا جیسا حضرت علی کے مقابلے میں، کیونکہ خلیفہ کے انتخابات اور تقرر کا اختیار اہل شوریٰ یعنی اہل حجاز کے جلیل القدر صحابہ رضوان علیہم کو حاصل تھا۔ حضرت امیر معاویہ کا شمار طلقاء میں تھا، اس لئے طلقاء کو خلافت کے تقرر میں کوئی عمل دخل حاصل نہ تھا۔ حضرت معاویہ کا حضرت علی کے خلاف محاذ آرائی، تصادم، اطاعت سے انکار اور بغاوت کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ مرکزی حکومت میں بطور ماتحت خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کا شوریٰ سے کوئی تعلق نہ تھا، اس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی خلیفہ برحق تھے۔ وہ خلافت کے ادارے کے محافظ تھے۔ اس ادارے کے تحفظ اور دفاع کیلئے جو جنگیں لڑیں ان میں حضرت علی حق پر تھے، اور ان جنگوں کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوا اس کی بھی ذمہ داری حضرت علی پر ہرگز عائد نہیں ہوتی۔

حضرت حسین کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ حضرت معاویہ کے اس طرزِ عمل نے حضرت حسن کو بھی اسی دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جہاں وہ آج ہیں، یا تو وہ حضرت حسن نے امن پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے خلافت کے ادارے کا تحفظ فرماتے یا مسلمانوں کو خانہ جنگی کے منہ زور فتنے سے بچالیں۔ مسلمانوں کو تو خانہ جنگی سے بچالیا لیکن انہیں "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کے انہدام کا صدمہ یقیناً برداشت کرنا پڑا۔ اس حکمت عملی نے امت سے بڑی بعد میں حضرت حسین اور اہل حجاز کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ حضرت حسین نے اپنے والد گرامی حضرت علی کو بھی خلافت بھاری قیمت وصول کی اور ہوتے دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت حسن نے ان تمام حالات کا عملی مشاہدہ کرتے ہوئے اپنے لئے کے ادارے کی حفاظت کی خاطر شہید غیر سیاسی طریق کار کا انتخاب کیا، اس پر نہ صرف عمل کیا بلکہ اپنے بھائی کو بھی اس کی وصیت کی لیکن حضرت حسین نے اپنے لئے سیاسی طریق کار کا راستہ منتخب کر کے اپنے والد حضرت علی کی سنت پر عمل کیا۔

یہاں امام حسن کے غیر سیاسی طریق کار کی وضاحت از حد ضروری ہے۔ اس کیلئے پہلے ہمیں مستند احادیث اور اسلامی تاریخ کی بے شمار مستند کتابوں سے مدد لینا ہو گی۔ یزید کے مقابلے میں جو صورتحال حضرت حسین کو پیش آئی اس سے کہیں زیادہ مشکل حضرت حسن کو حضرت معاویہ کے مقابلے میں پیش آچکی تھی مگر آپ نے اس سے مختلف رد عمل کا اظہار کیا جس کا نمونہ ہمیں حضرت حسین کے آخری خطبہ سے بھی ملتا ہے جہاں حضرت حسین نے بھی جنگ و جدل سے بچنے کیلئے تین شرائط پیش کی تھیں۔ (طبری جلد 4 صفحہ 313)

احادیث کی کتب میں حسنین کے بارے میں بہت سے روائتیں ملتی ہیں جن میں حضرت حسین کیلئے زیادہ تر ،، محبت ،، کا ذکر ہے جو نواسہ ہونے کی حیثیت سے آپ کیلئے بالکل فطری ہے اور دوسری طرف امام حسن کے بارے میں جو روایات نہ صرف سنداً زیادہ قوی ہیں بلکہ فطری محبت سے آگے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت انسبن مالک فرماتے ہیں کہ: حسن بن علی سے زیادہ کوئی شخص نبی اکرم ﷺ سے مشابہ نہ تھا،،۔ طبعی مشابہت کے علاوہ یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ صحیح روایات میں امام حسین کیلئے کوئی پیشگی کردار کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور دوسری طرف یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے امام حسن کے بارے میں ایک عظیم کردار کرنے کی پیشین گوئی ارشاد فرمائی تھی۔

حضرت ابو بکر صدیق فرماتے ہیں کہ ،، میں نے رسول اکرم ﷺ کو منبر پر دیکھا جہاں حسن بن علی آپ کے پہلو میں تھے۔ ایک بار آپ رسول اکرم ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور دوسری بار ان کی طرف، اور فرماتے تھے یہ میرا لڑکا ہے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروا دے۔ (بخاری)

رسول کریم ﷺ کی یہ پیش گوئی امام حسن کی زندگی میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ حضرت امام حسن کی بیعت ۴۰ ھ میں اس حال میں ہوئی کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی رقابت عروج پر تھی، نہ تو یہ ایک دوسرے کو ختم کر سکے تھے اور نہ ہی ہار ماننے کو تیار تھے۔ حضرت حسن نے جب بیعت لی تو آپ نے لوگوں سے یہ اقرار بھی لیا کہ ،، میں جس سے جنگ کروں گا تم اس سے جنگ کرو گے، جس سے میں صلح کروں گا تم اس سے صلح کرو گے ،،۔ اب حضرت حسن کی خلافت گویا حضرت معاویہ کیلئے نیا چیلنج تھی۔ اس کے مقابلے کیلئے میدان میں جہاں

حضرت معاویہ کا ساٹھ ہزار کا لشکر دمشق سے چلتا مدائن کے میدان میں پہنچا تھا وہاں امام حسن بھی اتنی ہی قوت کا لشکر کوفہ سے لیکر مقابلے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ گویا پہاڑوں کا لشکر آمنے سامنے تھا بلکہ امام حسن کے سپاہی تو حضرت علی کے ہاتھ پر موت کی بیعت بھی کر چکے تھے اور لڑنے مرنے سے کم کسی چیز پر بالکل آمادہ نہ تھے۔

مدائن کے میدان میں معاویہ بن سفیان نے امام حسن بن علی کو یہ پیغام بھیجا کہ،، جنگ سے بہتر صلح ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ مجھے خلیفہ تسلیم کرلیں اور میرے ہاتھ پر بیعت کرلیں،،۔ امام حسن نے غور و فکر کے بعد اس پیشکش کو منظور فرمالیا اور خلافت امیر معاویہ کے سپرد کر دی حالانکہ امام حسن کے پرجوش حامیوں کو یہ،، بات،، قبول نہ تھی۔ آپ نے ایک تاریخی فقرے میں اپنا جواب دیا:
"خلافت اگر معاویہ کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا، اگر میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا"۔
اس صلح کے بعد حضرت امیر معاویہ نے حضرت امام حسن کیلئے ایک لاکھ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا (حافظ ذہبی 1 لعبر جلد ۱ صفحہ 48)

اس طرح امام حسن کے پیچھے ہٹ جانے سے مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اتفاق میں تبدیل ہو گیا اور مدائن کا میدان اسلامی تاریخ میں جمل و صفین کے بعد تیسری خونریزی کے عنوان سے بچ گیا اور مسلمانوں کی وہ قوت جو خلیفہ ثالث کے زمانے سے باہمی جنگ و جدل میں مصروف تھی اور جن کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا، اب دوبارہ اسلامی فتوحات کی خبریں بہم پہنچا رہا تھا اور اسلام کی اشاعت و توسیع جو ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے رک گئی تھی، اس کا بھی بند دروازہ جس نے کھولا وہ حضرت امام حسنؓ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیچھے ہٹنا سب سے بڑی بہادری ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس بہادری کیلئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں، بظاہر تو یہ میدان سے واپسی کا فیصلہ تھا، اس سے مسلمانوں کی قوت باہم مقابلہ آرائی سے بچ گئی اور اسی طاقت نے مسلمانوں کی فتوحات کا خارجی میدان میں سکہ بٹھا دیا۔ اگر اس وقت حضرت امام حسن خلافت پر اصرار کرتے تو عجب نہیں مسلمان پہلی صدی ہجری میں آپس کی خانہ جنگیوں میں برباد ہو جاتے اور اسلام جو آج ایک عالمگیر مذہب چین سے لیکر مراکش تک اپنی برکات سے ہمیں فیض یاب کر رہا ہے اس کی شکل کچھ اور ہوتی تو گویا غیر سرکاری طریق کار سے اختلاف کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ بعد کے حالات نے حضرت حسن کے اس کردار کو بلاشبہ امت محمدیہ ﷺ پر ایک گراں قدر احسان ثابت کیا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ حضرت حسین کے کردار پر نگاہ ڈالیں تو ان کے بھی طریق کار کو ایسی تقویت ملتی ہے کہ جس نے "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کے تحفظ، دفاع اور اس کے احیاء کیلئے قربانیوں کی ایک ایسی پرعزم تاریخ رقم کی ہے جو قیامت تک مظلوموں کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔

حضرت امام حسین نے خلافت کے ادارے کو بچانے کیلئے کوفہ کے لوگوں کے سخت اصرار پر اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا، گو حضرت مسلم بن عقیل اس منصوبے سے متفق نہ تھے تاہم حضرت حسین کے اصرار پر کوفہ چلے گئے۔ تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً اٹھارہ ہزار آدمی نیابتاً ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے تھے لیکن جب یزید کے حکم پر عبید اللہ بن زیاد نے حضرت مسلم بن عقیل اور ان کے کوفی میزبان ہانی بن عروہ کو محل کی چھت پر کھڑا کر کے قتل کر دیا تو کوفہ والوں کو گویا یزید کا پہلا پیغام تھا کہ حضرت حسین کی بیعت کی قیمت کیا ہو گی۔ اسی

وقت کوفہ والے خاموش اپنے گھروں میں دبک گئے اور حضرت حسین جو کہ ان بے وفالوگوں کی قیادت کیلئے آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکے تھے ،اپنے سفر سے بالکل واپس نہ لوٹے حالانکہ مکے میں تمام جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہ اجمعین نے ان کو اس سفر سے منع کیا تھا۔عبد اللہ بن عمر ،عبد اللہ بن عباس، عمرو بن سعد بن العاص، عبد الرحمٰن بن حارث اور مکہ کے دوسرے بزرگوں نے شدت سے حضرت حسین کو منع فرمایا بلکہ حضرت عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ آپ کوفہ جانے کی بجائے مکہ کی حکومت قبول فرمائیں، آپ ہاتھ بڑھائیں میں سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں ۔عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب نے مدینہ سے خط لکھ کر بااصرار منع کیا لیکن حضرت امام حسین کی اولوالعزم طبیعت اس پر کسی طور راضی نہ ہوئی، حتیٰ کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس کی اس آخری بات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ عورتوں اور بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر سفر کریں یا کم از کم حج کے بعد روانہ ہوں جس میں صرف چند دن باقی ہیں۔

امام حسین ذوالحج 60ھ کے پہلے ہفتے میں کوفہ کے راستے میں حضرت عبد اللہ بن مطیہ سے جب ملے تو انہوں نے بصد احترام حضرت امام حسین سے کہا:"میں آپ کو قسم دلاتا ہوں کہ آپ واپس مکہ تشریف لے جائیں،اگر آپ بنو امیہ سے خلافت چھیننے کی کوشش کریں گے تو وہ ضرور آپ کو قتل کر ڈالیں گے اور پھر ہر ایک ہاشمی ہر ایک عرب اور ہر ایک مسلمان کے قتل پر دلیر ہو جائیں گے،،۔لیکن حضرت امام حسین نے واضح الفاظ میں اپنے رفقاء کو بتادیا تھا کہ ان کے پیش نظر،، خلافت علیٰ منہاج نبوت،، کے احیاء کے سوا کچھ نہیں۔اسلامی نظام اطاعت میں خلافت کی جو اہمیت ہے اس سے حضرت حسین پوری طرح باخبر تھے۔اسلامی نظام اطاعت کے استحکام کیلئے اولی الامر کے ادارہ کو جس انداز میں رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے قائم فرمایا تھا،اس کے تحفظ اور دفاع کیلئے حضور اکرم ﷺ نے جو تاکید فرمائی تھی وہ بھی حضرت حسین کے علم میں تھی۔معاویہ بن ابی سفیان کے مقرر کردہ خلیفہ یزید بن معاویہ نے اس ادارہ کی تعظیم اور تقدس کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔اس ادارہ کے انہدام سے اسلامی معاشرہ کو دینی اور سیاسی نقصان جو پہنچ رہا تھا اس کو دیکھ کر حضرت حسین جیسی شخصیت کا بیٹھ جانا بڑا مشکل تھا۔

تاہم آخر وقت میں کربلا کے میدان میں حضرت حسین کو صورتحال کا اندازہ ہو گیا تھا۔حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت، کوفہ کے لوگوں کی بے وفائی ،یزید کے لشکر جرار کے مقابلے میں آپ کا مختصر قافلہ بظاہر پہاڑ اور چیونٹی کا مقابلہ لیکن حضرت حسین نہائت بہادر، جرأت مند اور انتہائی شریف النفس تھے۔وہ موت سے بالکل خوفزدہ نہیں تھے مگر اپنے ساتھ نیز عورتوں اور بچوں کیلئے اپنے دل میں جذبہ رحم کی پیدائش کو روکنا ان کیلئے ممکن نہ تھا چنانچہ آخری دن محرم الحرام کی دس تاریخ 61ھ کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کے سامنے جو تقریر فرمائی وہ فصاحت وبلاغت کا بے نظیر شاہکار ہے ۔آپ نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

"عیسیٰ کا گدھا اگر باقی ہوتا تو تمام عیسائی قوم قیامت تک اس کی پرورش کرتی، تم کیسے مسلمان اور امتی ہو کہ نبی ﷺ کے نواسے کو قتل کرنا چاہتے ہو"!

دراصل کوئی دوسری قسم کا مسئلہ ہوتا تو کوفی مسلمان شائد عیسائیوں سے چار ہاتھ آگے ہوتے لیکن یہاں یزید کے لشکر کے سامنے نواسہ رسول ﷺ ان کے سیاسی حریف کے طور پر کھڑے تھے اور سیاسی حریف کو نہ مسلمان بخشتے کو تیار ہوتے ہیں نہ عیسائی۔وہی یزید جس نے 64ھ میں مدینہ پر چڑھائی کی تھی اس نے مسلم بن عتبہ کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ حضرت امام حسین کے صاحبزادے حضرت زین العابدین کا پورا پورا خیال رکھنا کیونکہ وہ مدینے میں سیاسی زندگی سے الگ ہو کر مدینہ کے نواح میں الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے کیونکہ یزید نے اپنے باپ سے سیاست کا ایک اصول ورثے میں

جو لیا تھا اس پر بڑی سختی سے کاربند تھا: "میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں"۔ (ابن تاثیر کامل جلد 4 صفحہ 5)

چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ آخر وقت میں حضرت حسین یزید سے صلح کیلئے راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے یزید کے نمائندے عبید اللہ بن زیاد کے سامنے تجاویز پیش کیں:

1۔ میں مکہ واپس چلا جاؤں اور وہاں خاموشی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاؤں۔

2۔ مجھے کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو کہ وہاں کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔

حضرت حسین کے رویے میں تبدیلی سے یزید کی فوجوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اگرچہ کربلا کے میدان میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھے ،اس کے باوجود نواسہ رسول کے احترام کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف کے لوگ مل کر نماز ادا کرتے تھے اور اکثر حضرت حسین ہی کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کے پاس جب یہ پیغام پہنچا تو وہ بھی بغیر لڑائی کے اس عمدہ حل پر بہت خوش ہوا لیکن اس کا مشیر شمر ذی الجوشن جو کہ حضرت حسین کا پھوپھا اور انتہائی بری طبیعت کا مالک تھا، اس نے عین وقت پر عبید اللہ بن زیاد کا ذہن پھیر دیا۔ اس نے حضرت حسین کے لوٹنے کے سارے راستے بند کر دیئے اور بالآخر کربلا کا وہ معرکہ جس میں عمرو بن سعد نے پہل کر کے حضرت حسین کے قافلے پر پہلا تیر پھینک کر اس کا آغاز کیا تھا جس کا انجام حضرت حسین کی شہادت پر منتج ہوا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ عمرو بن سعد حضرت حسین کا رشتے میں ماموں اور شمر ذی الجوشن پھوپھا تھا۔

تاریخ کے ان دو کرداروں پر ملت اسلامیہ قیامت تک جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ گو حضرت حسین نے بھی آخری وقت میں حضرت حسن کے غیر سیاسی طریقہ کار کو بھی عمل میں لانے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ کو حضرت حسین سے ،، خلافت علیٰ منہاج نبوت ،، کے تحفظ اور دفاع کا کام لیکر ان سے بے مثال قربانی لینا مقصود تھی اور ان کی شہادت سے امت مسلمہ تک یہ پیغام پہنچانا مقصود تھا کہ حالات کیسے ہی پر آشوب اور دگر گوں ہوں، اسلامی نظام حکومت، اسلامی نظام اطاعت کے قیام و نفوذ جو کہ ایمان کے اوّلین تقاضوں میں سرفہرست ہیں کی کوشش ہر وقت، ہر زمانے میں جاری رکھنی چاہئے جب تک خلافت کے ادارہ کو مکمل اس کی اصلی شکل میں بحال نہ کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی ان کرداروں میں بے شمار دوسرے اسباق ہمارے لئے موجود ہیں، صرف شرط یہ ہے کہ ہم خود مخلص ہوں۔

خوشا وہ آبلہ پا کارواں اہل جنوں
لٹا گیا وہ بہاروں پہ اپنی سرخی خوں

بروز منگل 8 محرم الحرام 1432ھ 14 دسمبر 2010ء

سفر شہادت

محترمی برادران کشمیر!
اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابھی رہبر اخبار کے توسط سے آپ کے بیٹوں "ارشد بشیر، وسیم راجہ اور ظہور احمد" کی شہادت کی خبر ملی کہ ایک دفعہ پھر سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں نام نہاد دہشت گردی کا الزام لگا کر ان نونہالوں کو خون آشام وادی میں موت کے گھاٹ اتار کر فورسز کے ان افراد کو ترقی سے نوازنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے لختِ جگر اس فانی دنیا سے دار بقاء کی طرف تشریف لے گئے ہیں، اس عارضی زندگی کی بہاروں اور گلوں کی خوشبوؤں سے منہ موڑ کر دائمی بہار، سدا خوشبوؤں و مہک کے گلستانوں میں براجمان ہو گئے ہیں اور اپنے ہر تعلق رکھنے والوں کو چھوڑ کر اپنے مولا کے ساتھ مضبوط تعلق کا رشتہ جوڑ چکے ہیں۔

برادران! موت تو کوئی نئی چیز نہیں۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ کوئی ولی۔ جو بھی آیا ہے اپنا مقررہ وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ ہم سب اس کی امانت ہیں، پھر کس کی مجال جو اس میں خیانت کر سکے۔ کسی کا اس بھری جوانی میں اس طرح حالتِ ایمان اور راہِ خدا میں قربان ہو جانا اس کے حق میں بڑی نعمت ہے اور پھر کیوں نہ ہو، ایسی موت تو وصل حبیب اور بقائے حبیب کا خوبصورت سبب اور حسین ذریعہ ہے اور پھر بقائے حبیب سے بڑھ کر اور نعمت کیا ہو گی!

انتہائی واجب الاحترام! اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے یقیناً ایک دن جانا ہے اور اس دنیا میں آنا ہی درحقیقت جانے کی تمہید ہے مگر بعض جانے والے اپنے ماں باپ، لواحقین اور اہل وطن کیلئے ایسی دولت اور فخر وانبساط کی ایسی وراثت چھوڑ جاتے ہیں کہ جس کے آگے خزائن و حشم سے مالا مال شہنشاہ بھی سو فقیروں کے فقیر اور سو کنگالوں کے کنگال لگتے ہیں۔

آپ اہل کشمیر کے باسی اپنی اولادوں کے قلب و ذہن کے اندر پچھلی کئی دہائیوں سے عملِ خیر کا بیج بو چکے ہیں، اس بیج پر مشیت کی برسائی ہوئی برسات نے بالآخر کس طرح عمل خیر کی لہلہاتی ہوئی کھیتی اگا دی ہے اس کا واضح ثبوت ہر شہر اور گاؤں کے شہداء کے قبرستان گواہی دے رہے ہیں۔ اگر اس فصل کی تقسیم شروع کر دی جائے تو سب کو ہی اپنا دامن تنگ نظر آئے گا۔ ان شہداء کے قبرستانوں میں آرام کرنے والے نوجوانوں نے اپنے خونِ دل اور جان سے پائے رسولؐ کے نقوش کو ایسا اجاگر کیا ہے کہ ہر کسی کو اب اپنی منزل آسان دکھائی دے رہی ہے۔ ان عظیم شہداء کو بغیر کسی قصور و گناہ اور کوئی جرم بتائے بغیر گولیوں کی بوچھاڑ کے سپرد کر کے دراصل مجرموں نے ایک مرتبہ پھر ایسے قبیح فعل کا ارتکاب کیا ہے جس کی سزا سے تو وہ یقیناً بچ نہیں پائیں گے لیکن ان نوجوانوں کی للہیت، اخلاص نیت اور بے لوث ادائے فرض نے ایک ہی جست میں تمام فاصلے عبور کر لئے ہیں جس کی

تمنا انبیائ، اصحابہ اور صالحین نے ہمیشہ کی۔ ان عظیم نوجوانوں کی یاد اب تا قیامت تک کفر کے تاریک جزیروں پر ایمانی قوت کے ساتھ کڑکتی اور کوندتی رہے گی۔

ان نوجوانوں کی شہادت نے جہاں اور بے شمار باتوں کا سبق یاد دلایا ہے وہاں ایک یہ بات بھی ہمارے ذہن نشین کروائی ہے کہ عالمِ اسباب میں سانس کا ایک تموج اور ذرے کا ایک حقیر وجود بھی تخلیق اسباب اور ترتیب نتائج میں اپنا حصہ رکھتا ہے۔ جس طرح عمل بد کی ایک خراش بھی آئینہ ہستی کو دھندلا جاتی ہے اسی طرح عمل خیر کا ایک لمحہ بھی عالم کے اجتماعی خیر کے ذخیرے میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے اور لوحِ زمانہ میں ریکارڈ ہو کر کبھی نہ کبھی ضرور گونجتا ہے اور میزان نتائج میں اپنا وزن دکھاتا ہے اور یوں آخرت کو جب گروہ در گروہ اپنے رب کے ہاں حاضر ہونگے تو یہ نوجوان (ارشد بشیر، وسیم راجہ اور ظہور احمد) بھی شہداء کے کے گروہ میں شامل اپنے رب کے ہاں اس شان سے حاضر ہوں گے کہ تمام عالم ان پر رشک کرے گا۔

برادران کشمیر.....!

خدا سے ہم نے بھی ملاقات کرنی ہے، خدا جانے کب.....؟ خدا جانے کہاں.....؟ اور کس حال میں ہونگے؟ کتنی بڑی ملاقات ہو گی جب ایک عبد ذلیل اپنے معبود اکبر سے ملے گا! جب مخلوق دیکھے گی کہ خود اس کا خالقِ اکبر اس کے سامنے ہے، خدا کی قسم.....! کیسے خوش نصیب ہیں یہ نوجوان کہ جلوہ گاہ میں اس شان سے جائیں گے کہ اس ملاقات کے موقع پر خدا کو نذر کرنے کیلئے خدا کا کوئی انتہائی محبوب تحفہ ان کے کفن میں موجود ہو گا۔

.....جی ہاں! ان کفنوں کی جھولیوں میں جن میں بدن اور سچے ایمان و عمل کی لاش ہو گی مگر شہادت کے طمطراق تمغے سے سجی ہو گی۔ ان تمغوں کو خدائے برتر کی رحمت لپک لپک کر بوسے دے گی اور اعلان ہو گا

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کاش ہمیں بھی اس ملاقات اور یقینی ملاقات کا کوئی خیال آتا اور تڑپا دیتا، کاش ہم بھی ایسی موت سے ہمکنار ہو جائیں جہاں فانی جسم کے تمام اعضاء باری باری قربان ہو جائیں، سب خدا کیلئے کٹ جائیں، سب اسی کے پائے ناز پر نثار ہو جائیں جس کے دستِ خاص نے ان کو وجود کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یقیناً ان نوجوانوں کے دھڑ شیطانی قوتوں کا شکار ہو گئے ہیں مگر اشک بار آنکھوں سے سو بار چومنے کے لائق ہیں کہ فرشتے ان کو اٹھا کر اللہ کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں اور ان کی جوانیاں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ دنیا پر نہیں یہ آخرت پر نثار ہوئی ہیں۔ انہوں نے دنیا کی کسی چیز سے نہیں خود خدا سے عشق کیا، انہوں نے دنیا کی ساری اشیاء اور عیش و عشرت پر نہیں خود رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک پر ایمان کی بنیاد رکھی، انہوں نے دنیا کی نشیلی چھاؤں میں نہیں بلکہ شہادت کے پر شوق سائے میں پناہ ڈھونڈی، انہوں نے زندگی کی دلفریب اور ایمان کی

شاہکار شاہراہ پر اس طرح سفر کیا ہے کہ زندگی سے ہٹ کر شہادت اور شہادت کے اس پار تک کچھ سوچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ شباب وحسن سے وجد کرتے ہوئے اللہ کے ہاں اس طرح حاضر ہو گئے ہیں کہ حسن وجوانی بار بار ایسی حسرت کرے!!!

وہ زندگی اور دنیا پر جھومنے کی بجائے سچائی اور آخرت پر مر جانے کی رسم ادا کر گئے تا کہ زمین وآسمان ان کی موت پر آنسو بہائیں لیکن خدا اپنے فرشتوں کی محفل میں خوش ہو کہ اس کا بندہ اس کی بارگاہ تک آن پہنچا۔ دراصل کشمیر کو آزاد دیکھنے والے ہر نوجوان کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا گھر اس دنیا میں کہیں نہیں بلکہ اس دنیا میں ہے جو جسم وجاں کا تعلق ٹوٹتے ہی شروع ہوتی ہے۔ ایسی دنیا جہاں خود خدا اپنے بندوں کا منتظر ہے کہ کون ہے جو دنیا کے بدلے آخرت اور آخرت کے بدلے اپنی دنیا فروخت کر کے مجھ سے آن ملے۔ جہاں وہ جنت ہے جس کے گہرے اور ہلکے سبز باغات کی سرسراہٹوں اور شیر وشہد کی اٹھلاتی لہراتی ہوئی ندیوں کے کنارے خوف وغم کی پرچھائیوں سے دور ایک حسین ترین دائمی زندگی، سچے خوابوں کے جال بن رہی ہے۔ جہاں فرشتوں کے قلوب بھی اللہ کے ہاں پکار اٹھیں گے کہ خدایا.....! یہ ہیں وہ نوجوان جن کی ساری دنیا تیرے عشق میں لٹ گئی ہے، یہ سب کچھ لٹا کر تیری دید کو پہنچے ہیں، ان کے قلوب میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ راہِ حق میں مارا جانا ہی دراصل تجھ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور شہادت کے معنی ہی ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ یہ تو سب کچھ لٹا کر اس یقین تک پہنچے ہیں!

اور ہاں! کتنا قابل رشک ہے ان نوجوانوں کا یقیں اور ایمان، جن پر ملائکہ ایسی گواہی دیں گے اور کس قدر رونے کے لائق ہیں ہمارے ایمان جن کیلئے ہمارے دل بھی گواہی دیتے دیتے کسی خوف سے چپ ہو جاتے ہیں۔ کل جب میدان حشر میں اشک ولہو میں نہائے ہوئے یہ نوجوان خداوندی لطف واعزاز سے سرفراز کئے جا رہے ہونگے، خدا جانے ہم کہاں اور کس حال میں ہوں گے!

یقیناً آپ کے بیٹوں نے تو آپ کو سرخرو کر دیا جس کی بناء پر آپ اور آپ کے اہل خانہ دنیا وآخرت میں مبارکباد کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ اللہ ان نوجوانوں کی شہادت قبول فرمائے اور اس کی جزا دنیا وآخرت میں عطا فرمائے۔ آمین وثم آمین

خیر اندیش واحقر

سمیع اللہ ملک لندن

بروز جمعرات 10 محرم الحرام 1432ھ 16 دسمبر 2010ء

اسلام اور مغربی جمہوریت

آج کل نہ صرف ہماری نئی نسل اسلام سے عدم واقفیت کی بناء پر مغربی جمہوریت کے نعرے سے مرعوب ہو کر اپنے مسائل کا حل اس میں ڈھونڈ رہی ہے بلکہ ہمارے ملک کے کچھ دانشور قلمکار بھی اس کے پرچار میں مشغول ہیں۔ اضروری ہو گیا ہے کہ اس موضوع پر اپنی بساط کے مطابق کچھ تحریر کیا جائے تا کہ ہماری موجودہ نئی نسل مغرب کے پر فریب نعرے کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت سے واقف ہو سکیں۔

اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر رکھا ہے۔ محکومی کی وجہ سے ہماری جان اور بدن بھی غیروں کے ہاں گروی ہیں۔ ہم اگر دیکھتے ہیں تو حاکم کی نظر سے، سنتے ہیں تو حاکم کے کانوں سے، سوچتے ہیں تو حاکم کے دماغ سے، یہاں تک کہ ہم قومِ غالب کے نظریہ مسلک یا نظام کو عرشِ معلیٰ سے نازل شدہ سمجھتے ہیں اور اس کی تقلید کو اپنے لئے ہزار فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔ اقوام غالب اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں جب ہماری طرف پھینکتی ہیں تو ہم ان کو لپک کر خوان یغما سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے فوراً مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھا کر عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ بکمال فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ شروع میں اس نظام کی حیثیت بالکل سیاسی تھی لیکن جب نام نہاد مذہبی پیشوائیت کے سینے میں مذہبی قیادت کے علاوہ سیاسی قیادت سنبھالنے کی کی آرزو نے انگڑائی لی تو انہوں نے سادہ لوح اور تقلید پرست عوام کو سہانے خواب دکھا کر میدان اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے اپنی پوری توانائیاں حصولِ اقتدار کی بھٹی میں جھونک دیں، بجائے اس نظام کو مسترد کرنے کے اس مغربی جمہوریت کو اپنی منزل بنا کر مغربی اقوام کو بھی یہ تاثر دیا کہ گویا اسلام میں،، نظام حکومت،، کیلئے کوئی واضح ہدایات موجود نہیں۔ اس طرح انہوں نے اس نظام کو جو اقوامِ مغرب کے قریب مردہ پا چکا تھا عین اسلامی کہہ کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد اب مغربی جمہوریت کو عین اسلامی سمجھنے لگی ہے۔

مغربی جمہوریت کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان حالات و کوائف کا جائزہ لیا جائے جس کے پیشِ نظر مغربی اقوام نے اس نظام کو وضع اور اختیار کیا تھا۔ جمہوریت سے پیشتر مغربی اقوام ظلم و استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی تھیں۔ ایک طرف ملوکیت کی قہرمانی اور دوسری طرف اربابِ کلیسا کی تھیوکریسی تھی۔ یعنی مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا نظریہ جو سینٹ پال نے وضع کیا تھا جس میں تھیاکریسی نے حکومت کا حق خدا سے پادریوں کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ پادریوں کو خدا کا نمائندہ بنا کر ان کو بے پناہ اختیارات کا مالک بنا دیا۔ بعد ازاں رومن بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کر کے حکومت کا اختیار بادشاہوں کو منتقل کر دیا لیکن حقیقتاً حکومت کا کنٹرول پادریوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ لوتھر نے عوام کو پادریوں کے فولادی اور ظالمانہ شکنجے سے رہائی دلانے کیلئے اپنی اصلاحی تحریک میں انجیل کو سمجھنے کا حق ہر فرد کیلئے مانگا لیکن اس نعرہ سے بھی مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون موجود نہیں تھا۔

اس صورتحال سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس میں روسو کے نظریہ حکومت کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ روسو کے نظریۂ حکومت نے پادریوں اور بادشاہت سے نظامِ حکومت واپس لیکر عوام کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس طرح نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آ گیا۔ یہ وہی نظریہ تھا جس کا اساسی تصور یونان کے مفکرین اور دانشوروں نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ بہر حال ملوکیت اور پادریوں کے استبداد کی چکی میں پسنے والے

عوام نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر اس کا نہائت گرمجوشی سے استقبال کیا اور اسے نوعِ انسانی کیلئے آیہ رحمت سمجھ کر اس کی تقلید شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ عوام کا جوش و خروش اور مسرت انبساط نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا بلکہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قہرمانی سے حصولِ نجات پر ایک منصفانہ رد عمل تھا۔ یہ تھے وہ حالات جس کے پیشِ نظر جمہوریت نے جنم لیا۔

مغربی اقوام نے برسوں اس نظامِ حکومت کا مختلف طریقوں سے تجربہ کیا اور انجام کار ان اقوام کے مفکرین اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس نظام کو انسانیت نے اپنے لئے آیۂ رحمت سمجھا تھا وہ نوع انسانی کیلئے کوئی ازلی وابدی قانون مبنی بر عدل مہیا نہیں کر سکا کیونکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں ازلیت وابدیت نہیں ہو سکتی۔ اب یہ مفکرین ان عالمگیر قوانین، جن کا سرچشمہ انسانی فکر سے الگ اور سربلند وماوراہو، کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ان کے مسترد شدہ نظام یا بامر مجبوری اپنائے ہوئے نظام میں اسلامی لاحقہ لگا کر اسے اپنے دکھوں اور مسائل کا مداوا سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اسلامی جمہوریت کے نام سے متعارف کروا کے اپنے ملکوں میں نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔

یہ اصطلاح دراصل ان لوگوں کی طرف سے متعارف ہوئی ہے جو اسلامی جمہوریت کا نعرہ لگا کر اسلام کے پردے میں درحقیقت اپنے جارحانہ مفادات کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ اس اصطلاح کا بے معنی پن اور استعمال کرنے والوں کی کم علمی یا عدم اخلاص تو خود اس اصطلاح کے اندر پوشیدہ ہے، چاہے اس پر کتنی ہی فلسفیانہ پالش کی جائے۔ اس اصطلاح کا تناقص ہر شخص کی سماعت پر فوراً عیاں ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کون سا جذبہ ہے جس کے تحت،، اسلام اور جمہوریت،، کے دو متضاد خود کفیل اور جامع مفہوم رکھنے والے دو مختلف الفاظ کو باہم جوڑا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ ایسی متضاد اور متناقض اصطلاح استعمال کرنے والے شخص کا ذہن اسلام کے بارے میں مطمئن نہیں ہے۔ وہ اسے ناکافی، نامکمل، غیر جامع اور ناقص چیز سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں جب تک اسلام میں مزید پیوند نہ لگائے جائیں، اس وقت تک وہ اپنا اصل فائدہ نہیں ظاہر کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ وہ شخص مغربی جمہوریت کے بارے میں مرعوبانہ ذہن رکھتا ہے۔ جو چیزیں وہ اسلام میں کم پاتا ہے، اس کے خیال میں ان چیزوں کی کمی جمہوریت ہی بدرجہ احسن پوری کر سکتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایسے شخص کا رجحان غالب مغربی جمہوریت کی طرف ہی ہے اور اسے صرف ذرا اسلامی بنا لینے کی ضرورت ہے۔ شائد یہ ضرورت اسے معاشی یا موجودہ حالات کے پیش نظر لاحق ہو۔ چوتھی بات جس کی طرف ذہن جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس متناقض اصطلاح کو استعمال کرنے والے کو اس تناقض کا شعور ہی نہ ہو اور وہ پوری طرح اسلام سے واقف ہو اور نہ جمہوریت سے، بس زمانے کے چلتے ہوئے فیشن کے مطابق وہ بھی یہ اصطلاح اسی طرح لیکر چل پڑا ہو جس طرح فیشن بدلتے دیکھ کر لوگ بے سوچے سمجھے فیشن بدل لیا کرتے ہیں۔ ایسے نعرے لگانے والوں کے ہاں حقیقتاً ان ساری باتوں کا امکان موجود رہتا ہے۔

اگر ہم دیکھیں تو گزشتہ دو تین صدی تک مسلمان ممالک پر مغربی ممالک اپنی قہرمانی قوت اور شوخ وشنگ تہذیب کے ساتھ حکمران رہے ہیں جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا ہے: "چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تایک تر"۔

جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر تلوار کے زور پر فاتحانہ مسلط ہو جاتی ہے تو مفتوح اور مغلوب قوم کے افراد اس کی تلوار ہی سے مفتوح نہیں ہوتے بلکہ اس کے نظریات، اس کے علوم اور اس کے فلسفہ حیات تک سے مفتوح ہو جاتے ہیں اور کم ہی ایسے سخت جان ہوتے ہیں جو غالب قوم کے علوم و فنون اور تہذیب کی کٹھالی میں پگھلنے اور اس کا سانچہ اختیار کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ جس طرح سیاسی برتری ختم ہونے کے بعد مدت تک یہ مغلوبانہ و مرعوبانہ تغیر و تبدل شروع ہو جاتا ہے اسی طرح سیاسی برتری ختم ہونے کے بعد مدت تک یہ مرعوبانہ اور مغلوبانہ طرزِ فکر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور چونکہ فاتح قوم کے راج دربار میں مغلوب و مفتوح قوم کے صرف وہی افراد باریاب ہو سکتے ہیں جو اس کے رنگ و بو کو اختیار کر کے اس کے سانچے میں ڈھل جائیں اور اپنی وفاداری اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں، تب یہ بدیشی آقا اپنے اختیارات ایسے ہی لوگوں میں منتقل کر کے انہیں اپنا حقیقی جانشین بنا کر جاتے ہیں۔

تمام مسلمان ملکوں میں جہاں ایک مدت کے بعد مغربی قوموں کی واپسی کے سبب سیاسی آزادی درآمد ہوئی ہے وہاں فطری طور پر خود بخود ایسے لوگ برسر اقتدار آئے ہیں جو پہلے سے فرنگیت کے بہت قریب تھے اس لئے مشرقِ وسطیٰ سے لیکر مشرقِ بعید تک بیشتر مسلمان ممالک میں وہی لوگ مسلط ہیں جو مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے اور اپنی زندگی کے شب و روز سے مغرب کے مقابلے میں اپنی مرعوبانہ طرزِ عمل اور طرزِ فکر کا پیہم انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ مشکل ہی سے یہ سوچ سکتے ہیں کہ یورپ سے آئی ہوئی کوئی چیز بھی ناقص ہو سکتی ہے چاہے وہ دین و ایمان کا تصور ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی حیثیت مرغِ بادنما کی سی ہوتی ہے کہ جدھر کی ہوا چلی اسی طرف رخ موڑ لیا۔ اگر یورپین مسلط ہو جائیں تو سر سے پیر تک مغربی لباس میں نظر آئیں گے اور اگر حبشیوں کی حکومت قائم ہو جائے تو رنگ سیاہ ناک چپٹی اور بال گھونگھریالے کرنے کے طریقے استعمال کرنے لگیں گے اور اگر ہندوؤں کی برتری دکھائی دے تو سر سے پاؤں تک گاندھی بھگت نظر آئیں گے۔

ایسے لوگوں کے اپنے کوئی نظریات نہیں ہوتے صرف فاتح کے نظریہ حیات کا مشروب ان کے شیشۂ حیات میں رنگ بھرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ انہیں اسلام پر اعتماد نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس کا مطالعہ کر کے اس میں کچھ خامیاں، کمزوریاں اور نقائص پائے ہوتے ہیں بلکہ ملی کردار نہ ہونے کے سبب ایک مفتوح قوم کا دین سمجھتے ہوئے خود بخود ان کا نقطۂ نظر اس کے بارے میں حقارت آمیز نہیں تو معذرت آمیز ضرور ہو جاتا ہے۔ ان کیلئے ڈارون، آئن اسٹائن اور نیوٹن کی بات زیادہ سائنٹیفک اور وزنی ہوتی ہے اور حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی بات بے وزن ہوتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ دونوں گروہ دو مختلف علوم کے نمائندے ہیں، جن علوم پر موخر الذکر حضرات گہری نگاہ رکھتے ہیں ان کی ابتداء سے بھی اوّل الذکر لوگ نابلد ہیں لیکن ہر مسئلے پر سند ان کیلئے بہر حال اوّل الذکر حضرات ہی ہوتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کا تصور چند عبادات کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا جو ان کی رائے میں ایک مصروف اور دنیادار آدمی کیلئے خارج از بحث اور از کار رفتہ معمولات ہیں۔

اسلام کی طرف سے اس بے اعتنائی اور محدود تصور کے بعد جمہوریت کے بارے بھی ان کا کوئی عملی تجرباتی اعتقاد نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی افادیت نے ان کو متاثر کیا ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا نعرہ اپنے چاروں طرف لگتا ہوا سنتے ہیں، مغربی قوموں میں اس موضوع پر لٹریچر تیار ہوتا ہے اور وہاں کی سیاسی

جماعتوں کو اس قسم کے نعرے لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں اس لئے ترقی پسند کی علامت، جدیدیت کا تقاضہ اور عصری تقاضوں کا لازمی جواب سمجھ کر اسے فیشن کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور اپنی سیاسی بولی میں بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ ان کیلئے گویا کوئی عمرانی تصور نہیں ہوتا جو اپنے کچھ تقاضے رکھتا ہو بلکہ ایک پالیسی کا مسئلہ ہوتا ہے جو ہوا کا رخ دیکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ پہلو ایک مرعوب ذہن اور ذہنی افلاس کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اب آپ خود ہی سوچیں کہ آخر اسلام اور جمہوریت میں کوئی قدر مشترک بھی ہے جس کی بناء پر ہم لوگ ان دو متضاد نظریات کا باہمی جوڑ لگانے اور دنیا بھر کے سامنے اپنی مزعومہ ترقی پسندی اور حقیقتاً اپنی کم علمی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ مغربی حکومتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں اور وہ اپنے اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں، ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے یعنی وہ آئین یا قوانین ہیں جنہیں وہ خود وضع کریں اور وہ حرفِ آخر ہوتے ہیں۔ عوام کے یہ نمائندے مختلف پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور جو پارٹی اکثریت میں ہوتی ہے وہ سیاہ وسفید کے مالک بن جاتی ہے۔ بہر حال ایسی نظامِ حکومت یعنی مغربی جمہوریت میں حکومت یا اقتدار ہر صورت انسانوں کے ہاتھوں میں رہتا ہے اور انہیں دوسروں پر حکومت کرنے کیلئے اکثریت کی بناء پر ہر قسم کا قانون بنانے کا مکمل اختیار ہوتا ہے اس کے برعکس اسلام یعنی قرآنی نظام میں حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں بلکہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے:

ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔۔خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو (سورۃ یوسف:40)

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا،،۔(سورۃ کہف:26)

حقِ حکومت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی جمہوریت یا آجکل کی اصطلاح میں،، اسلامی جمہوریت،، قرآنی نظام کی ضد ہے۔ مغربی جمہوریت میں پارٹی سازی کی اجازت ہے لیکن پارٹی سازی کا قرآن کریم کی رو سے کوئی جواز نہیں۔

قرآن کریم کے مطابق نوعِ انسانی صرف دو گروہوں میں تقسیم ہے جن میں ایک گروہ کفار کا اور دوسرا گروہ مومنین کا ہے خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی بر حکمت پیدا کیا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی پاکیزہ بنائیں۔ اور اسی کی طرف (تمہیں) لوٹ کر جانا ہے (سورۃ تغابن-3)

"یہ لوگ رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان لا کر حلقہ مومنین میں شامل ہوئے ہیں، انہیں اسلام نے ایک امت قرار دیا ہے "وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔۔۔اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں۔(سورۃ البقرہ۔143)

بعد ازاں انہیں آپس میں تفرقہ پیدا کرنے یعنی فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے سے منع فرما دیا ہے۔وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔۔۔اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا (سورۃ آل عمران۔103)

نیز مغربی جمہوریت میں عوام اقتدار اکثریتی پارٹی کے نمائندگان کو تفویض کرتے ہیں لیکن اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور وہ اپنا اقتدار کسی نمائندہ کو تفویض نہیں کرتا۔ چنانچہ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے خود زبان نبوی سے کہلایا گیا کہ:

"کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب اور جستجو کروں حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے، قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے (سورۃ انعام 15)۔

اس مقام پر واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو پھر خدا کی حکومت کیلئے انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ مزید وضاحت کیلئے ان سادہ مثالوں پر آپ ذرا غور فرمائیں تو بات اور کھل کر سامنے آجائے گی کہ اسلام ایک خدا کی حاکمیت کا قائل ہے جب کہ جمہوریت کا بنیادی فلسفہ اکثریت کی جماعت کی حکمرانی ہے۔ اسلام رسالت کے ذریعے ہدائت الٰہی کا علمبردار ہے، جمہوریت ہدائت الٰہی کے فلسفے کو سرے سے تسلیم نہیں کرتی بلکہ ہر قسم کی قانون سازی اور اس کے نفاذ کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک دعویٰ، جوابِ دعویٰ کے ٹکراؤ سے جو نتیجہ درآمد ہوتا ہے بس وہی نسخۂ ہدائت ہے جو زمانے کے ساتھ پیہم بدلنے والی چیز ہے۔

اسلام آخرت میں خدا کے سامنے دنیا و اعمال کی جوابدہی پر اپنے سارے نظام فکر کی بنیاد رکھتا ہے، جمہوریت سرے سے آخرت، جزا و سزا، جنت و دوزخ کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اسلام تمام انسانوں کو بنی آدم کی اولاد کی حیثیت سے مساوی اور بھائی بھائی قرار دیتا ہے جبکہ جمہوریت انسانیت کو کئی طبقوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے اور ختم کرنے پر ابھارتی ہے۔ انسان اخلاقی قدروں کو انسانی حسن کا لازمی جزو قرار دیتا ہے لیکن جمہوریت اخلاق کو اضافی اور قابل ترمیم و اضافی چیز سمجھتی ہے۔ اسلام معاشرے میں مرد اور خاندان کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، جمہوریت انہیں تحلیل کر کے ایک ریاستی معاشرے میں بالکل بکھیر دیتی ہے۔ الغرض یہ دو الگ الگ طرزِ حیات ہیں اور ان میں باہمی بنیادی طور پر کوئی بھی قدر مشترک نہیں کہ ان میں باہمی جوڑ لگایا جا سکے۔

اس کھلی ہوئی متناقض اصطلاح کو اختیار کرنے اور الحاد کے ساتھ ایمان کا جوڑ لگانے کی ایک مجبوری ان حضرات کیلئے کچھ مقامی حالات بھی ہوتے ہیں۔ جن قوموں میں انہیں اقتدار پر قبضہ کرنا ہوتا ہے ان کے عوام اپنے دین و مذہب سے جذباتی لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہی مجبوری ہے جو ایک مسلمان قومی لیڈر کو لاحق ہوئی تھی تو اس نے اپنی بے پردہ بیگم سے کہا تھا کہ ہمیں جس علاقے کا دورہ کرنا ہے وہاں تمہیں برقعہ اوڑھنا پڑے

گا اور جب بیگم نے اپنی روایتی بے پردگی کے سبب یہ رجعت پسندی اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے دباؤ ڈالتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ "یہ تمہیں بہر صورت کرنا پڑے گا کیونکہ وہاں کے لوگ بہت متشدد مذہبی ہیں"۔ گویا خدا اور رسول کا حکم یا اسلامی شعار اس وقتی پردے کا باعث نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی ضرورت تھی جو بر حال وقتی طور پر مقامی حالات کے مطابق پوری ہونی چاہئے تھی۔

ایسے لوگ نہ تو اسلام کا حقیقی علم رکھتے ہیں، نہ اسے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے دیکھتے اور تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان کے خیال میں اسلام دنیا کے مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے ،اس لئے زمانے کی چلتی ہوئی کسی بولی کا پیوند اسلام کے ساتھ لگا کر وہ اپنی قوم کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں اور زمانے کی ہوا کے رخ پر بھی اڑنا چاہتے ہیں تاکہ کوئی انہیں قدامت پسند اور "جامد ملا" خیال نہ کرے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے اگر زمانے میں آمریت کا رواج ہو جائے تو اسلام کے اندر سے خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولیاء الامر کی اطاعت کے وجوب کی دفعہ نکال کر سامنے رکھ دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سارا اسلام آمریت ہے اور خلفاء راشدین بھی تمام آمر تھے اور اگر زمانے میں اشتراکیت کا غلبہ ہو جائے تو یہ بھی حضرت ابوذر غفاری کے تقویٰ و بے نفسی کی مثال سامنے لا کر مالی مساوات اور ،،ارض اللہ،، کا ٹکرا پیش کر کے قومی ملکیت کا تصور سامنے رکھ دیتے ہیں کہ دیکھو اسلام تو سراسر اشتراکیت ہی ہے اور اگر اشتراکیت میں تھوڑا سا خوفِ خدا شامل کر دیا جائے تو بالکل خالص اسلام بن جاتا ہے۔ اگر سوشلزم کی بات چل پڑے تو اسلام کی رفاہی عوامی خدمات کی کچھ مثالیں سامنے رکھ کر اسلام کو جدید سوشلزم کا قدیم ایڈیشن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس پر بس ذرا سی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اگر جمہوریت کا چرچا ہو تو مساوات انسانی اور خلفاء پر تنقید کی مثالیں بتا کر اسے مغربی جمہوریت کا مکمل چربہ ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ پوزیشن بالکل ویسی ہے جو سپٹنک کے فضائی خلا میں اڑنے پر ہندوستان کے برہمنوں نے کوئی وید دکھا کر اختیار کی تھی کہ وید میں سپٹنک کا ثبوت موجود ہے جہاں جنگ مہابھارت میں بھیم کے ہاتھ سے پھینکے ہوئے ہاتھی کا ذکر موجود ہے جو اتنی بلندی پر گیا کہ خلاء میں جا داخل ہوا اور اب تک خلاء میں پرواز کر رہا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام خود ایک مکمل نظام زندگی ہے اور بس اس کا آخری ایڈیشن لانے والے وہ آخری نبی ﷺ ہیں جو اسے تمام انسانی ضرورتوں کیلئے آخری نسخہ کیمیا اور نظامِ زندگی کے طور پر لائے ہیں۔ یہ نظام تمام عصری تقاضوں کو نہ صرف پورا کرنے والا بلکہ انسان کی تمام مشکلات اور الجھنوں کو رفع کرنے والا ہے۔ آج انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ قومی کشمکش اور بین الاقوامی جنگیں ہیں جو اسے تباہی کے کنارے کی طرف لیجا رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ناتمام اور ناقص نسخے بلکہ ٹوٹکے جو مغربی تہذیب زخم خوردہ انسانوں کیلئے تجویز کر رہی ہے ان میں ہر نسخہ پہلے سے بڑھ کر تباہی پھیلانے والا ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ داری کا علاج بن کر اشتراکیت آئی لیکن وہ اس سے بڑھ کر انسانوں کو غارت کر کے اپنے ہی گھر کے دامن میں نیست و نابود ہو گئی۔

آج دنیا بھر میں انسان مغربی تہذیب اور اس کے عطائی نسخوں سے ہلاکت کے بستر پر پڑا ہوا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب کوئی ہائیڈروجن بم یا ایٹم بم پھٹ کر انسانیت کو مکمل تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔ سوشلزم تو دنیا کے دو عظیم فتنوں میں سے ایک فتنہ ثابت ہو کر اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر چکا۔ آج سے کچھ عرصہ قبل کوئی سوشلزم کی ایسی المناک موت کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی اسلام کے علمبرداروں نے اس کی پیش گوئی کر دی تھی کہ ،،سوشلزم کو ماسکو میں اور سرمایہ دار جمہوریت کو لندن پیرس اور نیویارک میں پناہ نہیں ملے گی۔،، دنیا نے دیکھ لیا کہ ایک فتنہ

اپنے انجام کو پہنچ گیا اب جلد یا بدیر دوسرے فتنے کی باری ہے اور اس وقت تمام مصائب کے مداوا کیلئے اسلام ہی آخری پناہ گاہ ہو گا کیونکہ اسلام ہی اپنی ذات میں مکمل جامع خود کفیل اور ساری انسانی مشکلات کا واحد حل ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں، آزمودہ طرزِ حیات ہے جس نے اپنے اصولوں پر خالص معیاری انداز میں ایک طویل عرصے تک ایک خالص اسلامی ریاست چلا کر دکھائی جو دنیا کیلئے زمین پر خدا کی سب سے بڑی رحمت تھی اور پھر معمولی دستوری تغیر کے ساتھ مدت دراز تک ایسی حکومتیں چلائی ہیں جن میں افلاس کی کوتاہیوں کے باوجود جرم وافلاس، ظلم وزیادتی کی کم سے کم مثالیں ملتی ہیں اور ان کا مقابلہ آج کا مہذب اور ترقی یافتہ دور بھی بالکل نہیں کر سکتا۔ ان کی عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار ایسی نہ تھی۔ مجرم خود اعتراف کرتے اور حکمران تک عدالت کے کٹہرے میں طلب کر لئے جاتے تھے۔ ان کے معاشرے میں بھوکے ننگے لوگوں کے لشکر چیونٹیوں کی طرح بازاروں میں چلتے اور ہر شخص سے چمٹے نظر نہ آتے تھے جیسے دور جدید کے تقاضوں نے پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے ہاں اشیاء صرف کی قیمتیں نہائت کم تھیں جب کہ اس ترقی یافتہ دور میں بنیادی ضروریات بھی وصال صنم کا درجہ اختیار کر گئیں ہیں۔

دراصل یہی وہ نظام زندگی ہے جس کا علمبردار بن کر مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو اٹھنا چاہئے تھا۔ جس چیز کی دنیا کو تلاش اور طلب ہے وہ اسلام کے اندر مکمل طور پر موجود ہے اور شائد ہی کسی دور میں انسانیت اسلام کے اصولوں کیلئے اتنی پیاسی اور حاجت مند تھی جتنی آج ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مشرق ومغرب کی ساری مرعوبتیں چھوڑ کر اسلام کو ایک نظامِ حیات اور نظریہ زندگی لیکر اٹھتے، پہلے خود اس پر عمل کرتے اور پھر ساری دنیا کو اس کی دعوت دیتے کہ ہمارے سارے دکھوں کا علاج صرف اسلام میں ہے ۔ ہمیں بین الاقوامی برادری کی اگر ضرورت ہے تو یہ بھی صرف اسلام عطا کر سکتا ہے اور اپنے دور عروج میں جب اس پر عمل کیا گیا تو مراکش سے لیکر چین تک اس کی عملاً تصویر دیکھنے کو ملی۔

ان جدید نظریات اور مغربی جمہوریت نے ہمیں رنگ وبو، نسل وقبیلہ کے چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہمیں اس وقت محبت واخوت کی ضرورت ہے اور یہ صرف اسلام ہی ہے جو رنگ ونسل وقبیلہ کے امتیاز کو مٹا کر ہم کو بنی آدم کی حیثیت سے بھائی بھائی اور خدا کے مساوی بندے قرار دیتا ہے اور تمام علاقائی عصبیتوں سے نجات دلاتا ہے۔ آج ساری دنیا بداخلاقی کے ریلے، فحاشی کے چکر، نئی نسلوں کی تباہی اور نئی نئی جنگوں کی یورش سے پریشان ہے۔ اسلام ہمیں اخلاق فاضلہ سکھاتا ہے، انصاف وعدل کی تعلیم دیتا ہے، بین الاقوامی نظریاتی بیداری پیدا کر کے جنگوں کا سلسلہ ختم کر دیتا ہے۔

اب افسوس اس بات کا ہے کہ جاں بلب دنیا کا تریاق،، اسلامی نظام،، کی صورت میں ہمارے پاس ہے اور ہم اسے پس پشت ڈال کر دنیا سے زہریلے ٹوٹکے لیکر انہیں ان کے تریاق،، مغربی جمہوریت،، کے ساتھ ملا کر بڑے فخر کیساتھ سر اونچا کر کے کہتے ہیں کہ ہم بھی اسلامی جمہوریت کے قائل، ترقی پسند، جدید اور عصری تقاضوں کو سمجھنے والے لوگ ہیں۔ اس سے زیادہ کوربصری اور نظریاتی تہی دامنی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں ایسے عطائی طبیبوں سے جلد نجات عطا فرمائے۔ آمین!

بروز ہفتہ 12 محرم الحرام 1432ھ 18 دسمبر 2010ء

نشانِ راہ

جب سے رہبر اخبار میں میرا مضمون،، سفر شہادت،، شائع ہوا ہے مجھے اب تک اس مضمون کی تحسین کی مد میں بے شمار ای میلز موصول ہوئی ہیں لیکن ایک بہت ہی عزیز رفیق جن کی برسوں سے کوئی اطلاع نہیں تھی ان کے ظہور ہونے کی اطلاع پر دل کی ایک عجیب کیفیت ہو گئی ہے۔ ان کی خواہش اور مجبوریوں کی بناء پر ان کے پیغام کو منظر عام پر لانے سے گریز کرتے ہوئے ان کے مراسلہ کا جواب تحریر کر رہا ہوں۔

ایک مدت کے بعد آپ کی شگفتہ و فکر انگیز تحریر پڑھنے کو ملی۔ مجھے آپ سے یہی گماں تھا کہ وہ ہاتھ جو برسوں سے انسان کے اجسام کا پوسٹ مارٹم کر رہا ہو، وہ ہاتھ جو قصابوں جیسا کام کر کے انسانوں کو راحت پہنچا رہا ہے یقیناً ایک دن انسان کی روح کی آسودگی کیلئے اس سے بڑھ کر کسی اعلیٰ اور ارفع مقاصد کیلئے اپنی زندگی کا رخ متعین کرے گا۔ الحمد اللہ آپ نے بروقت مستحسن قدم اٹھایا اور یہ وقت کی ضرورت بھی تھی حالانکہ کویت میں کئی دفعہ ان معاملات پر آپ سے بحث بھی ہوئی تھی، بحث میں کتنی ہی باتیں، کتنی ہی الجھنیں اور کتنے ہی مسائل بیان ہوتے تھے۔ اس بحث میں ہم دونوں اپنے دل دماغ کی کتنی ہی تصویریں بلکہ تصویروں کا پورا البم ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے تھے، پھر ہر تصویر کے ہر پہلو پر بامقصد بات ہوتی تھی لیکن وسائل اور افرادی قوت پر آکر ہمیں یہ تمام تصویریں نامکمل اور ادھوری نظر آتی تھیں اور ہم جو ایک دوسرے کے ساتھ بہت فلسفیانہ باتیں کرتے تھکتے نہیں تھے، رنج والم کی بہت سے داستانیں اشاروں میں بیان کرتے تھے، اپنے ہی فلسفے سے شکست کھا کر اگلے دن کیلئے تیاری کرتے تھے کیونکہ یہ سارا اندازِ فکر ایک خالص رضائے الٰہی کے حصول کیلئے ہوتا تھا، اس لئے ناامیدی قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی کیونکہ اس بات کا ہم دونوں کو علم تھا کہ مہلتِ زندگی پرچہ دینے کا وقت ہے، دنیا کمرۂ امتحان ہے، مالکِ کائنات خود ممتحن ہے اور نفاذِ اسلام کا نصب العین پرچہ امتحان ہے اور یہ پرچہ مومن کے ایمان کی کسوٹی ہے نہ کہ اس کا قیام مطلوبِ مشیت ہے۔ لیکن اس خط میں آپ نے جہاں انداز فکر میں تبدیلی پیدا کی ہے وہاں آپ نے مجھے مغرب کی آسائش زدہ زندگی سے تائب ہونے کی تلقین کرتے ہوئے واپس آنے کی نصیحت فرمائی ہے!

یہاں مجھے معمولی سا اختلاف کرنے کی اجازت دیں۔ آپ بھی کویت آمد سے پہلے کشمیر سے دہلی کی طرف تشریف لائے تھے جو کہ ہندوستان کا مغرب کی طرف کھلنے والا دروازہ ہے، جس طرح پاکستان کا شہر کراچی مغربی تہذیب کے داخلے کا سب سے پہلا مستقر ہے۔ بلاشبہ ہمارا قبلہ بھی مغرب کی طرف ہے اور ان لوگوں کا بھی جو،، مغرب،، کے پجاری ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ ہم،، رب المغربین،، کی عطا کردہ تہذیب کے پیروکار ہیں اور وہاں کے بسنے والوں کی اکثریت مغربی تہذیب کی گرویدہ ہے۔ اس مغرب کی جہاں سائنس نے مشینیں بنا بنا کر افکار و خیالات کی سادہ فضا کو دھواں دار کر رکھا ہے۔ اب یورپ سے جو بھی جہاز جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کا جس قدر گندہ مال درآمد کر کے لاتا ہے بلند آشیاں لوگ سب سے پہلے اس میں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں اور اس درآمد کی ہر کھیپ میں کچھ نہ کچھ نیا مال آ ہی جاتا ہے۔ دین و مذہب کی طرف شکوک و شبہات، ریب و تذبذب کا طرزِ عمل، ظاہری چمک دمک پر جان دینا معاشرتی زندگی میں مختلف حدود و قیود سے بیزاری، مذہب سے جان چھڑانے کا رجحان، عورتوں کی مساوات کا بناوٹی اور نظر فریب نعرہ! غرضیکہ کیا کچھ ہے جو مغرب (یورپ و امریکا) سے برآمد ہو کر دہلی و کراچی پہنچتا ہے۔

اس سارے انبار ژولیدگی میں جو دل ودماغ میں کانٹے چبھ جاتے ہیں، اب اس سے پہلے کہ یہ کانٹے نکلیں اورزخم مندمل ہو کر قلب و نظر کی صحت بحال ہو کچھ دوسرے کانٹے آکر دل ودماغ کو مجروح کر دیتے ہیں اورایک سخت عذاب تشکیک میں مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ سارا مشاہدہ شدت سے ارضِ مملکتِ خداداد میں پچھلی دودہائیوں سے دیکھنے کو کچھ زیادہ ہی مل رہاہے۔ مسلمان عورت جس کا طرۂ عظمت عصمت وحیا تھا، اب بازاروں میں ولائتی سامان نمائش کی طرح بے باکی وبے حجابی کا اشتہار بن کر گھس آئی ہے۔ فیشن شو کے نام پر کیٹ واک کے اجتماعات میں ہوس بھری نظریں کھلے عام اپنی پسند وناپسند کا پروانہ جاری کر کے اپنی راتوں کو رنگین بنانے کا ذریعہ بن چکی ہیں۔ جن بازاروں کو حضور اکرم ﷺ نے شیطان کی گزر گاہیں قرار دیا تھا، وہ بازار اب نمائش کی گیلریاں بن گئے ہیں۔ جن اخباروں میں کبھی مسلمان عورت کی تصویر نہیں دیکھی تھی اب نہ صرف اخبارات بلکہ الیکٹرانک میڈیا میں ہر چند منٹ بعد ان میں حیافروش تاجروں کی تیار کردہ کریموں کے اشتہارات چند ٹکوں کی خاطر ان الفاظ میں شائع اور نشر ہوتے ہیں کہ ،،برقعہ پہننا کالے پن کو چھپانے کی علامت ہے"۔

ثقافت کے لفظ کو عریانی، مے خواری، بے حیائی اور ناچ رنگ کے مفہوم میں لیا جارہاہے اور حکومت خداداد پاکستان ثقافت کے نام پر بڑی بڑی آرٹ کونسلوں پر اس غریب اور مظلوم قوم کا لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ صرف کررہی ہے بلکہ حکومت پاکستان کے کئی عہدیداروں ترنگ میں آکر اعلان کرتے ہیں کہ یہ اسلامی مملکت کی آرٹس کونسلیں اپنے پروگرامز کے ذریعے ملک میں قہر خداوندی سے جو زلزلے اور سیلاب سے متاثرین کی امداد کررہی ہیں۔ الاامان الحفیظ! خدا کے غضب کو مزید بھڑکانے کی کھلے عام دعوت دے رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں اسلامی مدرسے میں جب صبح سویرے اسمبلی ہوتی تھی تو تمام امت مسلمہ کیلئے بالعموم اور پاکستان کیلئے بالخصوص دعائے خیر بھی ہوتی تھی اور ہر روز کوئی نہ کوئی استاد کسی اسلامی موضوع پر خطاب بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسکول کے فارغ التحصیل طلباء میں دوسرے اسکولوں کے طلباء کی نسبت اسلامی محبت واخوت کچھ زیادہ ہوتی تھی اوراپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں بے خوفی اور بیباکی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کا عملی تجربہ کویت میں ہوا جب میں اورآپ ایران کے انقلاب سے متاثر ہو کر ان کی پہلی انقلابی سالگرہ میں شمولیت کیلئے دوستوں کی شدید مخالفت کے باوجود روانہ ہوگئے تھے۔ واپسی پر کویت کے ائرپورٹ پر ہی پاسپورٹ ضبط کر لئے گئے تھے۔ یہ تو کبھی سوچا نہ تھا کہ کویت کے جس جدید ہوائی اڈے کی تعمیر کی نگرانی میرے ذمہ تھی، چند سال بعد اس کے ایک حصے حوالات میں مجھے آپ کی معیت میں اس حال میں چند گھنٹے بھی گزارنے ہونگے۔ کچھ گھنٹے سلاخوں کے پیچھے جانے کی سنت یوسفی اوراسوۂ حنبلی کی ادائیگی کا بھی بھرپور موقع ملا۔ بالآخر ہماری بے گناہی ہمارا جرم قرار پائی اور یہ قید وبند کے چند گھنٹے ازراہِ لطف ہمارے کھاتے میں محض اس لئے ڈال دیئے گئے کہ افسر مجاز دوپہر کے کھانے کے بعد اپنی ڈیوٹی کے دوران ہی قیلولہ فرمارہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ کیوں بند کر دیئے گئے؟ اربابِ اقتدار خوش کہ طاقت کا نشہ ابھی ہمیں ان کے پاؤں پکڑنے پر مجبور کر دے گا لیکن بھلا ہو ان چند دوستوں کا جو ہماری خاطر پھر قربانی دینے کیلئے موقع پر آن دھمکے اور وہ جو اللہ کو بھی بطور ضامن ماننے کو تیار نہیں تھے اپنے ہی کویتی بھائیوں پر احسان کر کے ہمیں مستقبل میں تائب وتابعدار رہنے کا فیصلہ سناتے ہوئے اگلے دن کیلئے سی آئی ڈی کے دفتر میں حاضری کے پروانہ پر دستخط کروا کر احسان جتارہے تھے۔

بات اگر یہاں تک ہی موقوف ہوتی کہ پھولوں سے محروم کر دیتے لیکن جب کانٹوں پر سے بھی حق چھین لیا گیا تو غیرتِ ایمانی کا تقاضہ یہی تھا کہ اس رزق سے منہ موڑ لیا جائے جو پرواز میں کوتاہی پیدا کر رہا ہے۔ ایک غیر مسلم اور وہ بھی ہندہ جو کل تک میرا ماتحت تھا اس کو فوری طور پر مجھ پر ترقی دیکر اس کے ماتحت کام کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ گویا مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ گویا تذلیل و تکذیب کا دور اب شروع ہوا چاہتا ہے اور میرے احتجاج اور بیباکی نے جو مجھے بچپن میں اسکول میں ملا تھا، عجب تماشہ کھڑا کر دیا ۔ مجھے انتہائی معذرت اور افسوس کے ساتھ یہ تاثر دیا گیا کہ ،،اوپر والوں،، کا منشاء یہی ہے کہ کچھ ہفتوں تک اس سلسلے کو برداشت کرنا پڑے گا حالانکہ میں تو "بہت اوپر والے "ہی کی بندگی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اپنے کام کی اغلاط اور الزامات کے بارے میں دریافت کیا، ان کے سامنے ماضی کے واقعات جن میں ٹھیکیداروں کے انعامات کو ٹھکرانے کا سب کو علم تھا، سالوں کی کمائی دنوں میں حقارت سے ٹھکرا دینے سے سبھی آگاہ تھے لیکن انہوں نے شائد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ میرے بچوں کو محض اس لئے محرومی وافلاس کا شکار بنانا چاہتے ہیں کہ میں اس مملکت کی خدمت کو بھی عبادت سمجھتا ہوں۔ اسی لئے یہ خطہ میرے نزدیک ایک مسجد کی مانند مقدس ہے لیکن ،،اوپر والوں،، نے کچھ نہ سنا اور مجھے جبراً اسی عہدے پر کام کرنے کو کہا گیا اور میرے انکار پر مجھ کو الگ کرنے کی دھمکی سنادی گئی۔ اس سے پیشتر کہ ان کے چہروں پر باطل کی مسکراہٹ آتی میں نے اپنا استعفیٰ خود تحریر کر کے ان کے منہ پر دے مارا اور اس میں صاف لکھ دیا:

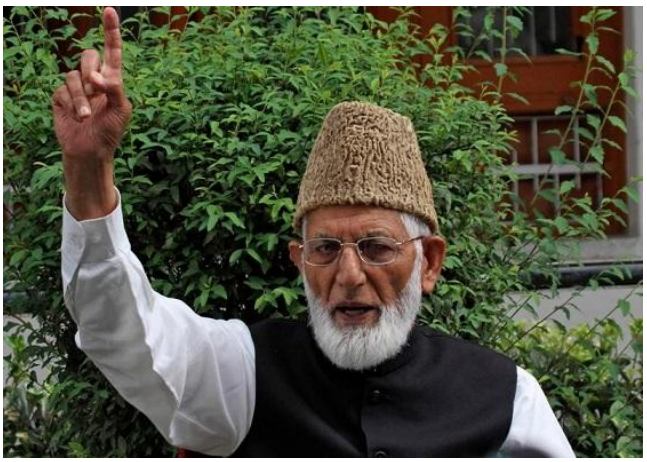

"میرا رزق اوپر والوں سے نہیں بلکہ بہت اوپر سے آتا ہے اور کوئی اسے راستے میں کاٹنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ جس کی بندگی میں کرتا ہوں وہی میرا رازق ہے اور جو کوئی مجھے رزق کی دھونس دیکر اپنی بندگی پر مجبور کرنا چاہتا ہے میں اس کی خدائی کو نمرود کی خدائی سمجھ کر ٹھکراتا ہوں إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ۔ میرے اس استعفے کے بعد مجھے دوسری کئی کمپنیوں میں سے بلاوہ آیا لیکن دل اب اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ ایک عشرہ سے زائد جس ملک میں گزارا تھا وہاں کل کا سورج دیکھنے کی تمنا بھی باقی نہیں رہی تھی۔ پاکستان کے بارے میں جو حسین تانے بانے بنے ہوئے تھے وہ بھی سراب نظر آرہے تھے۔ سوچا کہ اب مغرب کی طرف منہ کر کے خدا کی بندگی کا جو عہد دن میں کم از کم پانچ مرتبہ کرتا ہوں کیوں نہ دنیا کے مغرب میں جا کر اس کا اظہار کروں۔ آپ میرے استعفیٰ پر منہ پھلائے بیٹھے تھے، آپ سے مشورہ کرنے کیلئے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ گویا آپ پھٹ پڑے۔ لیکن جب اصولوں کی بات ہوئی تو آپ مات کھا گئے۔ آپ نے اپنا تبادلہ بہ امر مجبوری اور مصلحت کے تحت قبول کر لیا لیکن مجھے آپ سے "ضدی" اور نجانے اور کیا کیا القاب سننے کو ملے حالانکہ ارفع مقاصد کیلئے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔

مرحوم قائداعظم کے نام سے کون واقف نہیں جو ہندوؤں اور انگریزوں کے مجموعی دباؤ اور لالچ کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے، اپنا مقصد کسی قیمت پر بیچنے کو تیار نہ ہوئے۔ مسلمان کو چھوڑیئے یہ تو تاریخ کے اندر بڑا جانباز کردار لے کر آیا ہے۔ یہ تو علم دین شہید بن کر رسول اکرم ﷺ کے نام کی آبرو پر دیوانہ وار قربان ہو جاتا ہے۔ آپ کافروں کو ہی لے لیں، بھگت سنگھ جو آزادی کی کا طرح اپنی جان نچھاور کر گیا۔ ہزاروں کیمونسٹوں کو دیکھ لیں

جو زارِ روس کی بدترین سزائیں بھگتتے رہے۔ چینی اشتراکیوں کو دیکھ لیں جو خاقان چین کی بیس سال تک بدترین اذیتیں سہہ کر بالآخر اسے پچھاڑ گئے۔ مردِ مجاہد سید علی گیلانی کو ہی دیکھ لیں کہ باوجود ضعیف العمری اور ساری عمر مصائب میں مبتلا ہونے کے ان کے عزائم قابل رشک حد تک جواں ہیں کہ وہ اب تک اپنے ملک و قوم کی آزادی کیلئے ایک لمحہ غافل نہیں رہے۔ پچھلے تریسٹھ سالوں سے کشمیری کیسی لازوال قربانیاں دیتے چلے آرہے ہیں کہ دشمن ظلم کرنے کے باوجود بے بس ہوتا جارہا ہے۔ انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے بڑی ایٹمی قوت دی ہے۔ وہ تو جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کیلئے سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ فرہاد بنتا ہے تو جوئے شیر نکال لاتا ہے، رانجھا بنتا ہے تو تاریک جنگلوں میں بھینسوں کے گلے چراتا ہے، ایک نازک اندام لڑکی کے روپ میں اپنے مقصد کی خاطر چناب کی تند و تیز لہروں سے لڑ جاتا ہے، میں نے تو ابھی صرف مغرب کا رخ کیا تھا۔ سعی مسلسل اور پیہم کوشش کا راستہ اختیار کر کے اس فرنگی ملک میں جو کہ ڈھائی صدیاں حکمرانی کر کے اب تک غلامی کے وہ اثرات چھوڑ کر آیا ہے جس سے ہم ابھی تک نکل نہیں پائے لیکن کشمیر میرے دل و نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔

بالکل انہی کی مانند تاجر کی صورت میں اس ملک میں داخل ہوا ہوں۔ مجھے یاد ہے مجھے رخصت کرتے وقت بہت سے دوستوں کی موجودگی میں آپ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے جبکہ میرے ذہنی و قلبی دکھ درد کو نظر شناس بھانپ گئے تھے۔ لیکن ایک انگارہ تھا جسے برف کی دبیز تہوں میں ڈھانپ کر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس کی حدت پھر بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں تو اس وقت بھی پریشان نہیں تھا کیونکہ کرم شب کی قدر و قیمت رات کی تاریکی سے ہی ہوتی ہے اور تاروں کے حسن کا جھومر ظلمتِ شب کی سیاہ پیشانی پر ہی کھلتا ہے۔ چاند کا کنگن رات کی دلہن کو ہی میسر آتا ہے اور بارش کے قطرے کیلئے تپتی ہوئی زمین کا پیاسا دامن ہی سمندر کے لبریز پیمانے سے زیادہ مستحق طالب اور شائق ہوتا ہے ۔ اپنی کمیابی اور اجنبیت پر میں کبھی بھی پریشان نہیں ہوا، ہر قیمتی شئے کمیاب اور نادر ہوتی ہے اور پھر یہ حدیث تو آپ نے کئی مرتبہ پڑھی اور سنی ہو گی کہ:

"ایک وقت مومن کا ایمان بچانا اپنی مٹھی میں انگارۂ تھامنے کے مترادف ہو گا"۔

"اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ عالمِ اسباب میں سانس کا ایک تموج اور ذرے کا ایک حقیر وجود بھی تخلیقِ اسباب اور ترتیبِ نتائج میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ جس طرح عمل بد کی ایک خراش آئینہ ہستی کو دھندلا جاتی ہے اسی طرح کلمہ خیر کا ایک بول بھی عالم کے اجتماعی خیر کے ذخیرے میں اضافہ کر دیتا ہے اور لوحِ زمانہ میں ریکارڈ ہو کر کبھی نہ کبھی ضرور گونجتا اور میزانِ نتائج میں اپنا وزن دکھاتا ہے۔ بس ذرا بدی کا شکنجہ ڈھیلا پڑنے کی دیر ہے کہ خیر کی کھیتی لہلہا اٹھے گی، نیکی کا اگر ایک ذرہ بھی معاشرے کے اجتماعی ضمیر میں موجود ہو گا تو وقت آنے پر ضرور گلستانِ رعنا بن کر نمودار ہو گا۔ بس اک آرزو بدلنے کی دیر ہے! میری شدید خواہش ہے کہ میں بھی کشمیر کے ان لالہ زار کو اپنی آنکھوں سے بوسے دوں جہاں میرے آباؤ اجداد کئی مختلف قبرستانوں میں آسودہ خاک ہیں۔ اب دیکھیں یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے"۔

نہ ہم بدلے نہ تم بدلے نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

بروز سوموار 14 محرم الحرام 1432ھ 20 دسمبر 2010ء

ڈوبتے سورج کی زمین؟

وہ 1925ء میں پیدا ہوا، چھ سال کی عمر میں ولی عہد بنا اور 22 سال کی عمر میں ایران کا بادشاہ بن گیا، وہ محمد رضا شاہ پہلوی تھا لیکن پوری دنیا اسے شاہ ایران کے نام سے جانتی تھی۔ وہ ایشیا میں امریکا کا سب سے بڑا دوست تھا، یورپی پریس اسے "امریکن گورنر" کہتا تھا، وہ امریکی وفاداری میں بہت آگے چلا گیا، امریکا نے اسے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا حکم دیا اور اس نے ایران میں داڑھی اور پردہ پر پابندی لگا دی۔ اس کے دور میں کوئی باپردہ عورت گھر سے نکلتی تھی تو پولیس سرے عام اس کا برقع پھاڑ دیتی تھی، شاہ ایران نے تمام زنانہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکرٹ کو یونیفارم بنا دیا، شراب نوشی، رقص اور زنا فیشن بن گیا۔ شاہ کے دور میں ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں کالجوں میں شراب کی دکانیں تھیں، یونیورسٹیوں میں خواتین کی سودے بازی ہوتی تھی۔

اس مکروہ کاروبار کو قانونی حیثیت حاصل تھی، شاہ کے زمانے میں دو جرنیلوں کے ہم جنس پرست بیٹوں نے آپس میں شادی کی، سرکاری سطح پر نہ صرف ان کی دعوت ولیمہ ہوئی بلکہ شاہ اور اس کی کابینہ نے خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کی۔ شاہ نے امریکا کی محبت میں ایران میں موجود 42 ہزار امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی، امریکا نے شاہ ایران کے دفتر میں "گرین فون" لگا رکھا تھا اور اسے امریکا سے جو ہدایت ملتی تھیں، وہ ان پر فوری عمل درآمد کراتا تھا لیکن پھر شاہ کی امریکا نواز پالیسیوں پر بغاوت ہوئی، یہ بغاوت تین سال تک چلتی رہی، شاہ نے 12 شہروں میں مارشل لاء لگا دیا، عوام نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، شاہ نے حکومت شاہ پور بختیار کے حوالے کی اور ملک سے فرار ہو گیا، اس کا خیال تھا امریکا اب اس کی وفاداریوں کا بدلہ دے گا لیکن جوں ہی شاہ ایران کا طیارہ ایران کی حدود سے نکلا، امریکا نے آنکھیں پھیر لیں، شاہ پہلے مصر گیا، پھر مراکش، پھر بہاماس اور پھر میکسیکو، وہ اس دوران امریکا سے مسلسل مدد مانگتا رہا لیکن وائٹ ہاؤس اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتا تھا۔ شاہ ایران سوا سال تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی، امریکا نے اس کے اکاؤنٹس تک "منجمد" کر دیئے، آخر میں انور السادات کام آیا اور اس نے اسے پناہ دے دی۔ جولائی 1980ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا، انتقال کے وقت اس کے پاس اس کی تیسری بیوی کے سوا کوئی نہ تھا، لوگ اس کا جنازہ تک پڑھنے نہ آئے چنانچہ اسے اس کے بیڈ روم ہی میں امانتاً دفن کر دیا گیا۔

یہ صرف رضا شاہ پہلوی کی کہانی نہیں، امریکا کا ہر دوست حکمران اسی انجام کا شکار ہوا، آپ "اناس تاسیو سو" کی مثال لیجئے، وہ نکاراگوا میں امریکی ایجنٹ تھا، نکاراگوا میں کمیونزم کی تحریک شروع ہوئی تو امریکا نے اناس تاسیو سو کو ڈالر اور اسلحہ دے کر کمیونزم کے خلاف کھڑا کر دیا۔ تاسیو سو امریکا کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑتا رہا، 1979ء میں نکاراگوا میں اسکے لئے حالات مشکل ہو گئے، وہ ملک سے فرار ہوا لیکن جوں ہی اس نے نکاراگوا سے باہر قدم رکھا، امریکا نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا، اس نے امریکا آنے کی کوشش کی لیکن امریکی حکومت نے اجازت نہ دی، یوں اناس تاسیو سو جنگلوں اور غاروں میں چھپ کر زندگی گزارنے لگا، وہ 1980ء میں اسی پریشانی کے عالم میں انتقال کر گیا اور اس کے چند قریبی دوستوں نے پیراگوائے کے شہر اس نشن میں دفن کر دیا، آج لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔

چلی کے آمر "جنرل اگارتے اگستو پنوشے" نے 1973ء میں سی آئی اے کی مدد سے جنرل ایلینڈو کی منتخب حکومت پر شب خون مارا تھا، پنوشے نے اقتدار میں آتے ہی چلی کی عوام کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ پنوشے 1990ء تک چلی پر حکمران رہا، ان 17 برسوں میں پنوشے نے امریکا کے کہنے پر ہزاروں شہری قتل کرائے، امریکا کی ناپسندیدہ تنظیموں پر پابندیاں لگائیں اور امریکا کی خواہش پر اپنے شہریوں کے انسانی حقوق غصب کئے، عوام 1990ء میں پنوشے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، وہ مارچ 1990ء میں لندن فرار ہو گیا، اس کا خیال تھا برطانیہ اور امریکا اس کی وفاداریوں کی قدر کریں گے لیکن لندن آتے ہی برطانوی پولیس نے اسے گرفتار کیا اور اسے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا، اس نے اس ناروا سلوک پر امریکا سے احتجاج کیا لیکن امریکی حکومت نے اسے جواب تک دینے کی زحمت نہ کی، برطانوی حکومت نے اسے 2000ء میں چلی کے حوالے کر دیا، اس کے خلاف مقدمہ چلا، 3 دسمبر 2006ء کو اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دم توڑ گیا، اس کی موت پر پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں جبکہ امریکی حکومت نے ایک سطر کا تعزیتی پیغام تک جاری نہ کیا۔

انگولا کا باغی سردار "جوناس سیومنی" بھی امریکا نواز لیڈر تھا، وہ برسہا برس انگولا میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا، نومبر 1992ء میں امریکا نے اسے کیمونسٹوں کے ساتھ امن معاہدے کا حکم دیا، اس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے نتیجے میں جوناس سیومنی بے دست و پا ہو گیا، معاہدے پر دستخطوں کے دو ماہ بعد کیمونسٹوں نے "ہامبو" میں اس کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر دیا، وہ فرار ہو گیا، آج اس واقعہ کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں، جوناس سیومنی جان بچانے کے لئے چھپتا پھر رہا ہے لیکن امریکی حکومت اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتی۔

جنرل نوریگا" پانامہ میں امریکا کا آلہ کار تھا، اسے بھی امریکیوں نے کیمونسٹوں کے خلاف استعمال کیا۔ وہ 1990ء تک امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا لیکن امریکا کی تسلی نہ ہوئی لہٰذا امریکا نے پانامہ پر حملہ کر دیا، صدر نوریگا گرفتار ہوا امریکی ایما پر عدالت نے اسے 40 سال قید بامشقت کی سزا سنا دی اور نوریگا گزشتہ چودہ برس سے جیل میں امریکی دوستی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

"فرنینڈ مارکورس 22 برس تک فلپائن میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا۔ اس نے فلپائن سے کمیونسٹوں کو چن چن کر ختم کر دیا لیکن 1986 میں امریکا ہی نے اس کی حکومت ختم کرا دی، مارکوس امریکا آ گیا، امریکا نے اسے پناہ تو دے دی لیکن اسے وہ عزت اور وہ توقیر نہ دی جس کا وہ حق دار تھا، مارکوس نے باقی زندگی ہونولولو کے ایک چھوٹے سے مکان میں گزاری اور اسے ایک عام پناہ گزین کے برابر وظیفہ ملتا تھا۔ مارکوس 1999ء میں اسی بے بسی کے عالم میں آنجہانی ہو گیا۔

1979ء ہی میں امریکا نے رہوڈیشیا میں بشپ ابیل منروریوا کو موغابے اور نکومو کے مقابلے میں کھڑا کیا، بشپ امریکیوں کے لئے لڑتا رہا لیکن جب وہ لڑتے لڑتے کمزور ہو گیا تو امریکا نے اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور صدر صدام حسین کی کہانی تو پوری دنیا جانتی ہے۔ انقلاب ایران کے بعد امریکا نے صدام حسین کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، صدام حسین نے امریکا کی ایماء پر 22 ستمبر 1980ء کو ایران پر حملہ کر دیا، یہ جنگ 20/ اگست 1988ء تک 8 سال جاری رہی اور اس میں دس لاکھ افراد ہلاک اور 20 لاکھ زخمی ہوئے۔ صدام حسین 1990ء تک امریکا کا دوست رہا لیکن پھر امریکا نے تیل کے لالچ میں عراق پر حملہ کر دیا، اس جنگ میں 86 ہزار عراقی شہری شہید ہوئے، 2003ء میں امریکا نے ایک بار پھر عراق پر حملہ کیا، صدام حسین گرفتار ہوا اور امریکی ہدایات پر اسے 30 دسمبر 2006ء کو بغداد میں پھانسی دے دی گئی۔

شاہ ایران سے لے کر صدام حسین تک امریکی تاریخ دوست کشی کی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امریکی اپنی خارجہ پالیسی کو "ڈسپوزل ڈپلومیسی" کہتے ہیں، ان کا فلسفہ ہے خریدو، استعمال کرو اور پھینک دو، امریکی قوم بلیڈ کند ہونے سے پہلے بیوی بدل لیتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اپنے دوستوں کو کاغذ کے گلاس، پلیٹ، ٹشو اور گندی جراب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ کیس ٹو کیس اور پراجیکٹ ٹو پراجیکٹ چلتے ہیں چنانچہ ان کے دوست جنرل اگستو پنوشے ہوں، جنرل رضا شاہ پہلوی ہوں یا جنرل صدام حسین یہ لوگ اس وقت انہیں دوست سمجھتے ہیں جب تک وہ ان کے لئے خدمات سرانجام دے سکتے ہیں اور جس دن انہیں محسوس ہوتا ہے یہ شخص ان کی "ذمہ داری" بنتا جا رہا ہے، یہ اس کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسا سلوک کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ ان کی قبروں تک پر "سابق" کی مہر لگا دیتے ہیں۔

یہ ہے امریکی دوستی اور اس کا انجام اور امریکا پچھلے 234 برس سے "دوستی" کے اسی فلسفے پر کاربند ہے اور اس نے آج تک کسی شخص کے لئے اپنی یہ پالیسی نہیں بدلی لیکن دلی سرکار کے مہربان یہ سمجھ رہے ہیں 2007ء تک پہنچ کر امریکا نے اپنا سارا فلسفہ بدل لیا ہے اور وہ اب بحیرہ عرب کے آخری ساحل اور بحر اوقیانوس کی آخری لہر تک دلی سرکار کا ساتھ دے گا، ہمارے یہ دوست بھول گئے ہیں وہ امریکی جو اپنی ماں، اپنے باپ کو بھول جاتے ہیں' ان کی دوستی محض اپنے مفادات کی خاطر ہوتی ہے۔ امریکا کو اس خطے کی ابھرتی ہوئی سپر طاقت چین کا محاصرہ درکار ہے جس کیلئے پاکستان قطعی موزوں نہیں کہ پاک چینی دوستی اس راستے کا سب سے بڑا پتھر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلی میں کھڑے ہو کر اوبامہ نے بھارت کی مستقل نشست کی حمائت تو کر دی لیکن چند دنوں کے بعد امریکا ہی کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے اس کو انتہائی مشکل قرار دیدیا۔

امریکا ڈوبتے سورجوں کی زمین ہے اور ڈوبتے سورجوں کے بیٹے ہمیشہ چڑھتے سورجوں کے دوست ہوتے ہیں، امریکا کی وفاداری ہمیشہ اپنے مفادات سے وابستہ رہی ہے اور آئندہ بھی اس میں کوئی تبدیلی کا امکان نہیں۔ بس ایک دو برس کی بات ہے' اگر دلی سرکار امریکی ایماء پر چین کے خلاف ان کی امیدوں پر پورے نہ اترے تو اس کے بعد نیا کپ، نئی پلیٹ اور نیا گلاس ہو گا اور کوئی نیا اوبامہ ہو گا۔

بروز جمعرات 17 محرم الحرام 1432ھ 23 دسمبر 2010ء

آستیں میں رہتے ہیں!

ہماری حالت تو ایسے جاں بلب مریض جیسی ہو گئی ہے جو بڑی مشکل سے رینگتا ہوا اپنے معالج کے پاس تو پہنچ جاتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت باقی نہیں کہ وہ یہ بھی بتا سکے کہ اس کو کیا تکلیف یا کیا بیماری ہے۔ معالج کے پوچھنے پر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں ہیں اور زخموں سے چور جسم کے ہر اعضاء کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سالوں پرانی بیماریوں کا کرب اور سارے جہاں کا درد سمٹ کر اس کے چہرے سے عیاں ہے لیکن بتانے کیلئے اس کی اپنی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ماسوائے سسکیوں، آہوں اور کراہوں کے درمیان صرف اشارے سے کبھی سر کی طرف، کبھی دل پر ہاتھ رکھ کر اور کبھی دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔ جب معالج تھوڑا حوصلہ دلاتا ہے تو پھر اس کی جانب ایک عجیب سی امید اور آس کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں امید وار رحم کی درخواست کے ساتھ خاموش بیٹھ جاتا ہے۔

اب تو باباجی کا ٹیلیفون بھی بہت کم آتا ہے حالانکہ مجھے ان کی کڑی تنقید بھی اچھی لگتی ہے۔ یہی حال آجکل ان لوگوں کا ہے جن کے سینے میں اس مملکت خداداد پاکستان کا درد آبلہ بن کر ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے اور درد کی شدت سے ان کو ایک پل چین میسر نہیں اور دکھ کی بنا پر ان کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی ہے۔ نیم شب جب وہ اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ اللہ سے رحم اور امید کے ساتھ پاکستان کیلئے شفاء اور سلامتی کی عاجزانہ دعاؤں کے ساتھ اپنے ان شہداء کا واسطہ دیتے ہیں جو اس ملک کی خاطر قربان ہو گئے۔ میرا وجدان تو اس وقت مجھ کو شدید بے چین کر دیتا ہے اور سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے جب کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ان سوا لاکھ بے گناہ بیٹیوں اور بہنوں کو روز قیامت کیا جواب دوں گا جن کو اس مملکت پاکستان کی خاطر مشرقی پنجاب میں ہم چھوڑ آئے تھے، جو آج بھی آسمان کی طرف منہ کر کے اپنا قصور پوچھتی ہوں گی! صرف مشرقی پنجاب کے ان پانچ ہزار سے زائد کنوؤں کا حال کس قلم سے کیسے لکھوں جن میں مسلمان بچیاں اپنی آبرو بچانے کیلئے کود گئیں۔ ان ہزاروں بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے جن کو ان کے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے تلواروں اور بھالوں کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ آج بھی لاکھوں افراد اپنے پیاروں کو یاد کر کے چپکے چپکے اپنے اللہ کے حضور اشک بار ہو کر اس پاکستان کیلئے ان کی قربانی کی قبولیت کی دعائیں کرتے ہیں!

لکھتے رہے ہم پھر بھی حکایات خونچکاں
ہر چند کہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ حالت صرف ان لوگوں ہی کی نہیں جنہیں میرے رب نے حالات و واقعات کا ادراک دیا ہے۔ وہ کسی بڑی آندھی یا طوفان کے آنے سے پہلے ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور فوری طور پر اپنے تئیں ان خطرات سے آگاہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، منادی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دن رات اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے دامے درمے اور سخنے اسی کام میں لگ جاتے ہیں کہ کسی طرح ان خطرات کا تریاق کیا جائے۔

آجکل ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی حیرت میں گم چہرہ لئے ایک دوسرے سے یہی سوال کرتا پھر رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور اب کیا بنے گا؟ ہما را مستقبل کیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک دوسرے سے کوئی اچھی خبر کی تمنا دل میں لئے ہوئے، ایک امید کی شمع آنکھوں میں سجائے جیسے بستر مرگ پر پڑے مریض کے لواحقین کسی معجزے کی آرزو میں کسی حکیم، حاذق سے مرض کے تریاق ملنے کی نوید کیلئے بے تاب ہوتے ہیں یا کسی صاحب نظر کی دعا کے محتاج جس سے مریض کی جاں بچنے کی آس ہو جائے لیکن شائد اب مریض کو کسی حکیم کے تریاق، کسی ڈاکٹر کی دوا یا پھر کسی صاحب نظر کی دعا سے زیادہ کسی ماہر سرجن کی ضرورت ہے اور شائد آپریشن میں جتنی دیر ہو گی مریض کی جان بچنے کے امکانات اتنے ہی مخدوش ہو جائیں گے، مریض کی حالت اتنی ہی بگڑتی چلی جائے گی، مرض اتنا ہی پھیلتا جائے گا، آپریشن اتنا ہی لمبا اور تکلیف دہ ہو جائے گا۔

مجھ سے مایوسی کا گلہ بالکل نہ کریں اور نہ ہی میرا مقصد بلاوجہ آپ کو ڈرانا ہے لیکن آپ ہی مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا کوئی عزیز جو آپ کو بہت ہی پیارا ہو وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائے، سب سے پہلے آپ اس کے بہتر علاج کیلئے دنیا کے بہترین ڈاکٹر، بہت ہی سمجھدار طبیب یا بڑا نامور حاذق تلاش کرنے میں دن رات ایک کر دیں گے اور اس کی زندگی بچانے کیلئے اپنی توفیق سے بڑھ کر خرچ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ یہ تمام وسائل مہیا ہونے کے بعد آپ سجدے میں رو رو کر اپنے عزیز کی شفایابی کیلئے اپنے معبود کو اس کی تمام جملہ صفات کا واسطہ بھی دیں گے تب جا کر آپ کے دل کو اطمینان آئے گا کہ وہی شفا کا منبع ہے اس سے بہتر کون ہے جو ہماری دعاؤں کو شرف قبولیت دے گا۔

فاسق کمانڈو پرویز مشرف سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے بعد پاکستانی عوام نے کچھ سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب قسمت اور حالات بدلنے کا وقت آ گیا ہے لیکن ہمیں تو پہلے سے زیادہ اندھیروں میں دھکیل دیا گیا ہے، شائد ابھی مزید بدنصیبی کے اندھیروں کی ٹھوکریں اس قوم کے نصیب میں ہیں یا پھر کڑی آزمائش کے دن ابھی اور باقی ہیں۔ مہنگائی کا جن تو پہلے ہی ہمارے دن رات غارت کر چکا ہے بلکہ اب وہ جو خلق خدا کے سامنے ربوبیت کا دعویٰ روٹی کپڑا اور مکان دینے کا اعلان کر رہے تھے بڑی ہی بے بسی کے ساتھ منہ چھپا رہے ہیں۔ عوام کے ہاتھوں میں گنتی کے چند نوٹ ہیں لیکن وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس سے کون کون سی چیز خریدیں۔ پیسے ہیں مگر کھانے کیلئے آٹا کہاں سے ملے گا؟ پیسے ہیں مگر بجلی اور گیس موجود نہیں۔ شائد اسی لمحے کیلئے قرآن پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر تم میرے ذکر سے منہ موڑو گے میں تمہارے گزران مشکل کر دوں گا۔ جب قومیں عدل سے بے بہرہ ہو جائیں، ظالموں کے ظلم پر احتجاج کرنا چھوڑ دیں، صرف اپنی سلامتی کی دعا مانگیں، ایک دوسرے کے مصائب سے ناآشنا ہو جائیں تو پھر اصلاح کیلئے اٹھنے والے ہاتھ بھی غیر موثر ہو جاتے ہیں۔

معاملہ تو اس سے بھی آگے بڑھ چکا ہے، ملک کے امن کو تو پہلے ہی تہہ و بالا کر دیا گیا ہے۔ کبھی اچانک ڈرون حملے اجل کا پیغام لیکر قہر ڈھاتے ہیں تو کبھی انتقام میں بپھرے لوگ خود کش حملوں سے اپنی ہی قوم کے چیتھڑے اڑانے کیلئے عذاب بن کر نازل ہو جاتے ہیں۔ ادھر افغانستان میں امریکا اور نیٹو کی افواج دن رات مظالم کے جو پہاڑ توڑ رہے ہیں اور اب ان کی طرف سے توجّہ ہٹانے کیلئے قصر سفید میں بیٹھے ہوئے فرعون کے نما ئندے نے تمام سفارتی آداب کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ دھمکی داغ دی ہے کہ پاکستان فوری طور پر اپنے قبائلی علاقوں کی خبر لے وگرنہ ہمارے بہادر کمانڈو ان کی سرکوبی کرنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ عراق اور افغانستان میں تو آپ کو ہر قسم کے مظالم ڈھانے کی مکمل آزادی ہے، کیا وہاں کے حالات آپ کے قابو میں آئے جو اب شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے ایسے اتحادی کو نشانہ بنانے کی دھمکی دے رہے ہیں جس نے اس نام نہاد وار آن ٹیرر میں سب سے زیادہ جانی و مالی نقصان اٹھایا ہے۔

غارت ہو ہمارا وہ حکمران جو دعویٰ تو بہادر کمانڈو کا کرتا تھا لیکن ایک ہی ٹیلیفون کال پر سجدے میں گر کر ساری قوم کی رسوائی کا سبب بن گیا اور آج آئے دن ہمیں اس طرح کے طعنے اور احکام کی بجا آوری میں اپنے نوجوانوں کا خون بہانا پڑ رہا ہے کہ اپنے ہی بھائیوں کے کشت و خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگنا پڑ رہا ہے اور اب حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ امریکی عدالت نے آئی ایس آئی کے سربراہ کے علاوہ دوسرے چند دوسرے پاکستانیوں کے وارنٹ جاری کر دیئے ہیں۔ شائد یہی وجہ تھی کہ چند دن پہلے بڑی عجلت میں امریکا نے فوری طور پر پاکستان سے اپنے اہم سفارت کار کے روپ میں امریکی انٹیلی جنس کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو فوری واپس بلا لیا ہے جس پر پاکستان میں خوب تباہی و بربادی بھیلانے کا الزام تھا۔ موجودہ حکومت نے ماسوائے بیان بازی کے ابھی تک کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا، کوئی پوچھنے والا نہیں کہ واشنگٹن میں تعینات پاکستانی سفیر حسین حقانی ملک کی کیا یہی خدمات سرانجام دے رہے ہیں؟ ان سے شکائت کیسی، وہ تو اس سے پہلے قوم کی بیٹی عافیہ صدیقی کی وکالت بھی خوب کر چکے ہیں کہ اب عافیہ کو امریکا کے عقوبت خانوں میں مزید 86 سال گزارنے ہونگے!

دوست اتنے قریب ہیں میرے
کہ میری آستیں میں رہتے ہیں

بروز اتوار 20 محرم الحرام 1432ھ 26 دسمبر 2010ء

امام اور چور

عباسی خلفاء کے دور میں جب بدعت و ظلم کی سیاہ وحشت ناک راتوں نے دین اسلام کے اجالے میں عظیم فتنہ ،، خلق قرآن ،، کے نام سے بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو اس زمانے کی ظالم حکومت نے اپنے پورے قہر و جبر کے ساتھ کلمتہ الحق کہنے والوں کی زبانیں کاٹ کر ان کے منہ زر و جواہر سے بھرنا شروع کر دیئے۔ اپنے اقتدار کی طوالت کی خاطر رسن و دار اور فولادی زنجیروں کی بھرمار کر ڈالی اور اہل دہشت کی بناء پر خوفِ خدا کی شاہراہ کو سنسان کرنے کا ہمہ وقتی عمل شروع کر دیا۔ جہاد وغیرہ کا درس دینے والے سہمی ہوئی بھیڑوں کی طرح ایک کونے میں سر چھپائے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں عام مسلمان "علماء" کو گوشہ سکوت میں سر چھپائے ہوئے دیکھ کر بڑی دلسوزی کے ساتھ اس بات کی گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی تو خدا کا بندہ ایسا ہو جو اس ظلم و باطل کا حق و راستی کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور اس امت کو آخرت میں محمد ﷺ عربی ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالے!

تاریخ گواہ ہے کہ اس لرزہ خیز محاذ پر اللہ نے اپنے بندوں کی مناجات، التجائیں بہت قریب سے سنیں اور اس بستی میں سے ایک مجاہد نے اس جہاد میں کود کر اس خون آشام جابر اور ایمان کش اقتدار پر کلمتہ الحق کی ایسی بجلیاں گرائیں کہ کفر کا سارا سیاہ دامن اور بدعت و ظلمت کا پورا وجود لرزنے لگا۔ جب اس بندہ خدا نے ظلم و جبر کی آندھیوں میں حق پرستی اور حق گوئی کے چراغ اپنے لہو اور اشکوں سے جلانے شروع کئے تو ان دنیادار، ظلمتوں کے علمبرداروں نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی کہ اس روشنی کو زر و جواہر، اقتدار اور منصب کی لالچ سے ڈھانپ کر بجھا دیا جائے لیکن "وہ" جان چکا تھا کہ اس دل میں اگر صرف ایک خوف جگہ بنالے تو دنیا کے تمام مصائب سے نجات دلا دیتا ہے۔ اس لئے اس نے "خوفِ خدا" سے اپنے دل کو مزین کر لیا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جب کوئی اور خوف اس دل میں جگہ بنانا شروع کر دے تو پہلا خوف دبے پاؤں چپکے سے نکل جاتا ہے۔ اسی لئے اس مردِ مومن نے خوفِ خدا کی ضربِ کلیمی سے خوفِ دنیا کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس مردِ مومن کو یہ علم تھا کہ اس عمل کے بعد اس کے وجود کے پرزے اڑا دیئے جائیں گے لیکن ایمانی جوش، دنیاوی ہوش پر ہمیشہ سبقت لیجاتا ہے اور اس کے دل پر یہ پیغام پہنچ چکا تھا کہ:

یہ قدم قدم بلائیں یہ قدم کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

جاہ و اقتدار کی مکروہ پیشانی جس کی نگاہوں نے ہمیشہ اپنے سامنے سر جھکتے ہوئے دیکھے تھے، ایک مردِ حق کا باطل کے سامنے اٹھا ہوا سر دیکھا تو بے شمار بل آگئے، نخوت و تکبر نے اس تنہا گردن و جبیں کو جھکانے کیلئے اپنی پوری طاقت کا اظہار اس طرح کیا کہ منوں وزنی لوہے کی زنجیروں میں پابجولاں کر کے شہر کی گلیوں میں گھمایا۔ موت کی ہلاکت آفرینیاں ہر وقت اس مردِ حق کے سر پر منڈلا رہی تھیں، اس وقت بھی اس عظیم الشان مردِ مجاہد کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جس نے اس کے چہرے کے بے حجاب حسن و جمال میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ باطل کے پروردہ منافقین اپنے چہروں کی سیاہی کو چھپانے کیلئے گھروں کے تاریک کونوں کھدروں میں چھپ گئے لیکن اس مردِ حق کی عاجزی اور انکساری کا جلال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ حق کو مٹانے والے خود مٹ جاتے ہیں اور حق کی خاطر موت کو گلے لگانے والے ابدی زندگی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور رہتی دنیا تک امر ہو جاتے ہیں۔

عقوبت گاہ میں جب اس مردِ حق پر زندگی ہر طرح سے تنگ کر دی گئی، رمضان المبارک کے صبر آزما مہینے میں اس فولادی عزیمت کے پیکر پر کوڑوں کی بارش نے خون کے چھینٹے اڑانے شروع کئے اور پھر کوڑے بھی ایسے کہ ہاتھی کی پشت پر اگر برسیں تو وہ بھی بلبلا اٹھے لیکن اس عظیم شخص کے منہ سے کوئی کراہ، کوئی آہ اور نہ ہی کوئی بد دعا کے الفاظ جاری ہوئے بلکہ وہ تو ان تمام چیزوں کو اپنے درد کی توہین اور اس راستے پر چلنے کا انعام سمجھ رہا تھا۔ اگر اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی تو یہی کہ: کتاب و سنت سے کوئی دلیل لاؤ،، حالانکہ اس بھاری ابتلاء کے موقع پر جب کہ خون آشام جبڑے ان کی ہڈیوں کو چبانے کیلئے اپنی پوری قوت صرف کر چکے تھے، حاکمِ وقت نے خود ان کی عظمت کو سلام کر کے اپنی ہار ماننے کیلئے یہ تجویز رکھی کہ اس معاملے پر خاموش ہو جاؤ، اس کی اگر تائید نہیں کر سکتے تو تردید بھی نہ کرو لیکن عزیمت کے اس پیکر نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اپنی اشک آلود نگاہیں اٹھا کر اپنے رب سے فضل و رضا کی درخواست کی اور پھر زمین پر جھک کر قبر و برزخ کی دنیا میں جھانک کر اپنی مظلومیت کے حسین ترین انجام کو دیکھ کر جب حاکمِ وقت پر نگاہ ڈالی تو اس کا سارا شاہی رعب و دبدبہ، اس کا تخت و تاج اور اس کا اپنا وجود ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اور اس مغرور بادشاہ کا سارا وقار اس درویش کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہی ظلم و قہر کا پہاڑ جس نے تمام علمائے سو کو اپنے گرد جمع کر رکھا تھا اور شرعی آڑ کی رخصت میں تمام علمائے سو کو زر و جواہر کے بدلے اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا، منت سماجت پر اتر آیا لیکن اس مردِ مومن کی ایک ہی پکار تھی کہ:
اگر کوئی دلیل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے لے آؤ تو یہ سر نہ صرف اطاعت کیلئے جھک جائے گا بلکہ قربان بھی ہو جائے گا وگرنہ ہم دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں۔

جب کوڑوں کی بارش نے جسم کی کھال ادھیڑ دی، فولادی زنجیروں نے جسم پر خونچکاں بسیرا کر لیا، بھوک و پیاس کی اذیت نے قیامت کا سماں پیدا کر دیا تو جسم پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔ آنکھ کھلنے پر کچھ علمائے سو کے ہاتھوں میں ٹھنڈا پانی دیکھا جو شریعت میں اس موقع پر پانی پینے کی گنجائش بتا رہے تھے تاکہ زندگی بچ جائے لیکن عزیمت کے اس امام نے تاریخ ساز جواب دیکر،، میں روزے سے ہوں اور اسی حالت میں اپنے رب سے ملنے کی خواہش و تڑپ رکھتا ہوں،، پانی کے اس پیالے کو نظروں سے دور کر دینے کو کہا۔ انہی زخموں سے چور اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور دل سے جو ہوک اٹھی کہ،، شریعت میں صرف رخصت ہی نہیں عزیمت بھی ہے،،۔ اگر میں رخصت کی راہ پکڑ لوں تو آخر اس حدیث نبوی ﷺ پر کون عمل کرے گا کہ جس میں وضاحت کے ساتھ ختم الرسل ﷺ نے اپنے صحابہ اکرام کے مصائب کی فریاد پر فرمایا کہ:
"تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سروں پر آرے چلا دیئے گئے اور جسم لکڑی کی طرح چیر دیا گیا، لوہے کے کنگھوں سے ان کے جسم کے گوشت کو نوچ ڈالا گیا پھر بھی یہ تکالیف ان کو حق کے راستے سے نہ ہٹا سکیں،،۔

وہ علماء جو شرعی رخصتوں کی آڑ لیکر اس فانی دنیا میں چند روز خیریت سے زندگی گزارنا چاہتے تھے وہ بھی اس مردِ مجاہد کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکے کیونکہ ان کو علم ہو گیا تھا کہ یہ اللہ کا سچا رفیق طے کر چکا ہے کہ محض چند روزہ فانی زندگی کے مقابلے میں اخروی زندگی بدرجہا بہتر ہے۔ موت سے تو کسی کو مفر نہیں، کسی نہ کسی آرزو کا رنگ تو کفن کو رنگین کرے گا، پھر کیوں نہ راہِ حق میں استقلال کا رنگ اپنے کفن کیلئے منتخب کر لیا جائے تاکہ جب اس حالت میں فرشتے خدا کے پاس لیکر حاضر ہوں تو دور سے ہی اس کفن کے رنگ میں اللہ کی خوشنودی کا پیام موصول ہو اور خدا کی رحمت دنیا میں دیئے گئے زخموں پر والہانہ پیار کرنے کیلئے لپک کر بوسے دے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

پھر وقت نے دیکھا کہ دنیاوی لحاظ سے کمزور و ناتواں، بے سر و سامان مردِ مجاہد نے اس بادشاہِ وقت کو جو کہ اپنے ہر ظلم کا ہر وار آزما چکا تھا، خدا کی نصرت کے بل بوتے پر اس کو شکست فاش دی، وہ جو اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ کرتا تھا، جس کو اپنے ہتھیاروں اور اپنے عقوبت گاہوں پر بڑا ناز تھا، جو اپنی دولت سے ہر کسی کو خریدنے کا دعویٰ کرتا تھا، اپنی فوجوں کی بہادری اور آہنی محل کے پہریداروں پر بڑا فخر کرتا تھا، موت کے فرشتے نے اس کے جسم سے اس طرح جان نکالی کہ آہنی پہریدار اور فولادی حلقے اور مضبوط در و دیوار دیکھتے رہ گئے اور وہ بے بسی کے ساتھ بڑی حسرت ناک اور عبرتناک موت کے سامنے چوں چرا اِں نہ کر سکا۔

اس مردِ حق کی زنجیریں نئی قیادت نے انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ نہ صرف کاٹ ڈالیں بلکہ تعظیم و تکریم کے تمام جھونکے نچھاور کر ڈالے۔ قدم قدم پر عقیدت کیشوں نے آنکھیں بچھائیں مگر عظمت کے اس پہاڑ نے فاتحانہ نہیں مگر عاجزانہ چال کے ساتھ سب سے پہلے صبر کے ابلتے ہوئے آنسوؤں اور خوشیوں کی چیخوں میں شکرانے کے جہاں نوافل ادا کئے وہاں ظالموں کیلئے راہِ ہدائت کی دعائیں کیں۔ نئی قیادت نے پرانے مظالم کا حساب دنیا میں چکانے کی کوشش کی تو اس مردِ درویش کی آنکھیں غصے سے ابل پڑیں کہ:

"یہ شاہی اشرفیوں کے توڑے شاہی عتاب کے کوڑوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ یہ دنیا جسے ستم سے نہ دبا سکی اب اس کو کرم سے خریدنے کی کوشش کر رہی ہے"۔

ایک طرف دین کا فتنہ تھا، دوسری طرف دنیا کا فتنہ !! شائد ان کو وہ واقعہ یاد آ گیا کہ جب دنیا بن سنور کر محمد ﷺ عربی کا دل لبھانے کیلئے آگے بڑھی تو آنحضرت ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے اس کو دھکے دیکر نکال دیا تھا، دنیا نے اس وقت کہا تھا "آپ ﷺ تو مجھ سے بچ گئے لیکن آپ ﷺ کے بعد لوگ شائد ہی مجھ سے بچ سکیں"۔

یہی وجہ تھی کہ وقت کے اس عظیم امام نے شاہی نوازشات کو بھی بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ وہ حاکمِ وقت کے نہیں بلکہ حاکموں کے حاکم کے شکر گزار تھے کہ جس نے ان کی ہر مشکل میں نصرت فرمائی اور ان کے دل کو یہ توانائی بخشی کہ جسم میں سب سے چھوٹے لوتھڑے نے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اکثر تنہائی میں اپنی اور مسلمانوں کی بخشش کی دعائیں کرتے تو وہاں ایک گمنام شخص،، ابو الہیثم،، کی بخشش کی دعائیں بڑی رقت آمیز انداز میں کرتے۔ جب عقدہ کھلا کہ ابو الہیثم ایک چور تھا، جب اس مرد، مجاہد کو پابجولاں کر کے بازاروں اور گلیوں میں رسوا کیا جا رہا تھا تو اس وقت اس چور نے بڑی دلسوزی کے ساتھ کہا کہ:

"میں ایک چور ہوں اور چوری کیلئے کم و بیش اٹھارہ سے بیس ہزار ضربیں اپنی کمر پر برداشت کر چکا ہوں، اس کے باوجود میرے ارادے ٹس سے مس نہیں ہوئے اور میری یہ ثابت قدمی دنیا جیسی ناپاک چیز کیلئے تھی۔ ہزار افسوس ہو گا تم پر اگر تم،، راہِ حق،، میں اتنی بھی ہمت نہ دکھا سکو"۔

چور کا یہ پیغام ان کے دل میں تیر حق بن کر اتر گیا اور اس پیغام نے اس مردِ حق کو اپنے وقت کا عظیم امام،، احمد بن حنبل،، بنا ڈالا۔ یہ اس عہد کی کہانی ہے کہ جب ایمان کی آگ سینوں میں اتنی تھی کہ چور کے چند سوز بھرے کلمات نے تاریخ کو ایک عظیم الشان مجاہد سے متعارف کروا دیا لیکن آج سینکڑوں نہیں لاکھوں زبانیں جمع ہو کر جبہ و دستار کی آڑ لیکر فلک شگاف نعرے بھی لگا رہی ہیں، اسی قرآن و سنت سے بے شمار واقعات سنا کر جذبات بھی ابھارے جا رہے ہیں، یقیناً یہ ایک نیک و صالح عمل ہے لیکن اس کے باوجود جب کبھی ایسا مشکل وقت آن پڑتا ہے تو واعظ اپنی جان بچانے کو عین فرض سمجھ کر راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ اگر کہیں خود نمائی کے مواقع موجود ہیں تو اس میں شرکت عین ثواب، اگر کشمیر، فلسطین اور افغانستان کے عملی جہاد کا ذکر تو پھر عین جواب! تقریر کیلئے بہترین سٹیج مہیا کیا جائے تو عین عبادت لیکن یہی جبہ و دستار کے پرستار دوستوں سے عمل کی اپیل محض اس لئے کی جائے کہ مسلمان اپنے سچے قول و فعل سے بھی دنیا تسخیر کر سکتا ہے تو پھر ساری کاوشیں بیکار!!!

حصولِ اقتدار کیلئے دن رات نفاذِ اسلام کا نعرہ لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد اسلامی اقدار پر پہرہ! ملک کی معیشت کو اسلامی خدوخال پر استوار کرنے کا دعویٰ مگر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور امریکا بہادر کے احکام کا پہناوہ! جہاد افغانستان اور کشمیر کی جیتی ہوئی بازی استعمار کے کہنے پر ہار دی۔ کشمیر پچھلے تریسٹھ سالوں سے ظلم و ستم کا شکار ہے لیکن کشمیر کو فتح کرنے کے دعویدار اقوام متحدہ میں اس مسئلے کو اٹھانے سے گریزاں ہیں۔ اگر کوئی جماعت مکمل دین حق کا نفاذ چاہتی ہے تو اس کو ملک دشمن اور بنیاد پرست کہہ کر الزامات کی بارش سے نواز دیا جاتا ہے۔ اغیار کے ساتھ ملی بھگت کر کے آج اسلام کو نظامِ عبادت کے طور پر تو قبول کیا جاتا ہے لیکن نظامِ حکومت کے طور پر اس کو ناقابل عمل سمجھ کر پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ اسلام جو کہ اخوت اور محبت کا درس دیتا ہے آج اس کے نام لیوا اور پیشوا اپنے مذموم مقاصد کیلئے تفرقہ بازی جیسی لعنت کو گلے لگا کر امت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔
ہمارے علماء کا آپس میں دست و گریباں ہونا، اتحاد کیلئے کی جانیوالی تمام کاوشوں کو اپنی ذاتی انا اور ذاتی مخاصمتوں کی بناء پر سبوتاژ کرنا، کہیں ایسا تو نہیں یہ دنیا کی چکاچوند اور خیرہ کر دینے والی روشنی ان کی آنکھوں کے ساتھ ان کے دل کو بھی اپنی زد میں لے چکی ہے اور اب کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا کام ان سے واپس لیا جا رہا ہے۔ (خدانہ کرے) اور یہ کام جو اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے خطہ ارض پر نہ ہو سکا، اب اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان افغانوں اور کشمیریوں سے لے لے جنہوں نے فی الواقع جہاد کر کے دنیا کی ایک سپر طاقت کو ٹکڑے کر ڈالا اور بہت جلد دوسری سپر طاقت کی ریشہ دوانیوں کا بھی عبرتناک انجام ہو کر رہے گا کیونکہ اب وقت نے بھی اس بات کی گواہی دے دی ہے کہ:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی

آیئے آج اپنے اسلاف کے کارناموں کی روح کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچیں کہ ہمیں دنیا و آخرت کی فلاح کیلئے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ کیا وہی راستہ وہی نظام حکومت، وہی نظام عدل جس میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ہمیشہ ہر پہلو پر رہنمائی حاصل کی گئی اور جس

کے طفیل حامل کتاب وسنت کو دنیا کو امام بنادیا گیا یا پھر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے دوری جس نے واقعی ہمیں ہر چیز سے دور کر دیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں حق پر چلنے اس پر عمل کرنے اور اس کی بر ملا حمائت کرنے کی توفیق نصیب فرمائے ثم آمین

بروز منگل 22 محرم الحرام 1432ھ 28 دسمبر 2010ء

مشکلات اوراس کا حل

آج کسی بھی ٹی وی چینل یا کسی اخبار کو دیکھ لیں تو ہمیں ہر جگہ دم توڑتی ہوئی انسانیت کے روح فرسا مناظر دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ زندگی جو کہ بہت مختصر ہے بے شمار مسائل کا شکار ہو چکی ہے۔ ان مسائل کا حل تو درکنار اب تو یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان مسائل حیات کو گنا جا سکتا ہے ۔ روٹی کپڑے مکان کا مسئلہ، تعلیم کا مسئلہ، جنگ وامن کا مسئلہ، انفرادی واجتماعی، معاشی ومعاشرتی، ذہنی ونفسیاتی، خانگی وتمدنی، تہذیبی و مذہبی، فکری وجذباتی، قومی وبین الاقوامی، شعوری ولاشعوری مسائل اور پھر ہر مسئلے کے شاخ در شاخ اجزاء ان تمام مسائل کے دیو پیکر لامتناہی جال نے ہماری زندگی کی زمین وآسمان کو جکڑ رکھا ہے بلکہ اب تو ہلنے کی بھی تاب نہیں۔

اب ایک طرف تو ان مسائل نے زندگی پر یورش کر ڈالی ہے، دوسری طرف حوصلہ فرسا مناظر کہ ان میں کسی بھی ایک مسئلہ کا کامیاب حل آدمی کی خود ساختہ تدابیر کے ہاتھوں انجام نہیں پا سکا، جو تدبیر عمل میں لائی گئی اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، جو دوا استعمال کی اس کا الٹا رد عمل ہوا۔ اب تو ہزاروں تدابیر کی ناکامیاں بھی ان گنت مسائل کے ڈھیر میں اضافہ کا موجب بن چکی ہیں اور ان مصائب کی لاشوں کے درمیان سے مسائل سر اٹھا کر آدمی کا پھر سے تعاقب شروع کر دیتے ہیں اور آدمی ان مسائل کی طرف خوف مایوسی اور اضطراب وکرب کے ناگفتہ بہ عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے، کبھی گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے، کبھی ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا بھی ہے مگر جلد ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ اٹھتا ہے لیکن مسائل زندگی کے اس ہجوم سے اس کو برائے نام بھی نجات نہیں ملتی کیونکہ زندگی کے یہ عملی مسائل زندگی کے ایسے ٹھوس مسائل بن گئے ہیں کہ آدمی ان سے جتنا دور بھاگتا ہے یہ اتنے قریب آجاتے ہیں۔ یہ جب ان سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے مسائل اس کا دامن پکڑ کر تمام راستے مسدود کر دیتے ہیں۔ اگر یہ خاموش ہوتا ہے تو یہ اس کو آواز دیکر اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ اگر انسان چیخنے لگتا ہے تو مسائل خاموش تماشائیوں کے ہجوم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، انسان اگر سوتا ہے تو پریشان خوابوں کے آسیبی حملوں کی شکل میں مسائل کا دیو سوار ہو جاتا ہے۔ بیداری کی شکل میں اپنا ہی منہ نوچ لینے کی ترغیب ذہن میں سوار رہتی ہے۔ اگر ان مسائل پر قہقہہ مارنا چاہے تو مسائل کی آہ وزاری میں اس کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔ اگر رونا چاہے تو مسائل انسان کی بزدلی پر قہقہے لگاتے ہیں یعنی کہیں اور کسی طرح بھی وہ ان مسائل کی زد سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

آخر ان مسائل سے نجات کا کوئی راستہ بھی ہے؟ ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کو واقعی حل کیا جائے۔ ان کو بھلایا یا ٹالا نہیں جا سکتا، ان کو گھٹانے اور ہٹانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ مسائل زندگی کے ساتھ شروع تو ہوتے ہیں لیکن زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے بعد یہ آدمی اپنے مسائل کا بوجھ اپنے لواحقین کیلئے چھوڑ جاتا ہے اور کچھ مسائل کی جوابدہی کا گراں بوجھ اپنے سر پر لئے دوسری دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں سے وہ اپنی خبر کو بھی پہنچانے سے قاصر ہے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کی ہمت ہے کہ اس کی معمولی سی بھی مدد کر سکے۔ ان مسائل کے شور نے انسانی زندگی کو گوشۂ محشر بنا کر رکھ دیا ہے۔ جہاں خاندانی نظام ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے وہاں معاشرتی نظام پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ جہاں قومی ڈھانچہ بگڑا، وہاں بین الاقوامی زندگی تلپٹ ہو رہی ہے۔ نظریں سراسیمہ اور کان پھٹے جا رہے ہیں۔ دل ودماغ سرد بگریباں ہیں۔ جنسی انارکی قیامت بن چکی ہے۔ عدالتی نظام تماشہ ہو گیا ہے۔ تعلیمی اداروں میں مجرموں کی پرورش ہو رہی ہے، بیویاں شوہروں سے بے وفائی کر رہی ہیں اور شوہر بیویوں کی حق

تلفی کر رہے ہیں اور اولاد ماں باپ سے نہ صرف گستاخ ہے بلکہ حملہ آور ہے۔ پولیس مجرموں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ عملی ایجادات کی کوکھ سے تباہ کاریاں جنم لے رہی ہیں، روحانی سکون کا تصور تک محال ہو چکا ہے۔ جسمانی کھنڈروں میں بیماریوں اور وباؤں کا طوفان برپا ہے اور یہ سب کچھ اس دور میں ہو رہا ہے جہاں زندگی کے اسباب و وسائل اپنے نقطہ عروج پر ہیں۔ آسمان کے دور افتادہ گوشے بھی آج سائنس کی بدولت منور ہو چکے ہیں مگر زندگی زمین کی سیاہ رات میں دربدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ انسان کے ہاتھ کی تخلیق آج کشش ارضی سے نکل کر کسی اور جہاں میں محو پرواز ہے لیکن زندگی کو زمین پر چلنا دوبھر ہو گیا ہے۔ انسانی آلات آج خطرناک امراض کا سینہ چیر کر غیر مرئی جراثیم کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں لیکن انسان کی زندگی پھر بھی گھٹ رہی ہے۔ آخر ان تمام ناکامیوں کا سبب کیا ہے؟ یہ جو
مسائل کا دائرہ کار بڑھتے بڑھتے ہماری زندگیوں کو گہنا رہا ہے آخر اس کی حد کہاں ختم ہو گی؟ ان مسائل کا نقطہ آغاز ہے کیا؟

یہ ہیں چند سوالات جو کہ پھر سے آج ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں۔ آج فرد اپنے انفرادی مسائل اور قومیں اپنے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کیلئے سنجیدگی سے خواہاں ہیں تو ان کو اس زاویے سے اپنی سوچ کا آغاز کرنا ہو گا کہ بنیاد کی درستگی ہی پوری عمارت کی درستگی ہے۔ جس طرح بیج کے اندر جھانک کر پورے درخت کی گزشتہ و آئندہ تاریخ کا بھرپور مطالعہ ممکن ہے، ایٹم کے اندر کائنات کی اصل تصویر کا مطالعہ ممکن ہے، اسی طرح ہر شئے اپنی اصل ہی سے چلتی ہے اور اصل ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ زندگی کی ہر حقیقت ایک گولائی کا سفر ہے "کل شئ یرجع الی اصلہ" ہر شئے جہاں سے شروع ہوئی ہے وہی لوٹ کر آتی ہے۔ "تو گویا مسائل کے نقطہ آغاز کا سراغ ان کی انتہا اور انجام کا سراغ ہے"۔

جب سے انسان نے اپنے مسائل کو خدا سے بے نیاز ہو کر خود حل کر لینے کی ہولناک حماقت کا ارتکاب کیا ہے، آج تک کسی مسئلے کا دائمی حل نہیں کر سکا اور نہ ہی کر سکے گا۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کیلئے زندگی کے اس سفر کا از سر نو آغاز کرنا ہو گا اور اسی انداز میں کرنا ہو گا جیسا اس کائنات کے خالق نے بتا رکھا ہے کیونکہ زندگی ایک ایسا پیچ و خم سے بھرپور راستہ ہے کہ قدم قدم پر مسائل کے پڑاؤ ہیں، فکر و نظر اس سفر کا نقشہ اور خاکہ ہیں اور اخلاصِ نیت اس خاکہ میں رنگ بھر کر اس سفر کی منزل تک پہنچانے میں معاون ثابت ہو گی اور منزل کا نام ہے "ہدائت"۔ ہدائت
خدا نے کسی کے ہاتھ میں نہیں رکھی، یہ وہ تحفہ ہے جو صرف خدا کے دستِ خاص سے ہی مل سکتا ہے۔ خود خدا کا در ہی اس متاع بے بہا طلب کرنے کا واحد آستانہ ہے۔ اس در کو چھوڑ کر ہدائت کیلئے آدمی نے جس دروازے پر بھی دستک دی ہے اس کو ضلالت ہی ملی ہے۔ علم جہل اور عقل دیوانگی کی شکل میں اس کے دامن میں آئی ہے۔ اسی طرح دولت افلاس اور سامان بے سروسامانی کی شکل میں ڈھل گیا ہے۔ آج کامیابی اور

فلاح کا سامان جتنا انسان کے پاس موجود ہے اتنا کبھی نہیں تھا لیکن آدمی آج جس قدر کامیابی سے محروم اور تہی دامن ہے اتنا شائد کبھی نہ تھا۔ اس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ انسان نے خدا سے اپنا تعلق یا تو منقطع کر لیا ہے یا پھر اگر ہے تو اس کے یقین کی کمی آ گئی ہے۔ یہ ہے وہ اصل چیز جس نے عہد حاضر کو کامیاب ساز و سامان کے باوجود مکمل طور پر ناکام کر دیا ہے۔

اب جب کہ حالات وواقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ آدمی کبھی خود کچھ نہیں کر سکا اور جب بھی کچھ ہوا ہے وہ اس نے خدا سے کروایا ہے تو پھر کیوں نہ خدا سے تمام مسائل کو حل کرانے کی راہ پکڑی جائے۔ اس کیلئے پہلی صورت تو یہ ہے کہ آدمی جو علم کو عمل کا محتاج سمجھتا ہے اور پھر اس عمل کو خدا کا درجہ دیکر اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے، اس سے تائب ہو کر خدا کو روح عمل اور اصل فعال قوت سمجھ کر خدا کا پجاری بن جائے ۔ وہ جان لے کہ جس طرح عمل علم کا محتاج ہے اسی طرح علم بھی اللہ کا محتاج ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے صرف تھوڑی دیر کیلئے اپنی زندگی کے سفر پر ہی نگاہ ڈال لے جو زمین پر اس کے ظاہر ہونے سے قبل کہاں سے شروع ہوا۔ رحم مادر سے لیکر پیدائش تک کس کا محتاج تھا، پھر پیدائش سے لیکر لڑکپن اور جوانی تک ماں باپ اور دوسرے وسائل کا دستِ نگر رہا، کہیں بھی اس نے اپنا مسئلہ خود حل نہیں کیا بلکہ خدا کا ہاتھ ہی اس کے مسائل کو حل کرتا رہا۔ پھر اس مختصر زندگی کے بعد موت کے وقت سے اپنے مٹائے جانے کے مراحل تک پھر خدا اور اس کی ہدائت کا قطعی محتاج۔ کوئی اس کو بناتا ہے تو یہ بن جاتا ہے، کوئی مٹاتا ہے تو اس کی مجال نہیں کہ اس کے حکم کی روگردانی کر سکے۔ پھر اس کو مٹائے جانے کے بعد بنائے جانے کے باب میں تو وہ قطعی طور پر خدا کا محتاج ہو گا۔

پھر کیسا یہ ظلم ہے کہ باوجود ان تمام حقائق کے کہ وہ شروع میں بھی خدا کی ہدائت کا محتاج، اس کا انجام بھی خدا کی ہدائت کا محتاج لیکن رحم مادر سے لیکر قبر تک وہ اس خدا سے بے نیاز ہو کر چلنا چاہتا ہے۔ بس اسی احمقانہ ارادے کی بدولت اس نے دنیا میں تباہی پھیلا رکھی ہے اور اب ان تمام مسائل میں ایسا الجھا ہے کہ اس کو سلجھانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں رہی۔ قرین انصاف تو یہ ہے کہ ایسے باغی کیلئے ہدائت کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں لیکن اس کریم رب نے اس محتاج ہستی کیلئے فرشتوں کو زمین پر اتارا، اپنے انبیاء ورسل کا سلسلہ جاری فرما کر ہدائت کے دروازے کھول دیئے اور وعدہ فرمایا کہ اگر تم واپس میرے طرف ہدائت کیلئے رجوع کرو گے تو تمہارا استقبال کیا جائے گا۔ "وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ یعنی ہماری راہ میں سعی و عمل کرو گے، ہم سے ہدائت طلب کرو گے تم پر کامیابی کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ قوموں سے وعدہ فرمایا "إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ" کہ اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو تمہاری مدد کی جائے گی۔

یہ ہے دراصل وہ ہدائت جس کے بغیر کوئی بھی فرد مسائل حیات کی صحیح راہ دریافت نہیں کر سکتا، پھر کیوں نہ اس خدا سے راہِ ہدائت طلب کی جائے جس کے وعدوں کو ہم کئی دفعہ آزما چکے ہیں۔ کیوں نہ خدا سے مانگنے کا ڈھنگ سیکھیں اور زندگی کی دو عملی سے توبہ کر کے آج ہی اس کے دربار میں جھک جائیں ۔ آج جن الفاظ میں ہم اپنے رب کی ہدائت کے طالب ہیں ان میں تبدیلی لائیں، زبان سے نہیں بلکہ اپنے قلب کو اس کی طرف متوجہ کر کے ہدائت کے

طالب بنیں۔ ہم اپنی حقیقی زندگی سے جو چاہ رہے ہیں وہی دراصل اپنے رب سے مانگ رہے ہیں۔ خدا ہمارے لفظوں کو نہیں بلکہ ہمارے قلوب اور اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ہم اپنے اصل وجود میں جس چیز کے طلبگار ہیں اس کیلئے بے قرار بھی ہیں؟

جس طرح یہ ممکن نہیں کہ بچہ ماں سے روٹی طلب کرے اور ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے اسی طرح خدا جو ماں سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے اس کو کیسے گوارہ ہے کہ بندہ اس سے ہدائت طلب کرے اور وہ اس کو گمراہیوں میں بھٹکنے دے۔ بندہ خدا سے خشیت مانگے تو خدا اسے قساوت دے، بندہ خدا کی یاد مانگے تو وہ اسے نسیاں میں مبتلا کر دے، بندہ آخرت کی تڑپ مانگے اور وہ اس کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ بندہ کیفیت سے بھری دنیاداری مانگے اور وہ بے روح دنیاداری میں مبتلا کر دے۔ بندہ خدا سے حق پرستی مانگے اور وہ شخصیت پرستی کی تاریک راہوں پر ڈال دے۔ گویا ہماری مطلوب چیز کا نہ ہونا اس کا ثبوت ہے کہ ہم نے اپنے رب سے مانگا ہی نہیں۔ اگر ہمیں دودھ خریدنا ہو تو چھلنی لیکر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے باوجود ہم خالی ہاتھ لوٹیں گے۔ اسی طرح زبان پر دعائیہ کلمات جاری ہوں لیکن اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو گویا نہ ہم نے مانگا اور نہ ہی ہمیں ملا۔ یہ تو مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ بندہ آخرت میں اس کو حسرت کی نظر سے پوچھے کہ اس نے دنیا میں کچھ مانگا اور اسے محروم رکھا گیا، یہ تو ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانوں کے ساتھ ہمارے قریب ترین ہو کر آواز دیتا ہے: "کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں"۔

تاریخ گواہ ہے اللہ نے ہمیشہ اپنے وعدوں کو پورا فرمایا۔ انسانی تاریخ تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کے ہر ورق کی ہر سطر میں خدا کے تکمیل وعدہ کے انمٹ ثبوت روزِ روشن کی طرح ہمیں ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بے سروسامانی، پامالی اور شکستہ حالی سے کون واقف نہیں تھا لیکن فرعون کی جابر و قاہر حکومت ان کا بال بیکا نہ کر سکی۔ خود فرعون کی لاش کو خشکی پر چند فٹ زمین قبر کیلئے نہ مل سکی۔ نمرود نے آگ کا ایک مہیب الاؤ جو سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے تیار کیا تھا وہاں رب کے وعدوں نے امن و سکون کا گلشن پیدا فرمایا۔ آج نمرود اور نمرودیت کا نشان تک نہیں مگر ابراہیم علیہ السلام اور ابراہیمیت کی خاک سے سینکڑوں رسالت کے چاند نمودار ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ جن پر کوئی حکومت کرنا پسند نہیں کرتا تھا، وہ جب خدا کی ہدائت کے ساتھ اٹھے تو دنیا کی تہذیب کے کئی ایک باب تحریر کر گئے۔ وہ جن کے قدموں پر ظلم و وحشت کی دھول جمی ہوئی تھی، خدا کی ہدائت کے بعد جہاں بھی ان کے قدم گئے خوشحالی اور امن اس جگہ کا مقدر ٹھہرا۔

آیئے! اگر واقعی آپ ان مشکلات سے گلوخلاصی چاہتے ہیں تو راہِ ہدائت کیلئے اپنے قلوب کو دوبارہ اپنے رب کی تعلیمات سے جوڑیں۔ اپنی جبینوں کو اسی رب کے سامنے خاکستر آلودہ کریں کہ واقعی ہدائت کے خزانوں کا صرف وہی مالک ہے۔ آج ہی اپنی ذات سے اس نیک کام کا آغاز کریں، تاکہ کل کی صبح کا سورج ہماری کامیابی کا گواہ ہو۔ ربّ کریم سے دعا ہے کہ ہمیں "ہدائت" کی دولت سے مالا مال فرمائے ثم آمین

بروز جمعرات 24 محرم الحرام 1432ھ 30 دسمبر 2010ء

ایمان کی کمتری

"میں کل لندن پہنچ رہا ہوں میرا قیام صرف آٹھ گھنٹے کا ہو گا، میں خصوصی طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کیا آپ کے پاس وقت ہو گا کہ ایک گھنٹہ ہم اکٹھے مگر اکیلے گزار سکیں۔" میں اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا،، کیوں نہیں، میں آپ کو خود لینے کیلئے ایئر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔
میں نے اس کی فلائٹ کی تفصیلات ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر محفوظ کر لیں۔

اس کا بچپن اور جوانی امریکی ریاست ایریزونا میں بسر ہوئی۔ یہ ریاست بے آب و گیاہ پہاڑوں، ریگستانوں اور تھوڑے سے باغات کی وجہ سے بالکل ایسے لگتی ہے جیسے بلوچستان ہے۔ اگر ان وادیوں کے درمیان ایک شاندار موٹروے نہ گزر رہی ہو اور جگہ جگہ خوبصورت ہوٹل اور پٹرول پمپ نہ ہوں تو ایسے لگے جیسے سوراب سے پنجگور جا رہے ہیں یا پھر کاکڑ خراسان سے لورالائی جا رہے ہیں۔

میساچوسٹس یونیورسٹی سے اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور ایک عام امریکی کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ چونکہ ایک ایسی ریاست سے اس کا تعلق تھا جہاں پانی کی کمی کا مسئلہ تھا، اس لئے اس نے اپنے علم کو پانی کی تلاش اور ترسیل کیلئے مخصوص کر لیا۔ اکثر پڑھے لکھے امریکیوں کی طرح اسے بھی عالمی اداروں اور بڑی بڑی عالمی کمپنیوں میں ملازمت ملنا مشکل نہیں تھی۔ اسے بھی ایک ایسی ہی ایک انٹرنیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کی وجہ سے اسے افریقہ کے ایسے ممالک میں کام کرنے کا موقع ملا جہاں قحط، خشک سالی، غربت اور محکومیت ہر جگہ نظر آتی تھی۔ یہاں اس امریکی کے سامنے اس کے اپنے ملک اور اپنے ہم مذہب لوگوں کا دہرا معیار پہلی دفعہ نظر آیا۔ صومالیہ میں اس کی پوسٹنگ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے نام پر آئے ہوئے امریکیوں کو ایک خاص تعصب کے ساتھ مسلمانوں پر گولیاں برساتے دیکھا ۔ اس نے سوڈان میں کیمیائی ہتھیار تباہ کرنے کے نام پر وہاں کی سب سے بڑی دوائیوں کی فیکٹری تباہ ہوتے دیکھی، جس کے بعد وہاں کے مسلمان عام اسپرین کی گولی کیلئے بھی ترسنے لگے۔

میری اس سے ملاقات آج سے گیارہ سال پہلے جنوری 1999ء میں ایشین ڈویلپمنٹ بینک کے ہیڈ کوارٹر منیلا میں ہوئی۔ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ ہزاروں کمروں کی اس عمارت میں اس کے کمرے کے باہر بسم اللہ الرحمن الرحیم کی خوبصورت گولڈن تختی لگی ہوئی تھی۔ یوں تو منیلا کے شہر میں ہزاروں مسلمان رہتے ہیں اور ایشین بینک میں کئی سو مسلمان کام بھی کرتے ہیں جن میں پاکستانی بھی ہیں لیکن جس کمرے کے دروازے سے اس بات کا اظہار ہو کہ وہ مسلمان ہے، وہ جوزف کا کمرہ تھا جو اب اپنے آپ کو یوسف کہتا تھا۔ ایک گورا امریکی جسے اللہ تعالیٰ نے ہدائت دی تو اس نے صومالیہ کی ایک کالی مسلمان لڑکی سے شادی کر لی۔ ہدائت کا نور بھی عجب ہے، آدمی کے ارد گرد اپنا ہالہ بنا لیتا ہے۔ منیلا کے مسلمان بھی اس ہالے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ دیکھتے تھے کیا عجیب امریکن ہے، انگریزی بول رہا ہو تو ہمیشہ خدا کے ذکر پر اللہ سبحانہ تعالیٰ پڑھتا ہے "گاڈ" کا لفظ قطعاً استعمال نہیں کرتا۔ اور پیارے محمد ﷺ کا نام آئے تو پورا درود شریف پڑھتا ہے۔ وہ تمام الفاظ جو مسلمان کی پہچان ہیں جیسے اسلام علیکم، بسم اللہ، سبحان اللہ اور الحمد اللہ، سب اسی طرح بولتا ہے۔ کبھی اس نے "ہائے، تھینکس گاڈ، گڈ لک" نہیں کہا۔ اتنے بڑے ادارے میں کام کرتا ہے، ہزاروں تقریبات ہوتی ہیں، کسی کی بات پسند آجائے تو تالی نہیں بجاتا، زور سے اللہ اکبر کہہ دیتا ہے۔

اس کے گھر میں ایک عجیب عالم تھا جو میں نے دیکھا۔ حجاب میں ملبوس ایک بیوی اور ایک سات سالہ بیٹی، میں جس دن اس کے گھر گیا تو یوسف نے بتایا آج کے دن یہ پیدا ہوئی تھی لیکن اس گھر میں کوئی سالگرہ کا سماں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا تو بچی نے خود کہا میں سالگرہ نہیں مناتی۔ میں نے کہا اس میں دوست آتے ہیں، تمہیں تحفے ملتے ہیں۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا "میرے ماں باپ ہی میرے بڑے گہرے اور اچھے دوست ہیں اور میری اچھی باتوں سے خوش ہو کر تحفے دیتے ہیں، پھر اس رسم کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تحفے کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ "آپ کو شائد علم نہیں کہ میری والدہ حافظِ قرآن ہیں اور میں نے بھی اپنی والدہ کی مدد سے پچھلے ہفتے مکمل قرآن کریم حفظ کیا ہے، بھلا اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ "یوسف کی بیوی نے کہا "ہم لوگ یہاں کسی کلب وغیرہ میں نہیں جاتے، ڈانس نہیں کرتے لیکن ایک دفعہ ہم تینوں بے اختیار خوشی سے ناچ اٹھے جب پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔"

لیکن جس بات نے مجھے حیرت اور شرمندگی میں ڈال دیا وہ شائد ہم سب کو بحیثیت مسلمان حیرت میں ڈال دے ۔ میں اس کے ساتھ ایشین بینک کے ایک کمرے میں جسے لوگوں نے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کیا تھا، نماز پڑھنے گیا۔ میں قصر کی آدھی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر میں باہر آ گیا، لیکن اسے وہاں سے باہر آنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص میرا اتنا بھی خیال نہیں کرتا، مجھے باہر کھڑا کر گیا۔ میں سوچ رہا تھا اور کڑھ بھی رہا تھا کہ وہ میرے پاس آیا اور بڑی شرمندگی اور انتہائی عاجزی سے کہنے لگا کہ ،، اصل میں تم لوگوں نے بچپن سے اللہ تعالیٰ کا ذکر سنا ہوتا ہے ، مسلمان گھر میں پیدا ہوتے ہو، اس لئے تم نماز پڑھتے ہو اللہ تعالیٰ کا تصور ذہن میں لانے میں کتنی آسانی ہوتی ہے، مجھے تو آدھ گھنٹہ لگ جاتا ہے، اپنے ذہن کو یکسو کر کے اس کیفیت لانے میں کہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہوں۔ آپ مہربانی کر کے کوئی ایسا طریقہ بتاؤ کہ میں جلدی سے اللہ تعالیٰ کے تصور میں اپنے آپ کو یکسو کر سکوں" ۔ میری آنکھوں سے یک دم آنسو چھلک پڑے، شرم سے میرا سر جھک گیا۔ میرے دامن میں ایمان کی کمتری کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں شرمندہ کیوں نہ ہوتا، ہم تو اللہ میاں کے سامنے جاتے ہوئے اتنا بھی خوف نہیں کھاتے جتنا ایک پٹواری یا تھانیدار کے سامنے جاتے ہوئے کھاتے ہیں۔ ہم انگلش میڈیم میں چار جماعت پڑھ لیں تو ہمیں اتنی دیر تک سکون نہیں ملتا جب تک تھوڑا منہ ٹیڑھا کر کے "وش یو گڈ لک، اوہ گاڈ" نہ کہہ لیں۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی دیکھ کر یوسف مجھ سے متاثر ہو رہا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے رو رہا ہوں، حالانکہ میں تو اپنے ایمان کی کمزوری، اپنے عمل کی کمتری اور شرمندگی کی وجہ سے رو رہا تھا۔ صحیح تھا، تھانیدار، پٹواری، وزیر، چیف سیکرٹری، گورنر اور وزیر اعلیٰ ایسے کئی خداؤں کے سامنے خوف سے کانپنے والے مجھ جیسے مسلمان ایک اَن دیکھے اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے خوف سے کانپ سکتے ہیں؟ رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے بھید جانتا ہے!

بہت شدید تشنج میں مبتلا لوگو!
یہیں قریب، محبت کا ایک قریہ ہے
یہاں دھوئیں نے مناظر چھپا رکھے ہیں
مگر افق بقا کا وہاں سے دکھائی دیتا ہے
یہاں تو اپنی صدا کان میں نہیں پڑتی
وہاں خدا کا تنفس دکھائی دیتا ہے

بروز ہفتہ 26 محرم الحرام 1432ھ یکم جنوری 2011ء

معاشی دہشت گرد

میں پچھلے کئی ماہ سے یہ بری طرح محسوس کر رہا ہوں کہ واقعی کوئی زور دار بد دعا ہمارے تعاقب میں ہے، نہ پوری قوم کی دعائیں رنگ لا رہی ہیں اور نہ ہی تہجد گزاروں کا گریہ نیم شب کام آ رہا ہے۔ مایوسی ساون کی ہریالی کی طرح وطن عزیز میں اپنا زور بڑھاتی جا رہی ہے۔ بے دلی اور بے زاری جسم و خوں میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ زندہ رہنے کی امنگ اور آس ختم ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ حکمرانوں کی پالیسیوں کے رد عمل میں بے یقینی کی آکاش بیل ذہن و فکر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور ناامیدی کا زہریلا شیش ناگ دن میں کئی مرتبہ آپ کے خوابوں کو ڈستا ہے۔ دن اور رات جیسے آگ کے الاؤ میں بھسم ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ دوست اب بھی امید کی قندیل جلائے کسی صلاح الدین ایوبی کا انتظار کر رہے ہیں۔ امید اندھی ہوتی ہے اور یقین بھی دلیل نہیں مانگتا۔ ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور انشاء اللہ حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن حالات کی حقیقت سے آنکھیں چرا کر ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں ان خطرات کو ٹال نہیں سکتے۔ صرف بارش کی امید سے دہکتی تمازت بھری دھوپ کی اذیت ناکی سے تو بچ نہیں سکتے۔ اس دور دیس میں بھی وطن کی مٹی نے اس قدر اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے کہ شب و روز اس کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہر روز خوابوں کی جواں مرگی کی اطلاع موصول ہوتی ہے۔ پاکستان جو ہمارے وجود کا ایک قیمتی حصہ ہے جہاں ہماری آبرو کو تحفظ اور سروں کی سلامتی کی ضمانت ملی تھی اب خاک میں ملانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں (خاکم بدہن)۔

یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جن مہیب اور خطرناک مسائل کا اس قوم و ملک کو سامنا ہے اس کے تدارک کی سبیل نہ تو موجودہ سیاسی قیادت کو ہے اور نہ ہی ہمارے عسکری کمانڈروں کو کچھ سوجھ رہا ہے۔ ان خطرناک مسائل کا حل نہ تو مذاکرات میں ہے اور نہ ہی طاقت کے استعمال میں، تو کیا ہم امریکہ یا قبائلی مزاحمت کاروں کے سامنے ہتھیار پھینک کر دوبارہ غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیں۔ 16 دسمبر 1971ء کو ہتھیار پھینکنے کی رسوائی آج تک بدنما داغ کی سیاہی لئے ہمارے دامن پر موجود ہے۔ اب کیا قبائلی علاقے امریکہ کے سپرد کر دیں؟ آئے دن قصر سفید کا فرعون نئے مطالبوں کے ساتھ ہماری آزادی اور حرمت پر نہائت بے دردی سے اپنا کوڑا برساتا ہے، ادھر قبائلی مزاحمت کار کاروائی کرتے ہیں تو فضائی حملوں میں ہماری سپاہ اور علاقوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ مزاحمت کاروں کو مذاکرات کی دعوت دیکر کسی امن معاہدے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو فوراً ایک ہرکارہ کان مروڑنے کیلئے بے دھڑک آپ کے سر پر آکر غرانا شروع کر دیتا ہے، آپ فوری اس امن معاہدے سے منہ موڑ لیتے ہیں، ان داتا کا حکم مان لیتے ہیں تو قبائلی امن معاہدے کی خلاف ورزی پر اپنی مزاحمتی توپوں کا رخ اپنی پوری طاقت کو مجتمع کر کے ہماری سیکورٹی فورسز کی طرف پھیر دیتے ہیں اور اپنا دائرہ کار خودکش حملہ آوروں کی شکل میں شہروں میں منتقل کر دیتے ہیں، آپ کی پریشانیوں میں جب مزید اضافہ ہوتا ہے تو دوبارہ امن جرگے تشکیل دیکر منت سماجت اور بھاری معاوضوں کے ساتھ قبائلی گرفتار افراد رہا بھی کر دیتے ہیں۔ یہ صورت حال آخر کب تک چلے گی؟

قبائلی مزاحمت کار آپ سے سنبھالے جاتے ہیں نہ قصر سفید کا فرعون آپ کی بات سنتا ہے۔ امریکہ مذاکرات کیلئے تیار نہیں اور اس جنگ کو ہماری سرحدوں سے ہمارے ملک کے اندر لانے کیلئے بے تاب بیٹھا ہے امریکہ کے نمک خوار سرخ استقبالی قالین لئے بے چینی سے انتظار کی گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ وہ آئے دن نمرود کی سلطنت میں بیٹھ کر سیاسی آگ کے شعلہ نواز بیانوں سے ملک کو جلانے کا ساماں تیار کر رہے ہیں آپ کے پاس ان تمام

خطرات سے بچاؤ کی عملی تدابیر نہیں، حکمت عملی یا اسٹریٹجی موجود نہیں، صرف اپنی حاکمیت اعلیٰ کی دہائی دے رہے ہیں جو "این آر او " کے عوض کب کی مضروب اور زخموں سے چور ہو کر قصر سفید کے فرعون اور ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ کے نمرود کے قدموں میں دم توڑ چکی ہے۔

18 فروری 2008ء کے عظیم الشان واضح عوامی مینڈیٹ کے افق سے طلوع ہوتے سلطانی جمہور کے آفتاب وماہتاب کی نمائندگی کرنے والے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی، امریکا میں پاکستانی سفیر حسین حقانی اور پاکستانی وزارت داخلہ کے ذمہ دار رحمان ملک کی گفتگو سنیں تو یہی پیغام ملتا ہے کہ اس بد نصیب پاکستانی قوم کی کم نصیبی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی تو موسم گل کی آمد میں کافی دیر ہے۔

قارئین! اگر آپ کو یاد ہو تو پہلی مرتبہ جس دن اس بد نصیب پاکستانی قوم کا وزیر خارجہ واشنگٹن میں شہزادی کونڈالیزا رائس کے دربار میں شرف باریابی حاصل کر کے باہر نکلا تھا تو پہلا خوشامدی بیان اپنی حاکمیت اعلیٰ کے دفاع کی بجائے مذاکرات کو بہت بے تکلفانہ، دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ قرار دیا تھا حالانکہ وزیر خارجہ کو شہزادی کونڈالیزا رائس سے ملاقات سے قبل امریکی سرپرستی میں نیٹو افواج کے اس مکروہ حملے کی اطلاع دی جا چکی تھی جس کا اعلان پاکستانی سپاہ کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس دنیا کے ذرائع ابلاغ کے سامنے کر چکے تھے کہ امریکی حملہ میں پاکستانی علاقے انگور اڈہ کی فوجی چوکی پر پاکستانی سپاہ کے کم از کم چھ سیکورٹی اہلکار شدید زخمی ہوئے تھے جبکہ نیٹو کی افواج کے پاس غلطی اور لاعلمی کی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ نیٹو کی افواج کو اس علاقے میں قائم تمام پاکستانی چوکیوں کے قیام کی نقشوں کے ذریعے پیشگی اطلاع دی جا چکی تھی۔

عام توقع تو یہ تھی کہ وزیر خارجہ عظیم الشان واضح عوامی مینڈیٹ کے افق سے طلوع ہونے والے نئے جمہوری پاکستان کی ترجمانی کرتے ہوئے اس توہین آمیز امریکی رویے پر بھرپور احتجاج کریں گے۔ پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندے بڑی شدت سے منتظر تھے کہ وزیر خارجہ کا تعلق ایک عوامی جذبات اور احساسات کی علمبردار جماعت سے ہے اس لئے وہ دبنگ لہجے میں صدائے احتجاج بلند کریں گے اور امریکی ایوانوں کو مطلع کریں گے کہ اب یہ مشرف کا نہیں بلکہ سولہ کروڑ باغیرت پاکستانیوں کی سرزمین ہے جو اپنی خود مختاری کی حفاظت کا سلیقہ جانتی ہے، اگر ایسا حملہ ہوا تو وہ اس نام نہاد ،،وار آن ٹیرر،، سے نکل آئیں گے اور اپنا راستہ اپنی آزادانہ مرضی سے چنیں گے لیکن اس 45 منٹ کی ملاقات کے بعد وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی جب اس نمک کی کان سے باہر تشریف لائے تو نمک بن چکے تھے اور آج تک اپنی موجودہ حکومت کے ساتھ امریکا کی نمک حلالی کا عہد نبھا رہے ہیں کہ این آر او کا تقاضہ ہی یہی ہے۔

کچھ منزلیں اب اپنا پتہ بھی نہیں دیتیں
راستہ ایسا ہے کہ کٹتا بھی نہیں

جمہوری حکومت کا دعویٰ کرنے والے ہمارے وزیر خارجہ نے شہزادی کونڈالیزا رائس کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کو جب بہت بے تکلفانہ، دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ قرار دیا تو پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے پاکستانی علاقے انگور اڈہ کی فوجی چوکی پر چھ پاکستانی سیکورٹی اہلکاروں کے شدید زخمی ہونے کو،، غیر دوستانہ اقدام،، سے تعبیر کیا تو ہمارے وزیر خارجہ نے فوری طور پر اس کی تصحیح فرمائی اور اپنے فدویانہ بیان میں شیرینی کی حلاوت گھولتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس طرح کے سخت الفاظ استعمال نہ کریں۔ شائد وہ پاکستانی سیکورٹی اہلکاروں کے شہدا اور شدید زخمی ہونے کے عمل کو دوستانہ چھیڑ چھاڑ، بے تکلفانہ ہنسی مذاق یا محبوبانہ نازو انداز سے تشبیہ دینا چاہتے تھے۔ "

اگر تم بھی بڑوں میں ہو تو چھوٹا کس کو کہتے ہیں
بقول خود کھرے ہو تم تو کھوٹا کس کو کہتے ہیں
زیادہ تو نہیں لیکن مجھے بس اتنا سمجھا دو
اگر تم قومی لیڈر ہو تو لوٹا کس کو کہتے ہیں

زرداری رجیم نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کیلئے امریکہ کے در پر اپنی جبین نیاز کو اس قدر جھکا دیا ہے کہ اب امریکا سے آنکھیں ملانا مشکل ہو گیا ہے۔ غیرت اور حمیت سے عاری چلن کو قومی پالیسی اور حکمت عملی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ قصر سفید کے فرعون کو در پردہ اجازت مل چکی ہے کہ جہاں چاہو حملہ کرو، جس بستی کو چاہو نشانہ بناؤ، جس کو چاہو بھون ڈالو۔ ہماری زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ آئے دن ڈرون حملوں کے نتیجے میں بے گناہ پاکستانی جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں لقمہ اجل بن رہے ہیں اور صدر زرداری جو کہ ملک کی افواج کے سپریم کمانڈر ہیں، آخر کیوں اپنی سپاہ کو ان ڈرون حملوں کو روکنے کا کوئی حکم صادر نہیں کر رہے جبکہ آج سے کچھ سال قبل بھارتی سرزمین سے آنے والے اسرائیلی ڈرون جو کہ ان امریکی ڈرون سے کہیں زیادہ جدید اور حساس تھا، پاکستانی ایئر فورس نے چند منٹوں میں اس کو تباہ کر دیا تھا۔ اب تو ساری قوم موجودہ حکومت کی اس دو عملی سے بخوبی واقف ہو گئی ہے کہ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت پاکستانی حکومت نے امریکی حکومت کو اس بات کی اجازت دے رکھی ہے اور احتجاجی بیان محض دکھاوے کیلئے جاری کئے جاتے ہیں۔

قومی غیرت کا تو جنازہ نکل ہی چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ موجودہ حکومت نے ملک کے تقریباً تمام اداروں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ کسی زمانے میں پاکستان کی قومی ایئر لائن پی آئی اے دنیا کی بہترین کمپنی تصور کی جاتی تھی لیکن آج یہ عالم ہے کہ کرپشن، اقربا پروری اور بد انتظامی کی بدولت اربوں روپے کی خسارے کی بناء پر ملکی معیشت پر نہ صرف بوجھ بن چکی ہے بلکہ اس کے موجودہ مخدوش جہاز کسی بھی وقت کسی بڑے حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کی ایک معمولی سی مثال چند دن پہلے پی کے 757 جمعرات 23 دسمبر 2010 ء کو لاہور سے لندن آنے والی پرواز جو حسب معمول ہر جمعرات کو صبح 11:35 براراست لاہور سے لندن کیلئے روانہ ہوتی ہے جسے پروگرام کے مطابق لندن کے مقامی وقت کے مطابق دوپہر

تین بجے پہنچنا ہوتا ہے، جبکہ یہ شیڈول وقت سے پانچ گھنٹے تاخیر سے پہنچی۔ ایک بہت بڑے حادثے کا شکار ہوتے ہوئے بمشکل بچی ہے۔ جہاز کے اندر سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک سٹرک حادثے کے شکار کچھ مریض زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور ان مریضوں کیلئے جہاز کے باہر کئی ایمبولنس انتظار میں کھڑی تھیں۔ یہ شیڈول پرواز لاہور سے ساڑھے تین گھنٹے کی تاخیر سے چلی اور لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈے پر شدید فنی خرابی کی بناء پر اس کے مسافر دو گھنٹے تک جہاز سے باہر نہ نکل سکے ۔ اسی دوران اس پرواز کے مسافروں کا سامان پوری طرح ٹرمینل میں آف لوڈ کر کے ایک کونے میں ڈھیر لگا دیا گیا تھا۔ مسافر ایک قیامت سے فارغ ہو کر دوسری قیامت کے مصائب میں گھرے رہے لیکن اس قومی پرواز نے اپنی کارکردگی کا وہ ریکارڈ قائم کیا ہے جس کیلئے انسانیت کا شرم کے مارے سر جھک گیا ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ جہاز کسی حادثے کا شکار ہو جاتا تو بڑی آسانی کے ساتھ اس کو بھی کسی دہشت گرد کاروائی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے معاملے کو ختم کر دیا جاتا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہمارے صدر محترم اپنی اہلیہ محترمہ کی برسی پر خطاب فرما رہے تھے۔ بہت اچھا خطاب تھا۔ جناب زرداری بہت اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ہم تو اس وقت سے ان کے مداح ہیں جب وہ اپنی اہلیہ (مرحومہ) کی وزارتِ عظمٰی میں وزیر سرمایہ کاری تھے۔ جلنے والوں نے پتا نہیں کیا کچھ ان سے منسوب کیا مگر سب کو منہ کی کھانی پڑی۔ ویسے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ منہ کی کھانے کا کیا مطلب ہے؟ سب ہی منہ کی کھاتے ہیں البتہ آصف زرداری قسمت کا کھا رہے ہیں۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ اب وہ ہینڈرڈ پرسنٹ مسٹر کلین ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے طاقتور منصب پر فائز نہ ہوتے؟ تو ہم بات کر رہے تھے ان کے خطاب کی۔ ان کا ایک جملہ دل میں اتر گیا جو نہایت جامع اور گنجینہ معانی کا طلسم ہے۔ "اب میں خود وزیر اعظم اور دوسرے وزراء کی نگرانی کیا کروں گا تا کہ پاکستانی عوام کی بہتر خدمت ہو سکے"۔

جناب آصف زرداری نے یہ بھی فرمایا،، ہمارے ملک میں معاشی دہشت گردی ہو رہی ہے جس کا مقابلہ کیا جائے گا،، بلاشبہ انہوں نے بہت صحیح بات کی ہے حسب معمول اب یہ معاشی دہشت گردی نہیں تو اور کیا ہے کہ دہشت گردوں کے ہاتھوں مجبور مائیں اپنے بچوں تک سے جان چھڑا رہی ہیں ایدھی ہوم کے حوالے کر رہی ہیں یا کچرے کے ڈھیر میں پھینک رہی ہیں کہ ملک کی معیشت پر قابض دہشت گرد جینے کا حق نہیں دے رہے۔ ملک معاشی دہشت گردی کا شکار ہے تو اس کے پیچھے دہشت گرد بھی ہوں گے۔ لیکن یہ دہشت گرد کون ہیں؟

آثم کشمیری مرحوم کیا خوب یاد یاد آئے ہیں

آؤ اہل جنوں رقصِ بہاراں کر لیں
گر نہیں ساز سلاسل کی یہ جھنکار سہی
حق کی جو بات ہے ہر حال میں کہہ گزریں گے
سرِ منبر نہ کہیں گے تو سرِ دار سہی

بروز سوموار 28 محرم الحرام 1432ھ 3 جنوری 2011ء

"میں تم پر اعتماد نہیں کرتا"

پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکی مداخلت کی مسلسل کوششوں کے ثبوت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتے جارہے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد امریکی اور اتحادی فوجیوں اور منصوبہ سازوں کا فوری ہدف توبلاشبہ افغانستان اور اس کے بعد عراق تھا۔ لیکن یہ حقیقت مسلم دانشوروں سے کبھی پوشیدہ نہیں رہی کہ امریکا پر انتظامی اور مالی طور پر چھائے ہوئے یہود و نصاریٰ اپنی مشترکہ قوت سے دراصل دنیا بھر کے مسلمانوں کو کمزور و بے بس کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ وہ درحقیقت ایران، پاکستان اور سعودی عرب کو مسلم دنیا کے اتحاد اور اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ سعودی عرب مسلمانانِ عالم کا روحانی مرکز اور آرزوئوں کی سرزمین ہے۔ اس مرکز کو ختم کرنا عظیم تر اسرائیل کے نقشے میں شامل اور صہیونی منصوبے کا نہایت اہم حصہ ہے۔ مدینہ منورہ پر وہ پہلے ہی اپنا حق سمجھتے ہیں کیونکہ نبی کریمؐ کی ہجرت اور یہاں تشریف آوری سے پہلے یثرب میں یہودیوں کی کثیر آبادی تھی۔

آیت اللہ خمینی کے انقلاب کے بعد ایران نے امریکا اور مغرب کی بالادستی کو کبھی قبول نہیں کیا بلکہ امریکا کو بڑے شیطان کا نام دیا اور جب تک سوویت یونین کے افغان مجاہدین کے ہاتھوں پرخچے نہیں اڑ گئے۔ ایرانی قیادت کی نظروں سے وہ چھوٹا شیطان قرار پایا۔ اس صورت میں ایران کیلئے یہود و نصاریٰ کی دشمنی قابلِ فہم ہے، باقی رہا پاکستان، تو اسلام کی بنیاد پر وجود میں آنے والا یہ کمزور ملک جب ایٹمی قوت بن گیا تو بڑی طاقتوں کی نظر میں بری طرح کھٹکنے لگا۔ طاغوتی قوتیں ہرگز نہیں چاہتیں کہ دنیا کا واحد ایٹم بردار مسلم ملک پاکستان مضبوط و مستحکم ہو چنانچہ پچاس کے عشرے سے وطن عزیز میں امریکی مداخلت اور سازشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد پاکستان کا امریکا سے عملی تعاون اسے شاید فوری طور پر اتحادی فوجیوں کے حملوں سے بچانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اہل مغرب کی پاکستان دشمن سازشوں میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ نئے سال کی آمد پر شمالی وزیرستان پر ایک ہی دن میں چار ڈرون حملوں میں ۲۵ سے زائد افراد لقمہ اجل ہو گئے ہیں اور دو درجن سے زائد موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

امریکی ایوانِ نمائندگان کی انٹیلی کمیٹی میں شامل دونوں بڑی پارٹیوں یعنی ری پبلکن اور ڈیموکریٹک ارکان نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان، امریکا اور دنیا پر آئندہ دونوں پر ایک نہایت سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لہٰذا امریکا کو ایٹمی ہتھیاروں کے حامل پاکستان کیلئے ہنگامی منصوبہ تیار کر لینا چاہئے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ صدر سمیت امریکی انتظامیہ صہیونیوں کی مرضی و منشا کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ امریکا کی قومی پالیسیوں میں حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ بڑی تبدیلیاں واقع نہیں ہوتیں بلکہ ان کا تسلسل معمولی کمی و بیشی کے ساتھ ہمیشہ جاری رہتا ہے جبکہ اپنے وطن میں آئے دن کوئی نیا شگوفہ چھوڑ کر عوام و خواص کو کسی الجھن میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تاکہ عوام کے حقیقی مسائل اور ان کے اسباب و عوامل اور ذمے داروں سے توجہ ہٹائی جا سکے۔ پچھلے چند دنوں سے ذرائع ابلاغ کے علاوہ سرکاری حلقوں میں ہر جگہ اتحادی جماعتوں کا اچانک حکومت کو چھوڑ دینے کے اسباب و محرکات پر اس قدر شد و مد سے بحث و تمحیص جاری ہے گویا اس کے سوا ملک و قوم کا کوئی اور مسئلہ باقی نہیں بچا حالانکہ بقول شاعر ،،اور بھی غم ہیں زمانے میں سیاست (محبت) کے سوا،،۔ ہمارے ارباب اقتدار کے خیال میں وطن عزیز کو باہر سے نہیں بلکہ اندر سے خطرات لاحق ہیں جبکہ معروضی حقائق اس کے بالکل برعکس حالات کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

پاکستان اور امریکا پر آئندہ دونوں سخت مراحل آنے کا خدشہ ظاہر کرنے والے امریکی ایوان نمائندگان کی دونوں بڑی پارٹیوں کے ارکان نے صرف پاکستان کیلئے کسی ہنگامی منصوبے کی ضرورت کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ،، ایٹمی ہتھیاروں کے حامل ،، پاکستان کہہ کر اپنے عزائم بے نقاب کر دیئے ہیں۔ ویسے بھی امریکا بہادر کو پاکستان کے بارے میں اپنے منصوبے خفیہ رکھنے کی اب کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہمیں اپنا بندۂ بے دام سمجھ کر پختہ یقین رکھتا ہے کہ یہاں اس کی مرضی کے خلاف پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ پاکستان میں صورتِ حال خراب ہونے پر اس سے نمٹنے کی امریکی خواہش دراصل ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کا بہانہ تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس معاملے میں امریکی انتظامیہ اور اس کے اتحادیوں کو بہانے کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ اس نے افغانستان کو تباہ کرنے میں ہم سے پورا تعاون حاصل کیا ہے۔ جھوٹے منہ ہی سہی، وہ عالمی برادری میں پاکستان کو اپنا اہم اتحادی قرار دیتا ہے۔ امریکا کے لئے کسی ملک میں صورتِ حال خود خراب کر دینا ہرگز مشکل نہیں ہے۔

باب ورڈز کی مشہور زمانہ کتاب ،، اوباما وارز ،، میں خاص طور پر پاکستان کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جہاں مصنف کے مطابق امریکا اپنی ایک اہم خفیہ جنگ میں برسرپیکار ہے۔ اپنی اس کتاب میں اس نے انتہائی خوفناک انکشافات کئے ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں تحریر کرتا ہے کہ ،، امریکا نے پاکستان میں سرکاری اجازت سے کئی اڈے بنا رکھے ہیں جس میں کوئٹہ میں اڈہ قائم کروانے کیلئے سی آئی اے کا سربراہ خود پاکستان آیا۔ 17 نومبر 2009ء کو امریکی صدر اوبامہ کا خصوصی مشیر ٹونی بلیکن نے امریکا میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کو بتایا کہ گو پاکستان نے دہشتگردوں کے خلاف سوات اور وزیرستان میں بڑے کامیاب آپریشن کئے ہیں مگر اب بھی پاکستان کی کارکردگی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے اور امریکا کو پاکستانی انٹیلی جنس اور کچھ دہشتگرد گروپوں سے شکائت ہے اور پاکستان کو ان کے خلاف ہر روز کاروائی کرنا ہوگی۔ اس ملاقات کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد سی آئی اے کا ڈائریکٹر پنیٹا اسلام آباد آدھمکا جہاں وہ سیدھا آصف زرداری سے ملا اور اس کے فوری بعد عسکری قیادت سے اپنی ملاقات میں یہ مطالبہ دہرایا کہ "وہ امریکا کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں کیونکہ اس طرح پاکستان بچ سکتا ہے"۔

اس نے اپنی دھمکی میں زور دیتے ہوئے کہا کہ ،، طالبان کا کمانڈ اینڈ کنٹرول کوئٹہ میں ہے جہاں یہ بم وغیرہ بناتے ہیں جو بعد ازاں افغانستان میں امریکی اور اتحادی فوجیوں کی ہلاکت کا سبب بنتے ہیں اور کوئٹہ میں اسی لئے امریکی شہریوں کو بارہا قتل کیا جاتا ہے، اس لئے امریکا اب مزید برداشت نہیں کرے گا ،،۔ اس دھمکی کے بعد سی آئی اے نے کوئٹہ میں اپنی موجودگی کو لازمی قرار دیا۔ پاکستان نے یہ بات فوری مان لی اور اس طرح سی آئی اے نے کوئٹہ میں اپنا بیس قائم کرنے میں بالکل تاخیر نہیں کی۔ اس وقت کوئٹہ بیس میں سی آئی اے کے کافی ایجنٹ موجود ہیں اور ان ایجنٹوں کو پاکستان کی موجودہ حکومت نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ اگر انہیں ملا عمر یا طالبان کی اعلیٰ قیادت نظر آجائے تو فوری طور پر کسی کو اطلاع دیئے بغیر انہیں ہلاک یا گرفتار کر سکتے ہیں اور اس کے بدلے امریکا کوئٹہ میں ڈرون حملے نہیں کرے گا۔ کوئٹہ میں اپنا بیس قائم کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر پنیٹا نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ اب بھی پاکستان کی طرف سے کیا جانے والا تعاون کم ہے اور اب پاکستانی انٹیلی جنس کو سی آئی اے کے ساتھ مل کر پاکستان میں آپریشنز بڑھانے ہونگے اور اس کیلئے پاکستان میں سی آئی اے کے ایجنٹوں کو بڑی تعداد میں پاکستان آنا ہوگا۔

پاکستان کی عسکری قیادت نے اس مطالبے پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن ہمارے حکمرانوں نے سی آئی اے کے ایجنٹوں کو پاکستان آمد کی اجازت دے دی اور فوراً ہی بڑے پیمانے پر سی آئی اے کے ایجنٹوں کو پاکستان کیلئے ویزے جاری کرنے شروع کر دیئے۔ مثلاً

18 جنوری 2010ء کو سی آئی اے کے 36 / ایجنٹوں کو فوری طور پر پاکستان آنے کیلئے ویزے جاری کر دیئے گئے اور اس کے بعد 10 / اپریل 2010ء کو سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیو کاپس نے ذاتی طور پر مزید دس ایجنٹوں کیلئے پاکستانی ویزے حاصل کئے، اس طرح پاکستان میں سی آئی اے کے ایجنٹوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے جو پاکستان میں شتر بے مہار کی طرح کاروائیوں میں مصروف ہیں۔ امریکا بلوچستان میں ایک محتاط انداز میں بلوچستان لبریشن آرمی کی حمایت اس بناء پر کر رہا ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر اس فورس کو ایران کے خلاف استعمال کر سکے اور اب ہم دیکھ رہے کہ دن بدن پاکستان کے ایران کے ساتھ تعلقات انتہائی تیزی کے ساتھ خراب ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا نے تاحال "بی ایل اے" اور "جند اللہ" کو دہشت گرد فورس کے زمرے میں شمار نہیں کیا، اور یہ امر یقینی ہے کہ امریکا بلوچ قبائل کو بنیادی طور پر اس مقصد کے لیے بھی استعمال کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان میں جو چینی ماہرین اور کارکن مختلف منصوبوں پر کام کر رہے ہیں، انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔

پاکستان کو زوال سے دوچار کرنے کے حوالے سے امریکا تو ایک عرصے سے اپنی وسیع المیعاد پالیسی پر کاربند ہے اور وہ دھیرے دھیرے اپنے منصوبوں کو آگے بڑھا رہا ہے مگر اب بھارت اور کابل بھی مل کر پاکستان پر فوری طور پر کاری وار کرنے کے درپے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان اور قبائلی عمائدین کے مابین اختلافات کو ہوا دینا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور امریکا کی بھی ان دونوں قوتوں کو آشیر باد حاصل ہے۔ اس تخریبی سوچ کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ اگر مقامی آبادی کو امریکا کے خلاف اس حد تک بدگمان کر دیا جائے کہ امریکی عوام کو بھی یہ یقین آنے لگے کہ پاکستان بھی امریکا کے خلاف اسی طرح کے خطرناک عزائم رکھتا ہے جیسے ایران۔ ایسا ہونے پر اس کے دلِ مضطر کو چین نصیب ہو جائے گا۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں قبائلیوں اور سیکورٹی اہل کاروں کے درمیان تصادم کرانے کی سازشیں، ان سب کے پیچھے صہیونی و امریکی اور بھارتی منصوبہ سازوں کے ہاتھ تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ اب انہیں جنرل پرویز کیانی پر بھی پورا اعتماد نہیں رہا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مشہور امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اعلیٰ امریکی عہدیداروں کے حوالے سے اپنی ایک رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ،، امریکا جنرل کیانی کو شمالی وزیرستان پر حملے کیلئے قائل کرنے میں ناکام ہو گیا ہے،،۔ امریکی اخبار نے جنرل کیانی پر الزام عائد کیا کہ،، پاکستان کی جانب سے پیدا کی گئی تکلیف دہ مشکلات کی پشت پر جنرل کیانی ہی ہیں اور وہ اس حوالے سے پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ کی سوچ کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک طرف اوباما انتظامیہ جنگجوؤں کو دشمن سمجھتے ہوئے ان کی کسی بھی صورت میں خاتمہ کی متمنی ہے وہیں دوسری طرف پاکستان انہیں خاص کر بھارت کے تناظر میں اپنا اثاثہ سمجھتا چلا آرہا ہے.....،،! واشنگٹن پوسٹ نے امریکی اعلیٰ عہدیداروں کے حوالے سے یہ انکشاف بھی کیا کہ "ستمبر میں جب پاکستانی حدود میں نیٹو ہیلی کاپٹرز کی کاروائی میں 2 ایف سی اہلکار شہید ہوئے تھے تو ردعمل میں نیٹو رسد بند کرنے کا حکم جنرل کیانی نے از خود جاری کیا تھا"۔

امریکی اخبار نے نومبر میں وکی لیکس پر خفیہ امریکی سفارتی مراسلوں کی بازگشت کے دوران پاکستانی صحافیوں کے ایک گروپ سے گفتگو میں جنرل کیانی کا یہ جملہ بھی لکھا" پاکستان امریکا کا سب سے زیادہ دھمکایا گیا اتحادی ہے اور امریکا کی اصل حکمت عملی پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کا خاتمہ ہے"۔ امریکی اخبار کے مطابق گزشتہ ایک ملاقات میں جنرل کیانی نے امریکی جنرل ڈیوڈ پیٹریاس سے بار بار جہاں یہ پوچھا کہ افغانستان میں امریکا کے اسٹرٹیجک مقاصد کیا ہیں وہیں انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ "میں تم پر اعتماد نہیں کرتا"۔ ایک امریکی عہدیدار نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا کہ " پاکستان میں آئے اب تک کے تمام فوجی سربراہوں میں جنرل کیانی سب سے زیادہ بھارت مخالف ہیں"۔

پاکستان کو درپیش مسائل کا میں نے اوپر کی سطور میں ایک اجمالی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وطنِ عزیز آج داخلی اور خارجی دونوں محاذ پر سنگین آزمائشوں سے دوچار ہے۔ داخلی سطح پر سیاست کے شعبے میں داخلی خلفشار نے قوم کی صلاحیتوں کو سلب کرنے کی کوشش کی ہے اور بیرونی محاذ پر بھارت، اسرائیل، افغانستان اور امریکا کے گٹھ جوڑ نے پاکستان کی قومی سلامتی کو گزند پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ صدر زرداری کی قیادت میں "روشن خیال قوتوں" کا اتحاد اسی جانب امریکا کی اہم پیش رفت نظر آتی ہے۔ لہٰذا محب وطن سیاسی رہنمائوں اور علماو مفکرین، سب کو امریکا کی چالوں پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

بروز بدھ یکم صفر الحرام 1432ھ 5 جنوری 2011ء

امید کا چراغ

بڑی تیزی کے ساتھ کشمیری بارہ سنگھے کو ایک بار پھر تخریب کی جھاڑیوں میں پھانسا جارہا ہے تاکہ پھر خوں آشام لگڑ بھگڑ اس پر چھوڑ دیئے جائیں۔ اسی لئے ایک مکمل منصوبے کے تحت کشمیری قوم میں مایوسی اور ناامیدی پھیلائی جارہی ہے۔ قوموں میں مایوسی اور ناامیدی تو ایٹمی تابکاری سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دنیا نے یہ تو دیکھ لیا کہ قومیں ایٹمی حملوں کی تباہی کی بعد بھی امید اور یقین کی طاقتوں سے دوبارہ دنیا کی قیادت کی اہل ٹھہری ہیں۔ دنیا میں اس قدر امریکی ایٹمی حملے سے لوگ ہلاک نہیں ہوئے جتنے مایوسی اور ناامیدی سے، اتنے آدمی بیماریوں سے ہلاک نہیں ہوئے جتنے امید کے کھو جانے سے۔ خود فریبی تو ظاہر ہے کہ جان بوجھ کر راستہ بھولنے اور صحرا کی وسعتوں میں برباد ہونے والی بات ہے مگر امید کا چراغ گل کر دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ بچ نکلنے کا کوئی عزم ہی باقی نہ رہے۔ مریض وہی بچتے ہیں جو زندہ رہنے کی آرزو رکھتے ہوں، درد اور خون زندگی کی نشانیاں ہیں، آدمی لہو کو دیکھتا ہے تو خوفزدہ ہو کر بچنے کی تدبیر کرتا ہے اور درد جاگتا ہے تو دوا کی فکر ہوتی ہے۔ مایوسی خودکشی کا راستہ ہے ابلیس، شیطان کو کہتے ہیں مگر عربی لغت میں مایوس بدن کو بھی ابلیس کہا جاتا ہے۔

مسائل کی جڑ انسان کی جبلت میں ہوتی ہے۔ غلبے کی خواہش، اگر دلی سرکار نے کشمیر میں فوج نہ اتاری ہوتی تو اس خطہ ارض میں انسانی خون اتنا ارزاں نہ ہوتا۔ تقدیر تو اٹل ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ تقدیر کے حال میں سے اپنا راستہ خود ڈھونڈتا اور نکالتا ہے۔ طاعون پھیل گیا تو حضرت عمر نے اسلامی افواج کو حرکت کا حکم دیا تو ایک صحابی رسول ﷺ نے کہا: " عمر! کیا تم تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟،، تو حضرت عمر نے فوری جواب دیا کہ "تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں"۔

ادھ کھلے گلاب جن میں سے بیشتر نے اپنی زندگی کی 20 بہاریں بھی نہیں دیکھی تھیں، سفاک ہاتھوں نے انہیں بڑی سنگ دلی کے ساتھ مسل کر رکھ دیا ہے۔ ہزاروں خاندانوں کو غم والم کی اس تاریک رات کے حوالے کر دیا گیا ہے جس کی صبح کسی معجزے سے کم نہ ہوگی۔ ہزاروں کی تعداد میں کمسن بچے جو زخمی حالت میں یا تو ہسپتالوں میں یا پھر گھر کے بستروں پر اس امید سے پڑے ہوئے ہیں کہ شائد زندگی کے سفر میں پھر چلنے پھرنے کے قابل ہو سکیں۔ وادی کشمیر میں اگرچہ پچھلے تریسٹھ سالوں سے اس اندوہناک صورتحال کو غلبہ حاصل ہے، تاہم دیکھا گیا ہے کہ جن گھرانوں یا خاندانوں کے چشم وچراغ گل کر دیئے جاتے ہیں ان کیلئے زندگی کس قدر سوہانِ روح اور عذاب بن جاتی ہے۔ ہم سب کو اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کیونکہ کشمیر کا شائد ہی کوئی علاقہ، کوئی قصبہ کوئی قریہ کوئی چوراہا یا کوئی نکڑ ہوگی جہاں ان معصوم بے گناہوں کا خون اپنی بے بسی کی گواہی نہ دے رہا ہو۔ صرف اس جرم بے گناہی میں کہ کشمیری اپنے اس حق کی کیوں بات کر رہے ہیں جس کا اس ملک کے بڑوں نے ساری دنیا کے سامنے بارہا وعدہ کیا تھا بلکہ اقوام متحدہ میں تو اس وعدے کی تکمیل کیلئے دنیا کی کئی بڑی طاقتوں نے بطور تحریری ضمانت بھی دے رکھی ہے؟

کشمیری تو فقط ان وعدوں کا ایفاء چاہتے ہیں جو بھارت کے قد آور سیاسی رہنماؤں نے کئے تھے لیکن ان وعدوں کی تکمیل کی بجائے کشمیر کے ہر گھر کو کربناک حالات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ ہر محلے میں کوئی نہ کوئی گھر ماتم کدے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور ان بے بس ماؤں بہنوں کی آہوں

، سسکیوں اور دلدوز چیخوں سے ایک نئی کربلا سجادی جاتی ہے۔ جہاں آسیہ اور نیلوفر کی چیخ وپکار آج بھی ہماری روح کو بے قرار کر دیتی ہے وہاں بٹہ مالو کا 9 سالہ معصوم بچہ بے اختیار یاد آجاتا ہے جس کو غسل دیتے وقت اس کے والد پر غشی طاری ہوگئی تھی کہ اس کے منہ میں ادھ چبی ٹافی ابھی تک موجود تھی۔ مجھے تو عید کے روز بچوں کو عیدی دیتے وقت طفیل متو کے ہاتھ میں وہ پانچ روپے کا سکہ بھی بے اختیار رلا دیتا ہے جو شہادت کے وقت اس کے ہاتھ کی مٹھی میں موجود تھا۔ مجھے وہ نونہال بھی یاد آرہے ہیں جن کے ہاتھوں میں شہادت کے وقت سبز ہلالی پرچم تھے اور انہوں نے اپنی ماؤں کو اسی سبز پرچم کو اپنا کفن اور سید علی گیلانی سے نماز جنازہ پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میرے ضمیر پر وہ ہزاروں مائیں بھی مسلسل کچوکے لگا رہی ہیں جو آج بھی اپنے گھروں کے دریچوں سے باہر ٹکٹکی لگائے جھانک رہی ہیں کہ شائد ان کا گمشدہ لختِ جگر اچانک اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے حیرت میں مبتلا کر دے۔

ہزاروں کی تعداد میں معصوم نوجوان زندان کی زینت بنا دیئے گئے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں لاپتہ ہیں جن کے بارے میں کوئی خبر نہیں کہ زمین کی آغوش میں جاسوئے ہیں یا انہیں پھر آسمان نگل گیا۔ کشمیر میں گمشدہ افراد کا قضیہ دو دہائیوں سے کہیں زیادہ محیط ہے جب کشمیری نوجوانوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اپنے حقوق کیلئے ہتھیار اٹھا لئے تو دلی سرکار نے اپنے سورماؤں کو گرفتاری اور تفتیش کے لامحدود خصوصی اختیارات دیئے اور انہی انسانیت سوز اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے بھارتی فوج اور خفیہ اداروں نے دن دیہاڑے کشمیری نوجوانوں کو ان کے پیاروں کے سامنے گرفتار کر کے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے شروع کر دیئے۔ ایسے ہی ایک مظلوم عبدالقدیر ڈار نے ریاستی دہشت گردی اور تشدد کے ایسے روح فرسا واقعات بیان کئے ہیں جن کو سن کر ہر انسان کی روح تک کانپ اٹھتی ہے۔ انہوں نے اپنی اس داستان میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ہر پانچواں کشمیری اس تعذیب کے دور سے گزرا ہے اس خصوصی رپورٹ کو مشہور زمانہ بی بی سی کی ویب سائٹ پر آج بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں:

http://www.bbc.co.uk/urdu/world/2010/12/101221_kash_torture_fz.shtml

ان میں کچھ خوش قسمت ایسے تھے جن کا ریکارڈ عدالتوں میں پیش کیا گیا لیکن نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جن کے چالان نہ تو عدالتوں میں پیش کئے گئے اور نہ ہی بھارتی فوجیوں اور ایجنسیوں نے ان کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے۔ اب تو اوسان خطا کرنے والی یہ خبر بھی آگئی ہے کہ شہید طفیل متو کے والد اور اہل خانہ کو مقدمہ واپس لینے کیلئے حراساں کیا جارہا ہے جس کی بناء اس مظلوم خاندان نے انصاف کیلئے بین الاقوامی اداروں کے سامنے دہائی دینا شروع کر دی ہے۔

کشمیر میں سرگرم انسانی حقوق کی انسانی حقوق کی مقامی تنظیموں کے مطابق گزشتہ دو عشروں میں گمشدگان کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید نے حکومت سنبھالنے کے چند ماہ بعد ہی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ چند برسوں میں ہزاروں افراد لاپتہ ہوگئے ہیں۔ مفتی سعید نے اعداد وشمار بتاتے ہوئے کہا تھا کہ سال 2000ء میں 1553 سال 2001ء میں 1586/ اور 2002ء میں

606افراد لاپتہ ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی مقامی رضاکار تنظیموں کا مؤقف یہ تھا کہ گمشد گان کی تعداد وزیر اعلیٰ کے بیان کردہ اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد جب بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کشمیر آئے تو ایک پریس کانفرنس میں مفتی سعید نے گمشد گان کی تعداد محض ساٹھ بتائی حالانکہ اس وقت تک عدالتوں میں پ500 افراد کے مقدمات سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ انہیں گرفتاری کے بعد غائب کر دیا گیا ہے ۔ 18جولائی2002ء میں نیشنل کانفرنس کی حکومت کے وزیر برائے امور داخلہ خالد نجیب سہروردی نے اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں اعتراف کیا تھا کہ کشمیر میں عسکریت کے آغاز سے لاپتہ افراد کی تعداد3814 ہے۔ اب ایک مرتبہ پھر نیشنل کانفرنس کی حکومت برسر اقتدار ہے لیکن گمشد گان کا مسئلہ ہنوز برقرار ہے بلکہ گمشد گان کی تعداد تو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔

2000ء میں نیشنل کانفرنس کی حکومت میں ڈویژنل کمشنر کشمیر نے مقامی اخبارات میں ایک سرکلر شائع کرواتے ہوئے گمشد گان کے رشتہ داروں کو متعلقہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں لاپتہ عزیزوں کی تفصیلات جمع کرانے کو کہا تھا تاکہ حکومت سراغ لگا سکے۔ یہ اشتہار شائع ہوتے ہی ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر کے باہر ہزاروں گمشد گان کے عزیز و اقارب جمع ہو گئے تھے جو اپنے عزیزوں کی بازیابی کیلئے رو رو کر فریاد کناں تھے۔ حکومت کو ہزاروں کی تعداد میں درخواستیں بھی موصول ہوئیں لیکن آج تک ان درخواستوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ چونکہ گمشد گان کی تعداد ہزاروں میں ہے اور یوں ان سے وابستہ خاندانوں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے اس لیے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر تمام سیاسی جماعتیں بھی اس معاملے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ سید علی گیلانی تو ہر پلیٹ فارم پر اس ظلم کے خلاف دہائی دیتے نظر آ رہے ہیں لیکن چونکہ اغواء اور گمشد گی کے ان تمام واقعات کا نقشِ قدم بھارتی فوج اور خفیہ ایجنسی کے کسی نہ کسی مرکز اور کسی فوجی شخصیت کی طرف جاتا ہے اس لئے کوئی بھی غیر فوجی شخصیت یا ادارہ اس "نو گو ایریا" میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مذاکرات کار بھی نجانے کسی انجانے خوف کی بناء پر اس حساس مسئلے پر گنگ ہیں۔ گمشدہ افراد کے لواحقین میں بہت سے صبر ایوب کر کے بیٹھ گئے ہیں ، کچھ گریۂ یعقوب کر کے اپنی بینائی گنوا بیٹھے ہیں اور کئی مائیں انتظار کی صلیب پر جھولتے جھولتے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھیں ہیں۔

اسلام آباد کی آمنہ مسعود جنجوعہ کی طرح سینکڑوں خواتین اپنے بیٹوں بھائیوں اور زندگی کے ساتھیوں کی تصاویر اٹھائے سرینگر کے کسی چوک اور شاہراہ کے کنارے آج بھی فریاد کناں دکھائی دیتی ہیں لیکن نوزائیدہ جمہوری پاکستان کی طرح دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والی دلی

سرکاریں کوئی جسٹس افتخار نہیں جو اس "نوگوایریا" میں قدم رکھنے کی جرأت کر سکے حالانکہ کشمیر کے ہزاروں خاندان آج بھی اپنے عزیزوں کی بازیابی کیلئے کسی جسٹس افتخار چوہدری کے منتظر ہیں۔

عالی مرتبت جناب حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے کہ "زندگی پر سوار ہو جاؤ ورنہ زندگی تم پر سوار ہو جائے گی"۔ انسان مجبور نہیں، مجبور وہ تب ہوتا ہے جب تقدیر کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے اور خود کو زندگی کے حوالے کر دیتا ہے۔ میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ اب ان مظلوم کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ بہت دور نہیں لیکن وہ صاحب اختیار افراد اور میڈیا کے جغادریوں کو تاریخ کس نام سے یاد کرے گی جو آج مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔،، امن کی آشا،، کا ڈھول پیٹنے کی آڑ میں ان مظالم کو چھپانے والوں کا بھی تو کوئی حساب کتاب ہو گا؟

اب ہم نے صدق دل کے ساتھ اپنے اس رب کی طرف رجوع کرنا ہے جو اس ساری دنیا کا مالک ہے اور اسی کے بتائے ہوئے طریقے سے اس دنیا کے ساتھ معاملہ بھی کرنا ہے۔ یہاں جن انسانوں نے اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنالیا ہے ان کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں واپس لانا ہے پھر کوئی دنیا کی بڑی جمہوریت کی دھونس دینے والی سرکار ، قصر سفید میں بیٹھا فرعون اور ڈاؤننگ سٹریٹ کا نمرود ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔ میں نے اپنی فکر اور سمجھ کے مطابق بڑی دلسوزی کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ پر منادی کرتے ہوئے تمام کرداروں کے منہ سے نقاب نوچ کر سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ سجنو بس نام رہے گا میرے اللہ کا!

اس لئے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے
کہ اپنے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے

بروز جمعتہ المبارک 3 صفر الحرام 1432ھ 7 جنوری 2011ء

تلاشِ حق

محترم رفیق عزیز!

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ پر اللہ کی سلامتی وبرکت ہو آپ کے قدم استقامت علی الحق کے ستون ہوں، آپ کا سینہ بدر کی چٹان، بازو غازیان صف شکن کی سنان اور حوصلہ خالد سیف اللہ کا پیکان ہو ۔ کتنی ہی ان گنت دعائیں اور پر خلوص محبتیں آپ کیلئے رکھتا ہوں، آپ کے قدموں کی دھمک میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز اور راہِ حق کے نشیب و فراز کو ہموار کرتی چلی جایا کرتی ہے۔

آج ایک مدت کے بعد آپ سے قلمی طور پر مخاطب ہوں حالانکہ آپ کے کئی ایک مکاتیب طویل و مختصر میری فائل میں اس طرح آرام فرما رہے ہیں جیسے مومن اپنی قبر میں، لیکن اس آخری طویل خط میں آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کی تحریر کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مدت سے آپ مشرق کی پنہائیوں میں کھو گئے ہیں اور میں مغرب کی ظالم مردم خور تہذیب کا شکار ہوں لیکن بقول آپ کے ،، اسلام اگر گلشن ہے تو اس کیلئے بادِ سموم مغربی تہذیب ہے،،۔ جہاں اس تہذیب نے انسان کو انسان سے کاٹ کر رکھ دیا ہے، مادہ پرستی کا شکار کر دیا ہے ، آنکھوں سے شرم وحیا کا پانی اتار دیا ہے اور انسانی سطح سے حیوانی سطح پر لا کر چھوڑ دیا ہے لیکن وہاں ہمدردی، اخلاق، مہر و محبت، بے لوث خدمت، ایثار و قربانی، کمزور پر رحم اور محروم پر شفقت کا تصور عملاً یہاں دیکھنے کو ملا ہے۔

سوڈان، صومالیہ میں قحط سے مسلمان پریشان ہوں یا بنگلہ دیش، پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے انسانیت سسک رہی ہو، یہاں کا بوڑھا پنشن یافتہ طبقہ بھی ان کی عملی مدد کیلئے اپنے دل میں تڑپ رکھتا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ یہ عادت حسن فطرت سے کس قدر قریب ہے!

حسن بے پرواہی کو اپنی بے حجابی کیلئے ہوں
اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

آخری مرتبہ واشنگٹن میں دوران کانفرنس ملاقات کا موقع ملا، کتنی ہی باتیں ہوئیں، مجالس تعارف میں بندھے بندھائے تعارفی پروگرام کے تحت ہم کتنی بار متعارف ہوئے لیکن پھر بھی کھل کر باتیں کرنے کی حسرت دل میں رہی۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ ہم کچھ اپنی باتیں کرتے لیکن انفرادی گفتگو کی بجائے سیمناروں، کانفرنسز، اجتماعات میں ہم طویل تقریریں تو کرتے رہے، مشرق و مغرب میں پاکستان اور عالم اسلام میں اسلامی انقلاب کی ڈھیر ساری باتیں کرتے رہے، اس کے طریقہ کار پر لوگوں کی فکر کی اصلاح کی منصوبہ بندیوں میں حصہ لیتے رہے لیکن آپس کی باتوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ آپ تو خطوط کے ذریعے پھر بھی اپنا پیٹ خالی کرتے رہے لیکن مجھے تو اس کی بھی فرصت نہ ملی۔ آج آپ کا ٹیلیفون پر محبت بھرا پیغام اور خصوصی خط بذریعہ ڈاک موصول ہوا تو سوچا یہ شب آپ کے نام کر دوں، جو ڈھیروں سوال جواب طلب ہیں ان کو ضابطہ تحریر میں لے آؤں تو بہتر ہے۔

گاڑی کے پہیوں کی مانند ہم بھی مسلسل حرکت میں رہے، ایک پہیہ دوسرے سے کیا بات کرے، بس یہی کہ کتنے اسٹیشن گزار آئے، کتنے میل دوڑ آئے، کتنی منزل باقی ہے، حال دل اور دردِ دل سنانے کی مہلت نہ ملی تھی، نہ ملی اور نہ ملتی نظر آتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کو حال دل سنانے کیلئے ٹیپو سلطان کو سب سے عمدہ مہلت سرنگاپٹم کے دروازے پر جان دیکر ملی تھی اور شائد ہمیں بھی یہ مہلت زیرِ زمین پہنچ کر ہی ملے گی جہاں چار آدمیوں کی شاہانہ سواری پر دراز ہو کر پہنچیں گے۔ اس سے پہلے تو سارا علاقہ تگ و دو میدان جنگ، ساری مدت حیات زمانہ جنگ، سارا سامان زیست اسلحہ جنگ، ساری خبریں حالاتِ جنگ اور ساری زندگی جنگی مورچہ ہے۔ دشمن دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف سے حملہ آور ہے، ساری زندگی سمٹ کر چومکھی لڑائی کا ہتھیار بن گئی ہے۔ جس روز یہ ہتھیار کند ہو گا، گردن سینے پر ڈھلک آئے گی تب کہیں مہلت یک دو نفس ملے گی کہ کیسی گزری، کیونکر گزری کا حالِ دل ملائکہ کو سنائیں گے۔

کتنے ہی احباب کی یادیں ماضی کے وسیع دھندلکے میں مصری عجائب خانے کی ممیوں کی طرح پڑی ہیں۔ بے حس و حرکت، منجمد اور بے روح، کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام قدیم یادوں پر پھپھوندی سی لگ گئی ہے۔ ماضی کے وسیع میدان میں جہاں نشیب و فراز کی بھی کمی نہیں، کتنے ہی احباب ہیں جنہوں نے حافظہ کے بے کنارہ میدان میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں، ان کو آواز دیں، ان کو سنائی نہیں دیتی، انہیں بلائیں تو کوئی جواب نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ کی دھندلی شاہراہ پر گزرے ہوئے راہگیروں کے نقوش قدم ہیں جو ایام کی گرد کے نیچے مدھم پڑتے جا رہے ہیں، آپ اور میں بھی ان مدھم نشانات میں ایک نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ آپ نے جو یاد کیا تو محسوس ہوا کہ ممیاں بھی گفتگو کرتی ہیں اور ماضی میں سے بھی چھن چھنا کر آوازیں حال میں داخل ہو جایا کرتی ہیں۔ یقین کریں جب سے منہ پر موجود داڑھی میں سفیدی کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی مسافر جو بغیر کسی زادِ راہ لئے کسی طویل سفر کیلئے چل نکلا ہو، اور اپنے ہی بچھائے ہوئے کانٹوں کو پلکوں سے صاف کر کے یا تو اس لق و دق صحرا میں جان دیدے گا یا ایسی کھائی میں گر جائے گا جہاں اندھیرے استقبال کریں گے اور روشنی کا دل مسوس ہو کر رہ جائے گا۔۔۔۔۔

اک دیا اور بجھا روشنی روتی رہی!

بھلا ہو ان چند دوستوں کا کہ مجھ جیسے کھوٹے سکوں کی کالک اور سیاہی کو اتارے کا بندوبست پچھلے دنوں لندن کے ایک دور دراز گاؤں میں کر رکھا تھا۔ دنیا سے کٹ کر مافیہا کے قریب انسانی کردار کی اصلاح جس انداز سے یہ حضرات کرتے ہیں اس سے دل میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے کہ یوم حشر کی گھڑی جب "ان الحکم الا اللہ" اور "لمن الملک الیوم،، کا نعرہ بلند ہو گا تو میں بھی گھگھیائی آواز میں "اللہ الواحد القھار" کا جواب انہی لوگوں میں کھڑا ہو کر دوں، یہی وجہ ہے کہ مجھے ان دوستوں کے ایسے تربیتی اجتماعات میں شرکت سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ قیمتی دلنواز اور محبوب محسوس ہوتی ہے۔

ان دوستوں نے توحید کی یہ شمع ایک مدت سے جلا رکھی ہے اور یہ شمع اپنے رخِ تاباں سے اندھیرے کے اندر نور کے چھینٹے مسلسل برسا رہی ہے۔ اس شمع پر اس کے جانثار پروانے کدھر کدھر سے آئے، کن کن تاریکیوں کو پھلانگ کر آئے، کیسے دیوانہ وار آئے، کیا کیا تاثرات، عشق و محبت اپنے سینوں میں تڑپتے ہوئے لیکر گئے، یہ داستان ہجر و وصال بڑی دراز، بڑی پر لطف اور بڑی پر کشش ہے۔ وقت کم ہے، گردشِ روزگار میں بڑی تیزی ہے، کسے

فرصت ہے کہ کہی ہوئی کہانیاں دہرا سکے ، بکھرے موتی چن سکے، چٹکے ہوئے پھول وکلیاں چن چن کر دامن بھر سکے، ایک لحظہ اور کارواں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ اس رواداری میں حکایات خونچکاں سنانے کی کسے مہلت ہے۔ بہر حال آپ کا تقاضہ ہے کہ اس شمع توحید کی کچھ خوبیوں کا تذکرہ کروں جنہوں نے ہزاروں لوگوں کے دلوں کو موہ لیا ہے، اس راہِ محبت کے ان مقامات کا تذکرہ کروں جنہوں نے کتنے ہی اربابِ دل ونگاہ کو مسخر کر کے اپنا گرویدہ اور اپنی منزل کا مستقل راہی بنالیا ہے لیکن محترم! یہ بات کسی ایک شخص کے بتانے کی نہیں ہے۔

جب کسی محبوب کے ہزاروں شیدائی ہوں تو ظاہر ہے کہ اس محبوب کے عشوہ و ادا کے بھی ہزر زروں انداز ہوں گے اور وہ بو قلموں خوبیاں اسی صورت میں سامنے آئیں گی جب عشاق کرام کا ہجوم ہو... ...! اور وہ اپنی اپنی جراحت دل کی داستان اپنی عاشقانہ زبان میں بیان کرے۔ بس یہ اجتماع بھی ایسے عشاق کا تھا۔ بہر حال وہاں جو جواہر ریزے اپنے تنگ دامن میں جمع کر سکا، اس محبوب ازل کے کشتگان کی داستان وابستگی کے جن جن حصوں نے مجھے زیادہ متاثر کیا، آپ کی ضیافت طبع کیلئے تحریر کئے دیتا ہوں!

آپ جانتے ہیں کہ مقصد زندگی کی جس سنگلاخ وادی میں سے یہ قافلہ جان گزر رہا ہے وہ کٹھن بھی ہے اور دشوار بھی، حوصلہ شکن بھی ہے اور صبر آزما بھی، لیکن ایک نصب العین کے حامل جب کچھ ساتھ جمع ہو جائیں تو سارے بوجھ اتر جاتے ہیں، شکائتیں دور ہو جاتی ہیں، دل شگفتہ ہو جاتے ہیں اور اشتراک غم، مرگ انبوہ کا جشن پیدا کر دیتا ہے۔ پھر کوئی حالات کے ہاتھوں دل گرفتہ نہیں ہوتا اور منزل کی کٹھن گھاٹیوں کا کوئی شکوہ سنج نہیں رہتا۔ اس وقت محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کوئی رہینِ ستم ہائے روزگار لوگ نہیں ہیں بلکہ منہ زور زمانے کے شہہ سوار ہیں اور حالات کی لگام تھامے جس طرف چاہیں زندگی کا رخ موڑ کر لیجا سکتے ہیں۔ ایسے وقت میں ذکر وشکر ان کے لبوں پر ہوتا ہے تو عزیمت آگے بڑھ کر ان کے قدم چومتی ہے۔

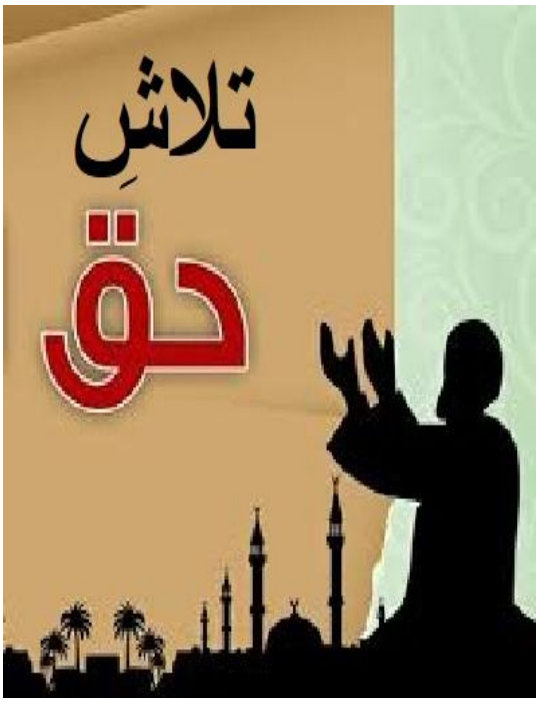

اس محفل میں،، اپنی تربیت آپ،، کے اصول پر سب دوست جمع تھے۔ جب یہ ذکر چل نکلا کہ نصب العین کی محبوبہ عالم کی کس ادا سے کون مجروح ہوا، ظاہر ہے کہ عشاق کی محفل میں جب ذکر محبوب کی اداؤں کا چھڑ جائے تو بات قیامت کا رنگ دھار لیتی ہے اور تب پتہ چلتا ہے کہ کشتی دل کیلئے محبوب کا ہر سانس ایک طوفان اور مرغ آرزو کیلئے اس کا ہر رونگٹا ایک بے پناہ تیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ رشید بھائی جو اس محفل کے دولہا تھے، اس محفل عشاق کا آغاز جب غم ناک چشم سے خوفِ خدا، آخرت کی جوابدہی اور اس زمانے میں دین کی مظلومی سے کیا تو گویا وقت تھم گیا ہو، سانس کا تسلسل جو پچھلی چھ دہائیوں سے کبھی مشکل نظر نہیں آتا تھا، اب اگلے سانس لینے کی گویا ہمت نہ ہو۔ مجھ جیسے گناہ گار کو سورۃ بقرہ کی آیت چالیس سے لیکر چھیالیس تک درس قرآن کا جب حکم ملا تو محسوس ہوا کہ قرآن کی ان آیات میں یہود کو نہیں بلکہ مجھے

مخاطب کیا جارہا ہو۔ قرآن جو ایک زندہ معجزہ، اپنی جبروت وسطوت کے رنگ دکھارہا تھا وہاں میرا اپنا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا، قلب وضمیر ساتھ نہیں دے رہے تھے، زبان یوں لڑکھڑا رہی تھی جیسے اس نے بولنا کبھی سیکھا ہی نہیں ... ..سب دعائیں یاد نہ رہیں بس یہی سرور، کائنات ﷺ کی دعا کہ:"اے رب ذوالجلال! میرا سینہ اس کیلئے کھول دے اور سمجھنے وعمل کی توفیق نصیب فرما آمین"۔

بعد میں دوستوں کا اس پر تبصرہ، سینہ مزید کھلتا گیا، دماغ سے پردے ایک ایک کر کے ہٹ رہے تھے، خدا کی وحدانیت کا یقین، رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارک، اصحابہ کرام کا ایثار ، قربانی واستقامت دل پر نقش ہو رہے تھے اور کالک وسیاہی اس طرح دور ہو رہی تھی جس طرح کالے بادلوں سے اٹا ہوا آسمان نور کی پہلی کرن سے خوفزدہ ہو کر اس کیلئے جگہ چھوڑ رہا ہو، اور واقعی قرآن کی یہ آیت کہ:"جب حق آتا ہے باطل بھاگتا ہے، روشنی آتی ہے، اندھیرا چھٹ جاتا ہے" کی عملاً تفسیر اپنے دل کی کیفیت سے محسوس ہوئی۔

غیر مسلموں کے اس معاشرے میں اسلام کی دعوت، پلاننگ، نمائش، تعارف، غرضیکہ زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر اس مختصر وقت (ڈھائی دن) میں اس طرح عملی روشنی پڑی کہ سب ہی اندھیرے چھٹ گئے، گرد دور ہوئی تو ذہنی بوجھ اور جسم کو اس طرح ہلکا محسوس کیا کہ داڑھی کی سپیدی بھی کچھ اچھی نظر آنے لگی اور دل میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ اس کیفیت میں محبوب سے ملاقات ہو گئی تو عاشقِ صادق کا پروانہ مل جائے گا وروصل بھی نصیب ہو جائے گا۔

آیئے! اپنی زندگی کے عشق کا آغاز اس انداز سے کریں کہ محبوب منتظر ومضطرب ہو، بے چین ہو اور بے ساختہ یہ کہے:

توحید تو یہ ہے خدا خود حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے

دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں!

بروز اتوار 5 صفر الحرام 1432ھ 9 جنوری 2011ء

فکر کرناداں

موجودہ عالمی حالات کیاہیں؟میرے نزدیک عالمی حالات کی تین سطحیں ہیں اور پہلی سطح جو سب سے نمایاں اور اکثر لوگوں کے علم میں ہے کہ امریکا اس وقت کرۂ ارضی کی واحد سپریم طاقت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی حربی قوت کا کوئی اندازہ نہیں، اس کا تکبر وزور اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اسے عدل وانصاف کے مسلمہ اصولوں کی نہ کوئی فکر ہے نہ لحاظ۔ اب اسے اپنے اتحادیوں کی رائے کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔ عراق کے خلاف جنگ کیلئے امریکا اور پورے یورپ کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک میں وسیع تر مظاہرے ہوئے مگر امریکی حکومت نے ان مظاہروں کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی۔ اقوام متحدہ ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوئی تو اس نے اس کو بھی دھکا دیتے ہوئے اپنے عمل سے یہ اظہار کیا کہ وہ تنہا سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔ امریکا اپنی حربی قوت کے اعتبار سے ایک مست ہاتھی کی مانند ہے جس کا مقابلہ کرنے کی حیثیت نہ یورپ میں ہے، نہ جاپان وچین اور نہ ہی روس اس کا سامنا کرنے کو تیار ہے، عالم اسلام کا تو ذکر ہی کیا!

دوسری سطح پر ایک عالمی نظام ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور یہ نظام بے خدا ہی نہیں، خلافِ خدا بھی ہے، یعنی سیکولرازم اور اس کی تین بنیادیں ہیں۔ اس کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے اجتماعی معاملات میں، ریاست اور حکومت کی سطح پر، قانون سازی کے مرحلے میں ، کسی خدا، کسی آسمانی ہدائت، کسی وحی اور کسی شریعت کا کوئی دخل نہیں۔ گویا پورے اجتماعی نظام سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔ سیکولرازم کی دوسری بنیاد کا تعلق معاشی نظام سے ہے، یعنی پوری دنیا کا معاشی نظام سود کی لعنت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام پر قائم ہو۔ سود کے ساتھ چھوٹی بہن جوا ہے، دنیا بھر میں سٹاک ایکسچینج اور دولت کی الٹ پھیر کی بنیاد یہی جوا ہے اور جوئے کے بعد تیسرا ستون انشورنس ہے ۔ تیسری دنیا کا تعلق بے حیائی، عریانی، فحاشی اور آزاد جنس پرستی سماجی نظام ہے، جس میں جنس پرستی مرد اور عورت کے درمیان ہو، چاہے دو مردوں کے علاوہ دو عورتوں کے درمیان ہو، اس کی کھلی اجازت ہے، جس کے نتیجے میں خاندانی نظام بری طرح تباہ وبرباد ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اب مادر پدر آزاد اس سماجی نظام میں طوائفانہ زندگی کو بھی ایک قابل احترام پیشہ تصور کیا جاتا ہے۔

فحاشی وعریانی کے اس سیلاب کو اقوام متحدہ کی اسمبلی نے سوشل انجینئرنگ (سماجی تعمیر) کا نام دیا ہے اور اس کا ہدف بھی شمالی افریقہ اور خاص طور پر ایشیا کے مسلمان ممالک ہیں، کیونکہ ان ممالک میں بحیثیت مجموعی خاندانی نظام ابھی برقرار ہے، شرم وحیا کی کچھ نہ کچھ وقعت اور قیمت ہے، عصمت وعفت کی کوئی قدر ہے۔ موجودہ عالمی حالات کی تیسری سطح پر ایک مذہبی کشاکش ہے، یہ کشاکش ذرا خفیہ ہے اور اس کشاکش میں سب سے مؤثر اور نمایاں کردار یہودیوں کا ہے جو اس وقت عالمی انسانیت کی عظیم ترین سازشی قوت ہے۔ یہودیوں کا پروگرام ہے کہ پوری دنیا پر ان کا براہِ راست فوجی نہیں تو اقتصادی قبضہ ضرور ہو جائے، مزید برآں ان کا پروگرام ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک بڑی ریاست گریٹر اسرائیل قائم کرے، مسجد اقصیٰ اور قبتہ الصخرۃ کو شہید کر کے اس کی جگہ تھرڈ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت لا کر رکھا جائے۔

یہودیوں کے اس پلان میں عیسائی قوتیں ان کی تابع و مہمل بن چکی ہیں اور موجودہ معاملات میں عیسائیوں اور یہودیوں کا مشترکہ دشمن اسلام اور مسلمان ہیں اور سب سے بڑا ٹارگٹ ایٹمی پاکستان ہے اور اب اس گٹھ جوڑ میں بھارت بھی شامل ہو چکا ہے۔ اب عالمی حالات کے بعد ذرا پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں کہ کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے اور اس کا مستقبل واقعی مخدوش ہے؟؟ اور کیا ابھی پاکستان اور پاکستانی قوم کی نجات کا راستہ کھلا ہے؟ ان دونوں سوالات کے جوابات اگر،،ہاں،، میں ہیں تو آیئے پہلے ہم اس کے اسباب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا اصل اور بنیادی وداخلی اور دوسرا فوری اور خارجی!

پہلا سبب یہ ہے کہ ہمارے مؤسسین پاکستان علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے کہا تھا کہ،، ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں تاکہ ایک لائٹ ہاؤس وجود میں آسکے،، مگر ہم نے اصل مقصد کو بھلا دیا۔ دوسرے خارجی و فوری سبب کے پیچھے اصل قوت یہود اور اسرائیل کی ہے جو پاکستان کا خاتمہ چاہتے ہیں اور کم از کم اس کا یہ ایٹمی اثاثہ ختم کر دیا جائے تاکہ پاکستان بھارت کا طفیلی ملک بن کر رہ جائے۔ ہمارے ایوان قتدار میں براجمان اور ان کے حواری یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی باری نہیں آئے گی لیکن عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے بعد پاکستان کے اہل بصیرت کو اس بات کا مکمل ادراک ہے کہ پاکستان کے گرد گھیرا بڑی تیزی کے ساتھ تنگ کیا جارہا ہے۔ مشرف رجیم سے اس سلسلے میں بڑے اہم کام لئے جاچکے، جب عوام میں اس کی مقبولیت نہ صرف ختم ہوئی بلکہ یہ فاسق کمانڈو نفرت کا سمبل بن گیا تو فوری طور پر اس کی جگہ این آر او کی بساط بچھا کر موجودہ حکمرانوں کو اقتدار میں لانے کے دورس مقاصد پر بڑی تیزی کے ساتھ کام جاری کر دیا گیا۔

ایٹمی اثاثوں کی جو صورت بن چکی ہے وہ بہت مخدوش ہے۔ مشرف کے ذریعے ہمارے خلاف بھرپور مقدمہ تیار کیا گیا اور ساری دنیا میں ایک مخصوص انداز میں اس پروپیگنڈہ کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی کہ دنیا بھر میں ایٹمی پھیلاؤ کا مرکز صرف اور صرف پاکستان ہے اور اسی لئے پاکستان کے سابقہ حکمران فاسق کمانڈو نے ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر کو مجبور کیا کہ وہ بے بنیاد الزامات کا اعتراف کرتے ہوئے ساری قوم اور دنیا سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر فاسق کمانڈو مشرف نے پاکستانی قوم کو خوفزدہ کرنے کیلئے یہ بیان بھی دیا کہ عالمی طاقتیں پاکستان پر حملہ آور ہو سکتی ہیں۔

ماضی میں پاکستان کے ارباب اختیار نے امریکا کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اب حالات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے، یعنی اب بھارت، اسرائیل اور امریکا کا سہ فریقی اتحاد زیادہ واضح انداز میں اپنے عزائم کو سامنے لا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال ہر اعتبار سے پاکستان کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ بھارت اس صورتِ حال سے پوری طرح فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ امریکا اور

پاکستان کے تعلقات میں دراڑیں پڑ جائیں اور اب یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور دونوں ملک اب محاذ آرائی کی دہلیز پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ کابل میں شمالی اتحاد کی واضح بالادستی نے بھارت کے ساتھ کابل کے گہرے روابط استوار کرنے میں کافی فعال کردار ادا کیا ہے، اس سے بھارت کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ افغانستان کی وساطت سے پاکستان کے قبائلی علاقوں کے اکابرین اور نیشنلسٹ پارٹیوں کے نمائندوں کے ساتھ اپنے روابط استوار کرے۔ بھارت نے اپنی باریک چالوں کے بل بوتے پر پاکستان کو قبائلی علاقوں کے مسائل میں الجھا دیا ہے اور ان علاقوں میں خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ بھارت کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا اور اس نے کمال ہوشیاری سے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

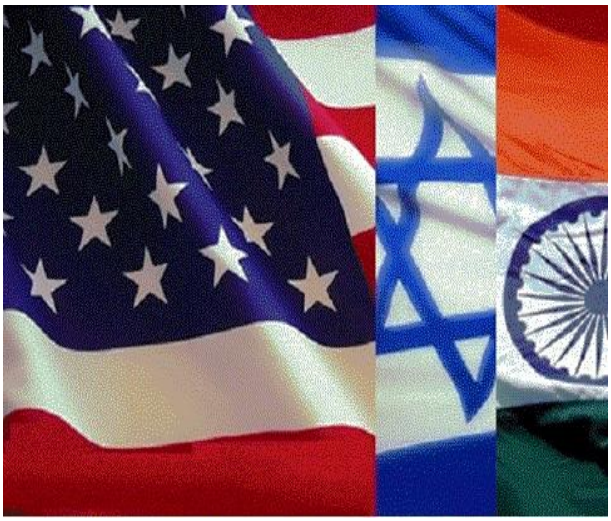

امریکا بلوچستان میں ایک محتاط انداز میں بلوچستان لبریشن آرمی کی حمایت اس بناء پر کر رہا ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر اس فورس کو ایران کے خلاف استعمال کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا نے تاحال "بی ایل اے "کو دہشت گرد فورس کے زمرے میں شمار نہیں کیا، اور یہ امر یقینی ہے کہ امریکا انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔

بلوچ قبائل کو بنیادی طور پر اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان میں جو چینی ماہرین اور کارکن مختلف منصوبوں پر کام کر رہے ہیں، پاکستان کو زوال سے دوچار کرنے کے حوالے سے امریکا تو ایک عرصے سے اپنی وسیع المیعاد پالیسی پر کاربند تھا اور وہ دھیرے دھیرے اپنے منصوبوں کو آگے بڑھا رہا تھا مگر بھارت اور کابل مل کر پاکستان پر فوری طور پر کاری وار کرنے کے درپے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان اور قبائلی عمائدین کے مابین اختلافات کو ہوا دینا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور امریکا کی بھی ان دونوں قوتوں کو آشیر باد حاصل ہے۔ اس تخریبی سوچ کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ اگر مقامی آبادی کو امریکا کے خلاف اس حد تک بدگمان کر دیا جائے کہ امریکی عوام کو بھی یہ یقین آنے لگے کہ پاکستان بھی امریکا کے خلاف اسی طرح کے خطرناک عزائم رکھتا ہے جیسے ایران۔ ایسا ہونے پر اس کے دلِ مضطرب کو چین نصیب ہو جائے گا۔

پاکستان کو درپیش مسائل کا میں نے اوپر کی سطور میں ایک اجمالی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وطنِ عزیز آج داخلی اور خارجی دونوں محاذ پر سنگین آزمائشوں سے دوچار ہے۔ داخلی سطح پر سیاست کے شعبے میں داخلی خلفشار نے قوم کی صلاحیتوں کو سلب کرنے کی کوشش کی ہے اور بیرونی محاذ پر بھارت، اسرائیل، افغانستان اور امریکا کے گٹھ جوڑ نے پاکستان کی قومی سلامتی کو گزند پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

یوں دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ادھر بقول اقبال "ہم بحیثیت قوم "صفیں کج، دل پریشان، سجدہ بے ذوق "کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہو۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم کو بے

پایاں صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اسے بحرانی کیفیات اور چیلنجوں کا سامنا ہو تو اس کی تخلیقی قوتیں از خود بیدار ہو جاتی ہیں، اور پھر جب اس کے رگوں میں "ابراہیم کا ایماں" گردش کرنے لگتا ہے تو آگ،، اندازِ گلستاں،، پیدا کرتی دکھائی دینے لگتی ہے۔ تاریخ اس قولِ فیصل کی صداقت پر کئی بار گواہی دے چکی ہے۔

ان مایوس کن حالات میں بچاؤ اور نجات کا راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم حکومتی اور عوامی سطح پر توبہ واستغفار کریں اور پلٹیں اپنے رب کی طرف جس نے رمضان کے مبارک مہینے کی بڑی ہی برکت والی 27ویں شب کو عطا فرمایا تھا کہ ہم اپنے رب کے ساتھ کئے گئے وعدے کی تکمیل کرنے میں مزید کوئی تساہل نہ برتیں کہ اس مملکت خداداد میں اسلام کے عادلانہ نظام کو نافذ کرنے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کریں۔ عوامی سطح پر توبہ یہ ہے کہ عوام انفرادی سطح پر حرام سے اجتناب اور حلال پر اکتفا اور فرائض دینی کی مکمل ادائیگی کو اپنا شعار بنائیں۔ بے حیائی، بے شرمی، فحاشی و عریانی سے خود اور اپنے اہل وعیال کو بچائیں اور مغربی تہذیب کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دیں۔

ظلم جب حد سے بڑھتا ہے ہمت آ ہی جاتی ہے
جھپٹتے باز سے چڑیا کو لڑتے ہم نے دیکھا ہے

بروز منگل 7 صفر الحرام 1432ھ 11 جنوری 2011ء

ہمارے خون کے چھینٹے سب کچھ اسے بتادیں گے

مکرمی و محترمی برادرم جناب شاہد رہبرؔ صاحبؔ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابھی رہبر کے تازہ شمارے میں مرحوم غلام محی الدین بانی رہبر اخبار کے بارے میں جناب عبد الصمد وانی مرحوم کی محبت بھری تحریر اور تاثرات پڑھنے کو ملے۔ تحریک آزادی کے ایک بے لوث اور مخلص سپاہی کے علاوہ ان کے قلمی جہاد کا بھی علم ہوا۔ قدرت نے ان کے اخبار کا نام،، رہبر،، شائد اس لئے تجویز کیا تھا کہ یہ ان کے رخصت ہونے کے بعد بھی اپنے پڑھنے والوں کی رہبری کرتا رہے اور یقینا آپ اب تک نامساعد حالات کے باوجود مرحوم کے اس مقدس مشن کو لیکر چل رہے ہیں اور آج اللہ کے فضل سے دنیا کے کئی ممالک میں اس اخبار کے نہ صرف قاری موجود ہیں بلکہ ہر ہفتے باقاعدگی کے ساتھ دنیا بھر کے قلم کاروں کے خوبصورت گلدستہ سے مزین تحریریں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یقینا اس مشکل کام میں قدم قدم پر رہبری کیلئے اپنے والد مرحوم کے پند و نصائح بھی یاد آتے ہونگے اور ان کی جدائی بھی اشکبار کرتی ہوگی لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہم سب لاپرواہ ہیں۔ دراصل موت سے زیادہ خوفناک شئے موت کا ڈر ہے، جیسے جیسے زندگی کا شعور بڑھتا ہے زندگی کی محبت بڑھتی ہے، پھر موت کا خوف بھی بڑھنے لگتا ہے۔ جس کو زندگی سے محبت نہ ہو اسے بھلا موت کا کیا خوف! جب انسان کے دل میں موت کا خوف پیدا ہو جائے تو اس کی حالت عجیب ہوتی ہے ایسے جیسے کوئی انسان رات کے اندھیرے سے بھاگ جانا چاہے یا دن کو سورج سے بھاگ جانا لیکن بھاگ نہیں سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو موت کا خطرہ اور خوف لاحق ہو گیا وہ بھاگنے لگا تیز بہت تیز اسے آواز آئی "پگلے موت تیرے پیچھے نہیں بلکہ تیرے آگے ہے" وہ آدمی فوراً الٹی سمت بھاگنے لگا پھر آواز آئی،، نادان موت تیرے پیچھے نہیں بلکہ تیرے آگے ہے" آدمی بولا "عجیب بات ہے پیچھے کو بھاگتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے، آگے کو دوڑتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے،، آواز آئی،، موت تیرے ساتھ ہے، تیرے اندر ہے، ٹھہر جا، تم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ جو علاقہ زندگی کا ہے وہ سارا علاقہ موت کا ہے،، اس آدمی نے کہا "اب کیا کروں؟" جواب ملا "صرف انتظار کرو موت اس وقت خود ہی آجائے گی جب زندگی ختم ہو جائے گی اور زندگی ضرور ختم ہوگی کیونکہ زندگی موت کی امانت ہے اور کسی کی جرأت نہیں کہ اس میں خیانت کر سکے۔ زندگی کا ایک نام موت ہے، زندگی اپنا عمل ترک کر دے تو اسے موت کہتے ہیں یا زندگی کا انجام!،، اس آدمی نے پھر سوال کیا،، مجھے زندگی کی بہت تمنّا ہے لیکن تو مجھے موت کی شکل دکھادے تاکہ میں اسے پہچان لوں" آواز آئی "آئینہ دیکھو موت کا چہرہ تیرا اپنا چہرہ ہے، اسی نے میّت بننا ہے، اسی نے مردہ کہلانا ہے، موت سے بچنا ممکن نہیں"۔

موت کے خوف کا کیا علاج! لاعلاج کا بھی بھلا کوئی علاج ہے۔ لاعلاج مہلک مرض صرف زندگی کا عارضہ ہے جس کا انجام صرف موت ہے۔ زندگی ایک طویل مرض ہے جس کا خاتمہ موت کہلاتا ہے۔ روز اوّل سے زندگی کا یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ زندگی کا آخری مرحلہ موت ہے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہ تو زندگی کا حصّہ ہے، بس اس کی تیّاری کی فکر ہونا ضروری ہے۔ ہم کشاں کشاں اس کی طرف سفر کرتے ہیں، ہم خود ہی اس کے

پاس چل کر آتے ہیں۔ زندگی کے امکانات تلاش کرتے کرتے ہم اس بند گلی تک آجاتے ہیں جہاں سے مڑنا ناممکن ہوتا ہے ۔ آگے راستہ بند ہوتا ہے، ہم گھبرا جاتے ہیں اور پھر شور مچاتے ہیں، خوب شور مچاتے مچاتے بالآخر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جاتے ہیں۔

موت نہ ہو تو شاید زندگی ایک المیہ بن جائے ایک طویل دورانیے کا بے ربط ڈرامہ کہ ٹی وی پر چلتا رہے اور لوگ بور ہو کر سو جانا پسند کریں۔ کہتے ہیں کہ ایک لافانی دیوی کو ایک خوبرو لیکن فانی انسان سے محبت ہو گئی۔ اس نے غلطی کو محسوس کیا کہ یہ فانی انسان ہے مر جائے گا وہ دیوتاؤں کی ایک عظیم سردار کے پاس روتی ہوئی گئی کہ اے عظیم دیوتا! میرے محبوب کو لافانی بنادو، دیوتا نے بڑی محبت سے سمجھایا کہ یہ ناممکن ہے، انسان کو موت کا حقدار بنایا جا چکا ہے۔ دیوی نے گریہ وزاری کے ساتھ اصرار کیا تو فیصلہ دیوی کی خواہش کے مطابق کر دیا گیا کہ اسے موت نہیں آئے گی۔ دیوی من کی مراد پانے پر خوش ہو گئی۔ وقت گذرتا گیا، بڑھاپا آیا، خوبصورت چہرے پر جھریوں نے ڈیرہ ڈال دیا، توانائی کمزوری میں تبدیل ہو گئی، وقت کے ساتھ بینائی بھی رخصت ہو گئی، یادداشت نے ساتھ چھوڑ دیا۔، مضمحل ہو گئے قویٰ سارے"

وہ انسان چلّایا،، اے دیوی خدا کیلئے مجھے نجات دلاؤ میں اس عذاب کو برداشت نہیں کر سکتا۔،، دیوی نے اپنی دوسری غلطی کو بھی محسوس کیا، پھر دیوتاؤں کے سردار کے پاس حاضر ہوئی کہ اے دیوتاؤں کے بادشاہ! میرے محبوب کو موت عطا کر، انسان کو انسان کا انجام دے دو۔ بس یہی راز ہے کہ انسان کو انسان کا انجام ہی راس آتا ہے۔ بات سمجھنے کی ہے، گھبرانے کی نہیں، مقام غور کا ہے خوف کا نہیں۔ زندگی صرف عمل ہی نہیں عرصہ بھی ہے۔ اگر صرف عمل ہوتا تو کوئی ہرج نہ تھا، اس عمل کیلئے ایک وقت بھی مقرر ہو چکا ہے۔

اس وقت کے اندر اندر ہی سب کچھ ہونا ہے کیونکہ اس وقت کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا ہونا صرف نہ ہونے تک ہے، اگر ہم زندگی کو دینے والے کا عمل مان لیں تو اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ دینے والا ہی زندگی لینے والا ہے۔ ڈر کی کیا بات ہے، دن بنانے والے نے ہی رات بنائی ہے اور رات بنانے والا ہی دن طلوع کرتا ہے۔ پہاڑ بنانے والا دریا بناتا ہے، صحرا بنانے والا نخلستان پیدا فرماتا ہے۔ زندگی تخلیق کرنے والا موت کو پیدا فرماتا ہے، یہ اس کے اپنے اعمال ہیں، ہم صرف اس کے عطا کیے ہوئے حال پر زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اس نے زندگی اور موت کو اس لیے پیدا کیا کہ دیکھا جائے کہ کون کیا عمل کرتا ہے۔ اس کائنات میں کوئی بھی ایسا نہیں آیا جو گیا نہ ہو ۔ کوئی پیدائش موت سے بچ نہیں سکتی ، جو کچھ بھی ہے نہ ہو گا، ہر شے لاشے ہو جائے گی مگر صرف میرے رب کی ذات ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔ باقی سب فنا ہے۔

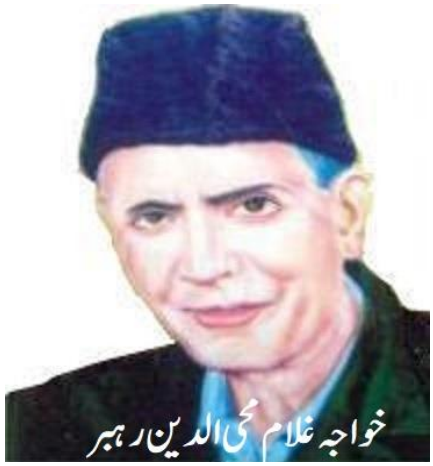

بے مصرّف زندگی کی سزا موت کا خوف ہی ہے، بامقصد حیات موت سے بے نیاز، موت کے خوف سے آزاد، اپنے مقصد کے حصول میں مصروف رہتی ہے۔ عظیم انسان بھی مرتے ہیں لیکن ان کی موت ان کی عظمت میں اضافہ بھی کرتی ہے اوروں کیلئے باعث صد رشک بھی۔ موت انسان سے اس کی بلند نگاہی، بلند خیالی اور بلند ہمّتی

نہیں چھین سکتی ۔وہ لوگ موت کے سائے میں زندگی کے ترانے گاتے ہیں، زندگی کا نغمہ الاپتے ہیں، زندگی کے اس مختصر عرصے میں جو اں ہمّت تو آسمانوں کو چھو آئے۔ عالی مرتبت عرش کی بلندیاں سر کر آئے اور کم حوصلہ اپنے اندیشوں کے خول سے باہر نہ نکلے۔ موت فانی زندگی کو دائمی حیات میں بدل دیتی ہے۔ فنا سے بقا کا سفر گھوڑے کی پشت پر ہوتا ہے۔ موت کیلئے تیار رہو، موت کا خوف نہ کرو، بس یہی موت کا پیام ہے اور مرحوم اس پیغام سے آشنا تھے، اسی لئے انہوں نے ایک عظیم مقصد کیلئے ساری زندگی تج دی اور ورثہ میں آپ کو بھی اسی عظیم کام کی تکمیل کا حکم دے گئے۔

موت کا غم اس لیے ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے عزیزوں اور پیاروں سے جدا ہو جائیں گے۔ عزیزوں کو تو ہم اپنی زندگی میں ہی جدا کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کی رخصتی کیلئے کتنی دعائیں کرتے ہیں، کس قدر مناجات اور گڑگڑا کر جلد رخصتی کی تمنّا دل میں رکھتے ہیں۔ ہم صاحب تاثیر اسی بزرگ کو کہتے ہیں جو ہماری بیٹیوں کو جلد رخصت کروادے اور صاحب تاثیر ہیں کہ اپنی جدائی کیلئے دعاؤں میں نہ صرف بخل کرتے ہیں بلکہ اس کے تصوّر سے بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ جدائی تو ایک دن ہو ہی جانی ہے۔ ایک آدمی کا باپ فوت ہو گیا، وہ بڑا رویا، بڑا پریشان ہوا! موت نے بڑا ظلم کیا، اسے چین نہ آیا۔ آخر کار اس نے ایک بزرگ استاد سے رجوع کیا۔ اس نے جواب دیا،، تم اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کچھ دنوں کی ہی تو بات ہے تم بھی اپنے باپ کے پاس پہنچا دیئے جاؤ گے۔،، بس یہی ہے موت کا راز یا زندگی کا راز۔ ہم کچھ عرصہ اپنی اولاد کے پاس رہتے ہیں اور پھر اپنے ماں باپ سے جا ملتے ہیں۔ بس یہ الگ بات ہے کہ بعض اچانک اور جلد اس سفر کو طے کر لیتے ہیں بلکہ ایک ہی جست میں ساری مسافت پھلانگ کر منزل پر جا پہنچتے ہیں اور بعض اپنے مولا کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں۔

بس! یہی موت اور زندگی کا فلسفہ ہے بلکہ ہر موت اپنے لواحقین کیلئے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے کہ جلد یا بدیر آپ نے بھی مجھے وہاں آ کر ملنا ہے۔
جہاں ہم سب بے بس اپنے مولا کی مغفرت کے منتظر ہوں گے۔ مرحوم اس فانی دنیا سے دار بقا کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔ اس عارضی زندگی کی بہاروں اور گلوں کی خوشبو سے منہ موڑ کر دائمی بہار، سدا خوشبوؤں و مہک کے گلستانوں میں براجمان ہو گئے ہیں۔ اپنے ہر تعلّق رکھنے والوں کو چھوڑ کر اپنے مولا کے ساتھ مضبوط تعلق و رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ پھر موت تو کوئی نئی چیز نہیں۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ کوئی ولی۔ جو بھی آیا ہے اپنا وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی محافظ ہے ۔ ہم سب اس کی امانت ہیں، پھر کس کی مجال جو اس میں خیانت کر سکے۔ مرحوم کی جن صفات کا تذکرہ پڑھنے کو ملا، میرا کریم رب یقیناً اپنے ایسے مہمانوں سے بڑا فیاضانہ سلوک فرماتے ہیں اور مرحوم ان تمام حسنات کے طفیل بہت ہی شاداں اور فرحاں ہونگے اور میری دعا ہے کہ جو کام وہ پ کے سپرد کر گئے ہیں اس کی تکمیل میں آپ کی سعی کو قبولیت کا درجہ حاصل ہو اور اللہ تبارک تعالیٰ آپ سب کو اس دنیا اور آخرت میں اس صبر آزما کام کا بہت ہی احسن نعم البدل عطا فرمائے اور ہم سب کو بھی موت کی تیاری کی فکر نصیب فرمائے، اللہ تبارک تعالیٰ آپ سب کو خوش و خرم رکھے۔ ثم آمین

ہمارے خون کے چھینٹے سب کچھ اسے بتا دیں گے
ہمارے بعد جو بھی کوچۂ قاتل سے نکلے گا

والسلام احقر سمیع اللہ ملک

بروز جمعرات 9 صفر الحرام 1432ھ 13 جنوری 2011ء

عزتِ نفس اور چھترول

میڈیا کی آزادی اب زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونا شروع ہو گئی ہے۔ چند سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر سرعت کے ساتھ معاشرے میں ہونی والی برائی یا کوئی ایسا خفیہ گوشہ آن کی آن میں ساری دنیا کے سامنے آجائے گا اور مہذب معاشروں میں اس کا خاطر خواہ ردّ عمل بھی ہو گا لیکن حیرت ہے ان افراد کی سوچ پر جو آج بھی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کوئی پرواہ کئے بغیر اپنی اسی پرانی روش کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی تازہ مثال اپنے ٹی وی سیٹ پر ہر ایک لمحے میں دیکھتے ہونگے کہ کس طرح ملک کے وہ ادارے جن کا سلوگن ہی "عوام کی خدمت" ہے وہ کس طرح اس ملک کے عوام کی عزتِ نفس کو پامال کرتے ہیں۔ لفظ،، چھترول،، ایک خالصتاً پولیس تھانوں کی زبان میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی عملی تصویر میڈیا نے کئی مرتبہ پیش کر کے ملک کے عوام کو اس سے متعارف کروادیا ہے لیکن ان دنوں حکومت اور اس کے اتحادیوں میں جو چھترول ہو رہی ہے اس نے جہاں ایک عجیب دلچسپ صورتحال پیدا کر دی ہے وہاں نواز شریف اور الطاف حسین کی لفظی چھترول اس ملک کا گویا سب سے بڑا موضوع بن گیا ہے اور شائد کچھ دنوں کیلئے ایوان صدر پر جو چھترول ہو رہی تھی اب اس میں کچھ کمی واقع ہو گئی ہے۔

لیکن کبھی آپ نے اپنے معاشرے پر غور کیا ہے کہ اس ملک میں ہر قدم پر انسانوں کی عزتِ نفس پر جو چھترول ہو رہی ہے اس میں ہمارا کردار کیا ہے؟ آیئے میں آپ کو اسی معاشرے کے چند کرداروں سے ملواتا ہوں جو ہر لمحے آپ کی آنکھوں کے سامنے سرزد ہوتے ہیں اور ہم نے اب اس کو ایک معمول سمجھ کر اس پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

اکثر آپ نے گھومتی ہوئی کرسیوں، بڑی بڑی میزوں، آراستہ دفاتر اور دروازوں پر کھڑے دربانوں میں بیٹھے ہوئے یہ لوگ جن کے چہروں پر ہر دوسرے لمحے موسم بدلتے ہیں، کبھی مسکراہٹ اور خوشامد کا موسم اور کبھی غصے اور حقارت کی رت دیکھی ہو گی۔ یہ لوگ ذلت سہنا بھی خوب جانتے ہیں اور موقع ملے تو کسی کی تذلیل سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم نے بچپن سے لیکر آج تک ان کو ہر زاویے سے دیکھا ہے، ان کی تیز گزرتی گاڑیوں کی دھول بھی کھائی ہے، ان کے دروازوں پر گھنٹوں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر بھی دیکھا ہے، ان کے ساتھ ایک عام شہری کی طرح گفتگو، سوال و جواب کا منظر بھی ازبر ہے، ان کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے مزاجوں اور چند ثانیوں میں تبدیل ہوتے لہجوں کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اس سارے گورکھ دھندے میں مجھے صرف ایک چیز پاؤں میں روندتی ہوئی نظر آتی ہے صرف ایک متاع ہے جو زخم زخم ہوتی ہے اور وہ ہے انسان کی عزتِ نفس، آیئے میں اس کھلونے کے ساتھ کھیلتے ہوئے چند منظر ناموں میں لئے چلتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اس سفر میں آپ کو دل تھام کر خاموشی سے ان کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کرنا ہو گا۔

یہ ایک سائل ہے جو کئی گھنٹوں سے باہر کھڑے چپڑاسی کی جھڑکیاں کھاتا، صاحب کے پی اے کی خوشامدیں کرتا اور بعض اوقات ان کی مٹھی گرم کر کے بالآخر دفتر میں افسر کے سامنے کانپتے ہاتھوں سے درخواست آگے بڑھاتا ہے۔ صاحب قلم سے کچھ لکھنے لگتا ہے، اتنے میں فریادی

لہجے میں زبان کھولتا ہے تو صاحب کی غصے بھری آواز اس کا خون خشک کر دیتی ہے "تمہیں کس نے کہا بولنے کو، میں نے پوچھنا ہو گا تو خود پوچھ لوں گا" درخواست پر ہلکے سے دستخط کر کے ایک طرف پھینک دی جاتی ہے۔ سائل کچھ کہنے کیلئے منہ کھولتا ہے تو پھر وہی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے "بس اب جاؤ، جان چھوڑو""لیکن سر آپ میری بات تو سنیں" میں نے پڑھ لیا ہے جو تم نے اس درخواست میں لکھا ہے""صاحب! میں کہاں سے پتہ کروں کہ میرا کام ہوا ہے کہ نہیں؟،، صاحب کے چہرے کا رنگ فوراً بدلتا ہے ،الٹے ہاتھ پر لگی ہوئی گھنٹی پر صاحب کی انگلی لگنے کی دیر ہے کہ چپڑاسی اندر داخل ہوتا ہے، صاحب کا مزاج آشنا ہے، وہ اس سائل کو بازو یا کندھے سے پکڑتا ہے اور یہ کہتا ہوا کہ آؤ میں بتاتا ہوں، باہر لیجاتا ہے۔ باہر کی دنیا جہاں اس جیسے کئی اور سائل اسے اس ذلت اور رسوائی سے باہر آتے ہوئے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

دفتر کی ایک مخصوص "گھنٹی" پر ایک کلرک فائلوں کا ایک انبار لئے ہوئے میز کی بائیں جانب ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ سامنے خالی ٹرے میں تمام فائلوں کو ایک ترتیب سے رکھ کر صاحب کے اشارۂ ابرو پر ایک فائل کے کچھ صفحات دکھانے کی جرأت کرتا ہے، کسی ایک صفحے پر صاحب کی آنکھ میں ذرا سی غصے کی چمک آتی ہے تو اس بیچارے کے ہاتھ تھر تھرانے لگتے ہیں، محنت سے ترتیب دی وئی فائل ہاتھوں سے پھسل کر گرا چاہتی ہے۔ بڑی مشکل سے ضبط کر کے وہ فائل سنبھالتا ہے اور پھر صاحب کے سامنے اپنا کیا ہوا کام رکھنے لگتا ہے۔ سامنے چند ایک معززین یا دوست بھی موجود جو کافی یا چائے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اچانک کاغذات کی ترتیب، فائل کی تھوڑی سی بے ہنگمی یا پھر کسی کاغذ کے چند سیکنڈ ڈھونڈنے پر موجود نہ ہونے کی وجہ سے صاحب کو غصہ آتا ہے ،عینک اتار کر میز پر پٹخ دی جاتی ہے، ہاتھوں میں پکڑی فائل ہوا میں لہراتی ہے اور کبھی کبھی سخت غصے میں ساتھ کھڑے شخص کے منہ پر مار دی جاتی ہے اور کبھی سامنے رکھی لمبی میز سے پھسلتی ہوئی قالین پر ورق ورق ہو جاتی ہے۔

خوف سے کانپتا، گالیاں سنتا، اپنے مستقبل سے مایوس وہ اہلکار کاغذ سمیٹتا، معافیاں مانگتا اور آئندہ بہتر کام کرنے کا وعدہ کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن غصہ کم نہیں ہوتا اور پھر ان سب لوگوں کے درمیان ذلت اور رسوائی کا داغ لیکر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ ایسے میں کبھی کوئی اس شخص کے دل کے اندر جھانک کر دیکھے تو اس میں ایک ہی خواہش ہو گی کہ اس کی آنکھوں کے کونوں میں جو آنسو چھلک رہے ہیں دریا بن کر امڈ پڑیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے، کسی گوشۂ تنہائی میں کسی ایسے شخص کے سامنے جو اس کا درد جانتا ہو، اسے شرمندہ نہ کرے اور وہ اس کے روبرو اپنا درد بیان کر سکے، اپنا دکھڑا رو سکے، اپنی ذلت کا مداوا کر سکے۔

یہ مناظر آپ کو ہر صاحبِ اختیار کے دفتر میں ملیں گے۔ یہ لوگ اپنے سے جونیئر افراد پر برستے ہیں، غصے میں گرجتے ہیں، انہیں کھڑے کھڑے

یہ سب سننا پڑتا ہے اور کبھی بھری میٹنگ میں سب کے روبرو، ایسے لمحوں میں کوئی نہیں سوچتا کہ اس کی آنکھوں میں جو ضبط کے آنسو ہیں، اس کے ماتھے پر جو شرمندگی کا پسینہ ہے، یہ سب اسے کس ذلت سے دوچار کر رہا ہے۔ اپنے ہی ساتھیوں کے سامنے اپنے ہی زیرِ سایہ کام کرنے والوں کے روبرو، یہ منظر صرف دفتر تک محدود نہیں ہیں، اگر کبھی کسی افسر اعلیٰ کو دفتر سے باہر نکل کر چند سیکنڈ کیلئے گاڑی کا انتظار کرنا پڑ جائے تو رات دن شٹل کی طرح کام کرنے والے ڈرائیور کی شامت آجاتی ہے۔ ہم کتنے نازک مزاج ہیں کہ دفتر سے نکلنے سے پہلے گھنٹی بجا کر اعلان کیا جاتا ہے، گاڑی لگواؤ۔ گاڑی سٹارت ہوتی ہے اور پھر ہماری سواری دفتر سے باہر نکلتی ہے۔ میز پر چائے کا کپ غلط رکھنے والے کو، چائے اگر تھوڑی سے پرچ میں گر جائے اس پر، باتھ روم میں تولیہ ڈھنگ سے نہ رکھا ہوا اس پر، کسی کلب میں سروس دیر سے ہے اس کی پاداش میں ہم لوگوں کو سر عام ذلیل ورسوا کر دیتے ہیں اور پھر بڑے فخر سے گردن پھلا کر یہ اعلان کرتے ہیں اگر ان سے محبت سے پیش آؤ تو یہ سر چڑھ جاتے ہیں۔

یہ ذلت ورسوائی ہماری سڑکوں اور چوراہوں پر بھی اس قوم کے عام آدمی کا مقدر ہے۔ آپ کی گاڑی کے سامنے سے کوئی شہر کی اقدار سے ناآشنا بڑھیا یا بے ضرر بچہ گزر جائے تو گاڑی روک کر اسے گالیاں دی جاتی ہیں اور اگر بس چلے تو ذلت کی انتہا کیلئے دو چار تھپڑ بھی رسید کر دیئے جاتے ہیں۔ موٹر سائیکل پر سوار شخص خواہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہو یا بیوی کے ساتھ، ہم اس کی غلطی پر اسے معاف نہیں کرتے، اسے بے عزت کر کے چھوڑتے ہیں۔ آپ نے ٹانگے والے یا ساتھ بیٹھے ہوئے بیٹے کے سامنے ذلیل ہوتے رسوا ہوتے لوگوں کو دیکھا ہو گا لیکن میڈیا کی آزادی کی وجہ سے ہم نے شائد پہلی مرتبہ ٹیلیویژن کی اسکرین پر پولیس کے ہاتھوں اس ملک کے عوام پر چھترول کے مناظر دیکھے ہیں اور ہر آنکھ انسان کی ایسی تذلیل پر شرمسار ہے لیکن یہ تو جسمانی چھترول تھی لیکن پچھلے نو سال سے تمام صلیبی طاقتیں امریکا کی قیادت میں مسلمانوں کی غیرت وحمیت پر جو چھترول کر رہی ہیں اور اس میں ہمارے حکمران اس دستے کا کردار ادا کر رہے ہیں جو چھتر کی دم میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور یہ دستہ امریکا نے بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے اور دوسری جانب حکومت کی طرف سے بدامنی، مہنگائی اور بیروزگاری کی چھترول میں دن بدن شدت آتی جارہی ہے اور عوام اب دونوں ہاتھ جوڑ کر اس حکومت سے پناہ مانگ رہے ہیں جس طرح چنیوٹ کا نوجوان چھترول کے دوران ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا لیکن حکومت شدت سے یہ کہہ رہی ہے کہ ابھی تمہیں مزید ڈھائی سال یہ چھترول برداشت کرنا ہو گی!

یہ ذلتوں کے مارے اسی دنیا میں سانس لیتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس مجروح کرنے والے بھی اسی دنیا میں، لیکن ایک بات طے ہے کہ جب عام آدمی ذلیل ورسوا ہوتا ہے تو چند لوگوں کے دل ضرور خون کے آنسو روتے ہیں، ان کی آنکھیں نم ہوتی ہیں لیکن تریسٹھ سالہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی مغرور، متکبر اور لوگوں کی عزت نفس کو مجروح کرنے والی آفت ومصیبت آئی، ایوانِ اقتدار سے رخصتی ہوئی، نوکری گئی، گرفتاری ہوئی تو پھر کوئی آنکھ رونے والی نہیں تھی، کوئی دل دھڑکنے والا نہیں تھا، سب یوں آنکھیں پھیر گئے جیسے یہ تو اس کا مقدر تھا، ایسا تو اس کے ساتھ بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔

کیا ہے قتل انا کو خود اپنے ہاتھوں سے
یہ بات میرے لئے خودکشی سے مشکل تھی

بروز اتوار 12 صفر الحرام 1432ھ 16 جنوری 2011ء

چلو اپنے رب کی طرف

جب کبھی ٹی وی آن کریں، کسی بھی چینل کا نمبر دبائیں، یا کوئی اخبار اٹھائیں تو ہر طرف سسکتی دم توڑتی انسانیت کے روح فرسا مناظر دکھائی دیتے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کہیں کسی خود کش حملے میں لاشوں کے انبار پڑے ہوئے ہیں، کہیں جنگوں میں بمباری سے ان گنت انسان موت کی آغوش میں دھکیل دیے جانے کی خبر سے دل دہل کر رہ جاتا ہے۔ کہیں قحط سے لوگ مر رہے ہیں اور کہیں سمندری یلغار یا سیلابی ریلے انسانوں کو بہا کر موت کی گمنام وادی میں اتار رہے ہیں۔ رہی سہی کسر دنیا میں ظالم و مظلوم کی کشمکش پوری کر رہی ہے۔ فلسطین کو جہاں صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے یہود کوشش کر رہا ہے وہاں کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دنیا کا ظالم ترین سرخ ریچھ روس جس کے دانت لاکھوں افغانوں کی شہادت نے کھٹے کئے وہاں اب مزید ظلم و ستم ڈھانے کیلئے قصر سفید کا فرعون قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ وہاں کے باسی پچھلے تیس سالوں سے مسلسل آج بھی مختلف خیموں میں گرمی سردی، بھوک و افلاس برداشت کر رہے ہیں۔ ہزاروں میل دور بیٹھے فرعون کو نجانے کیا سوجھی کہ عراق میں دنیا کی تباہی کے ہتھیار اس کو نظر آ گئے اور اس نے آن کی آن میں عراق کی بستیوں کو ایسا تاراج کر دیا کہ اب اس کو دوبارہ اصلی حالت میں لانے کیلئے اک عمر درکار ہو گی۔

دنیا کے طول و عرض میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں خون کی ہولی نہ کھیلی جا رہی ہو۔ وہ اسلامی ممالک جو کہ دولت کے لحاظ سے دنیا کی غربت و افلاس ختم کر سکتے ہیں ان کے خزانوں کا استعمال بھی اغیار کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس دولت کو انسانی فلاح کی بجائے اسلحے کے بڑے بڑے کارخانوں میں کھپا کر انسانیت کی ہلاکت کا ساماں تیار کر رہے ہیں اور یہی ممالک جو کہ دنیاوی ترقی کی معراج پر ہیں آج اپنی ہی تہذیب اور سوسائٹی سے اس قدر نالاں ہیں کہ ان کی سمجھ میں اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں آ رہی، آخر یہ کیوں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر کوئی چاہتا ہے۔ دنیا کی حیرت انگیز ترقی، دولت کی ریل پیل، حیرت انگیز وسائل رکھنے کے باوجود دنیا کے دانشور آج بے بس اور مجبور کیوں نظر آ رہے ہیں، آخر کیوں؟

جب ہم اپنے اسلاف کی طرف دیکھتے ہیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں اگر تند و تیز ہوا یا آندھی چل پڑے تو لوگ دیوانہ وار مساجد کی طرف دوڑتے تھے کہ مبادا قیامت کا نزول ہونے والا ہے۔ صحابہ کرام کی پوری جماعت اس عالم میں اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنی مغفرت کی دعائیں کرتی تھی اور اللہ کی رحمت کی طالب ہوتی تھی۔

رحمت دو عالم ﷺ کا رخ انور بھی ان مواقع پر کبھی سفید اور کبھی پیلا ہو جاتا تھا لیکن آج زلزلوں کی تباہی، سمندروں کے طوفان، قحط کا عذاب اور خانہ جنگیوں کی تباہ کاریاں بھی ہمارے دلوں میں ذرا سی جنبش پیدا نہیں کرتیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ زلزلے کے جھٹکوں نے پورے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا ہے، خود کش بمبار بھی میدان میں اتر آئے ہیں، لاہور اور کراچی میں کئی اور بے گناہ اس ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر اپنے اللہ کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ دوسروں کی جنگ کا دفاع کرتے ہوئے ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے باسیوں کو بار بار توبہ و استغفار کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے لیکن کاروبارِ زندگی میں کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں مل رہی۔ اخبارات اور میڈیا میں کہیں توبہ کی طرف مائل ہونے

کا اشارہ تک نہیں مل رہا اور نہ ہی تشکر کے الفاظ پڑھنے کو ملے ہیں کہ اللہ نے ہمیں کس قدر بڑی تباہی اور نقصان سے محفوظ کر دیا وگرنہ اس سے کم ریکٹر اسکیل پر درجن سے زائد ایسے زلزلے تاریخ کے خونی اوراق میں عبرت کیلئے محفوظ ہیں کہ انہوں نے کس قدر تباہی مچائی تھی۔

عملی زندگی میں جس طرح پولیس والے کی اچانک دستک ہمیں بدحواس کر دیتی ہے، ناکردہ گناہوں کی صفائی میں کہے جانے والے الفاظ ہمارے ذہنوں سے سفر کر کے زبان کی نوک پر آجاتے ہیں، کیا ان تمام ناگہانی آفتوں پر جو یقیناً ہمارے اپنے ہی اعمال کی سزا ہیں، ان کی صفائی میں کہے جانے والے الفاظ کا نزول اپنے دل و دماغ پر ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ اور پھر اپنی زبان سے آئندہ اعتراف کر کے تائب ہونے کی کوشش کی ہے؟ اگر ایمانداری سے اس کا جواب تلاش کیا جائے تو یقیناً نفی میں ہو گا کیونکہ آج ہمارا دل خوفِ خدا سے خالی اور دنیا کے خوف کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں خوف ایک دل میں کبھی یکجا نہیں رہ سکتے۔ ایک خوف اندر آتا ہے تو دوسرا خوف چپکے سے نکل جاتا ہے۔ مقامِ حیرت تو یہ ہے کہ پہاڑ جیسا فرق ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا لیکن دنیاوی دولت یا عزت و حشمت میں بال برابر بھی فرق آن پڑے تو اس کا فوری نوٹس لیا جاتا ہے اور اس کیلئے پوری توانائیاں صرف کر دی جاتی ہیں۔ اس کا بھرپور علاج تلاش کر کے پھر اس پر پوری ثابت قدمی سے عمل کیا جاتا ہے لیکن۔۔۔۔!

صد حیف!!! روزانہ ہم قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتے ہیں' احادیث اور تاریخی اسلامی کتب بھی زیرِ مطالعہ رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود جسم کے اندر چھوٹا سا لوتھڑا (دل) جو کہ پہاڑوں کو تسخیر کرنے کی قوت رکھتا ہے اس پر قرآن و احادیث کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہم میں سے بیشتر حضرات نے رسول اکرم ﷺ کا اپنے جفاکش اور وفا کیش صحابہ سے یہ خطاب یقیناً پڑھا ہو گا کہ:

"خدائے ذوالجلال جب قیامت کے دن اپنے تخت پر براجمان ہوں گے تو آدم علیہ السلام سے کہیں گے کہ ناری گروہ کو بھیجو تو آدم علیہ السلام کہیں گے کہ خداوندا..... ناری گروہ کون ہے؟ ارشاد ہو گا، ہزار میں سے نو سو ننا نوے (999) جہنم میں جھونکے جائیں گے اور جنت میں صرف ایک!

اس خطاب کے بعد اجتماع میں آنسوؤں اور ہچکیوں کا زلزلہ برپا ہو گیا تھا لیکن شائد ہم ان کو کوئی دوسری نسل سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ سب کچھ کر کے اس خوف سے روتے تھے کہ ہزار میں سے ایک کا بھی شرف حاصل ہو سکے گا نہیں! ان کے دلوں کو قران کی ایک آیت تہہ و بالا کر دیتی تھی، لیکن ہمارے دلوں کو پورا قرآن بھی ٹس سے مس نہیں کرتا، کتنا ہولناک فرق ہے جو آج اسلاف اور اخلاف کے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہزار سمجھانے کے بعد بھی اگر یہ فرق ہماری سمجھ میں آ بھی جاتا ہے تو دل اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔

شقیاالاصبحی جو کہ اسلاف کی ایک نشانی ہیں، مدینے میں انسانوں کا ایک جم غفیر دیکھ کر اس معاملہ کی تہہ کی جونہی کوشش کرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے ایک عاشق رسول ﷺ کو اپنے حصار میں لیا ہے اور حدیث سننے کی درخواست کر رہے ہیں تو جواب میں ان کے ہونٹوں اور جسم پر ایک لرزہ

طاری ہو جاتا ہے اور دردناک چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ تین بار کوشش کی لیکن زبان نے خوفِ خدا کی وجہ سے ساتھ نہ دیا۔ جب غشی کی حالت ختم ہو گئی تو فرمایا:

ایک ایسی حدیث سناتا ہوں جو اسی گھر میں رسول اکرم ﷺ کے منہ سے سنی تھی۔ "قیامت کے روز جب خدا بندوں کے فیصلے کیلئے اترے گا تو سب سے پہلے تین اشخاص طلب کئے جائیں گے، ایک قاری، دوسرا دولت مند اور تیسرا شہید! خدا قاری سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تجھے قرآن نہیں سکھایا، اس پر تو نے کیا عمل کیا؟ قاری جواب میں دن رات قرآن کی تلاوت کا ذکر کرے گا تو خدا اس سے فرمائے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے، تم نے یہ سب لوگوں کیلئے کیا تا کہ تم کو قاری کہیں۔ اسی طرح دولت مند اپنی سخاوت کا اور شہید اپنی جان کی قربانی کا ذکر کرے گا تو جواب میں رب ذوالجلال ان کو بھی جھوٹ سے تشبیہ دے کر دنیا کے دکھلاوے کا عمل کہے گا اور یہ کہہ کر رسول اکرم ﷺ نے میرے زانو پر ہاتھ مارا کہ اللہ تعالیٰ حکم صادر کریں گے کہ ان کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں دھکیل دو اور سب سے پہلے جہنم کی آگ ان پر ہی شعلہ زن ہو گی"۔

پھر جس طرح حدیث سنانے والے کی (حضرت ابو ہریرہ) کی چیخیں لوگوں نے نکلتی ہوئی دیکھیں یہی عالم سارے مجمع کا ہوا۔ ہمارے اسلاف پیکر اخلاص تھے اور ہم اس سے کوسوں دور! وہ ریاکاری کے خوف اور اس کے لرزہ خیز انجام سے لرزہ براندام تھے، ہم دنیاداری کو دین وایمان سمجھ کر بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ دنیا کے طول وعرض میں مختلف حادثات کو پڑھ کر ہم محض اس لئے مطمئن ہیں کہ ہم اس کا شکار نہیں ہوئے حالانکہ دل کی اسی بے حسی اور بدلتی ہوئی کیفیت نے تو ثابت کر دیا ہے کہ ہم جو برسوں سے انحطاط کا شکار ہیں اس کی وجہ ہمارا یہی عارضی قلبی اطمینان ہے۔ مومن اور مسلمان کے دل میں تو ایک تڑپ رہتی ہے جو اس کو ہر پل بے چین رکھتی ہے۔ دنیا میں خدا اور رسول کے احکام کی روگردانی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس ساری سوسائٹی وتہذیب کے دھارے کو تبدیل کرنے کی کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں کو اپنے رب سے جوڑتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کو شب وروز دہراتا ہے۔ صحابہ کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر روزانہ کے اعمال کا ہر روز سونے سے پہلے محاسبہ کرتا ہے۔ اگر ہماری بھی یہ کیفیت ہو جائے تو یقین کے ساتھ یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ سوال (جن کے جواب آج کل کے دانشور بھی) تلاش نہیں کر سکے ہمارے صالح اعمال کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ ہر روز ناگہانی آفتوں کا جواب صرف اور صرف یہ ہے اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو اگر زندگی ملک سکتی ہے تو صرف اسی ایک راستے پر چل کر۔ اس کیلئے ہم میں سے ہر شخص خدا کے ہاں جوابدہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اللہ کے احکام کو اس دنیا میں نافذ کرنے میں کتنا جان ومال صرف کیا؟

آیئے آج ہم سب یہ عہد کریں کہ آپس کی گروہ بندیاں، تفرقے بازی اور فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر اپنے دلوں کو خوفِ خدا سے آراستہ کریں گے تا کہ عقبیٰ وآخرت کی نجات ہو سکے۔ ثم آمین

بروز جمعرات 16 صفر الحرام 1432ھ 20 جنوری 2011ء

ایک خون ہی کافی ہے

پامسٹری میں ہاتھ کی لکیروں سے قسمت کے حال بتائے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں انسان کے کردار اس کی خوبیاں، کمزوریاں اور اس کے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لئے پامسٹ بھی اکثر تمہید باندھتے ہوئے پہلے کسی شخص کو اس کے مزاج، ضدی پن، کنجوسی، بے احتیاطی، واضح بیماری کے بارے میں بتائے گا کیونکہ ان کی علامت ہاتھ پر ایسے ہی واضح ہوتی ہیں جیسے ماتھا چھونے سے بخار کا پتہ چلتا ہے اور نبض دیکھنے سے دل کی دھڑکن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد وہ اندازے لگانا شروع کرتا ہے لیکن ان پیش گوئیوں میں بھی اس کی بنیاد اس استعداد یا اس رویے کی بنیاد پر ہوتی ہے جو پامسٹ کسی شخص میں پڑھ لیتا ہے۔ مثلاً ایک انتہائی غیر حساس اور بے صلاحیت لکیروں والے ہاتھ کے بارے میں وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ یہ مستقبل میں پینٹر، شاعر یا ادیب بن جائے گا۔

اسی طرح وہ حساس لائینوں اور نرم مزاجی کی علامتیں رکھنے والے کو قاتل، ڈکٹیٹر یا ظالم نہیں بتائے گا۔ یہ فن صدیوں سے انسان کی جستجو اور مشاہدے کی پیداوار ہے جیسے ہمارا علم قیافہ یعنی وہ کوئی ایک تبصرہ کسی دوسرے کے بارے میں ضرور کرتا ہے۔ یہ شکل سے شریف آدمی لگتا ہے یا شکل سے غنڈہ ہے۔ پامسٹری بھی ہاتھ دیکھ کر یہ بتاتی ہے کہ یہ ہاتھ سے کیسا لگتا ہے۔

ہاتھ کی ان لکیروں میں ایک علامت ایسی ہے کہ پامسٹ اگر اسے دیکھ لے تو فوراً یہ فیصلہ صادر فرما دیتا ہے کہ تمہیں اکثر محبت میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ علامت دل کی لکیر سے ایک شاخ کا دماغ کی لکیر کی طرف مشتری کے ابھار سے نیچے جھکنا ہے۔ ایسا فیصلہ صادر ہونے کے بعد وہ شخص اکثر یہ سوال کرتا ہے کہ مجھے مایوسی کیوں ہوتی ہے تو پامسٹ اکثر یہی کہتا ہے کہ تم میں ایک بہت بری عادت ہے۔ تم لوگوں سے توقعات بہت زیادہ وابستہ کر لیتے ہو اور جب توقعات پوری نہیں ہوتی تو پھر تمہیں شدید مایوسی ہوتی ہے اور یہ تمہارے ہاتھ سے ظاہر ہے اس لئے اول تو محبت کرو نہیں اور اگر کرو تو توقعات نہ لگاؤ تاکہ مایوسی نہ ہو۔

یوں لگتا ہے اس مملکت خداداد پاکستان کے سولہ کروڑ عوام میں سے اکثریت کے ہاتھوں پر دل کی لکیر سے دماغ کی لکیر تک جھکنے والی ایک شاخ موجود ہے اور اگر اس ساری قوم کو ایک بہت بڑے سٹیڈیم میں کھڑا کر دیا جائے اور ہاتھ بلند کرنے کو کہا جائے تو پامسٹ ان کے ہاتھ دیکھ کر کہیں گے جائو اپنے گھروں میں آرام کی نیند سو جائو، تمہارے مقدر میں ہمیشہ محبت میں مایوسی لکھی ہوئی ہے۔ مجمع سوال کرے گا کہ ایسا کیوں تو پامسٹ اپنے اندازے سے یہ بتائے گا اے سولہ کروڑ عوام تم خوش فہم ہو، خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ ہر کسی سے توقعات وابستہ کر لیتے ہو اور پھر جب وہ پوری نہیں ہوتی تو تمہارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ تمہارے کئی سال آنسو بہانے اور چھپ چھپ کر رونے میں گزرتے ہیں اور پھر جب تم سنبھلنے لگتے ہو، ذرا اس صدمے سے جاگتے ہو تو تمہارے سامنے ایک اور محبوب کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہم اس بدنصیب، خوش فہم اور جذباتی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مقدر میں ازل سے شاید یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ جس کے گلے میں ہار پہنائے گی، جس کی گاڑیاں چومے گی، جس کے راستے پر اپنا دل اور آنکھیں بچھائے گی جس کی لگن میں پیٹ پر لاٹھیاں کھائے گی، سینے گولیوں سے چھلنی کروائے گی

وہی اسے مایوس کرے گا۔ یہ وہی قوم تھی جس نے دس لاکھ لوگوں کا خوف اس سرحد پر نذرانے کے طور پر پیش کیا تھا اور خواب دیکھا تھا ایک ایسے ملک کا جس میں انصاف، امن اور خوشحالی ہو گی۔ یہ خواب پورا تو نہ ہوا لیکن اس ملک کے باسیوں کی آنکھوں میں ابھی تک امید باقی ہے۔ وہ ہر چند سال بعد اپنی آنکھوں میں امید کے دیئے روشن کر لیتے ہیں۔ حیرت ہے ان تریسٹھ سالوں میں اس قوم نے محبت کرنے میں کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا جو ان کو اپنی امیدوں کا مرکز نظر آیا اس کے لئے مجنوں کی طرح کوڑے بھی کھائے، سسی کی طرح دھوپ میں بھی جلے اور منصور کی طرح موت کو بھی گلے لگایا۔ سب نے اس قوم سے وعدے کئے، دعوے کئے اور ان سے محبت کی اس کٹھن راہ میں جانوں کی بھینٹ لی۔

لیکن اب ذلت ور سوائی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ قصر سفید کے فرعون کی سپاہ سفارت کاروں کے روپ میں ہمارے ملک میں نہ صرف دندناتے پھر رہے ہیں بلکہ ان کو یہ مکمل اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ جس کو چاہیں دن دیہاڑے ہمارے ہی شہروں کے پر رونق بازاروں میں ہمارے بے گناہ بچوں کو گولیوں سے بھون دیں یا پھر چلتی گاڑی سے ان کو روند کر راہِ فرار حاصل کر لیں۔،، سیلف ڈیفنس،، کے نام پر سفارتی استثناء حاصل کر کے پاکستان کے تمام قوانین کو پاؤں تلے روند کر ہمیں اس بات کا احساس دلائیں کہ غلاموں اور محتاجوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ ان تمام سفارت کاروں کو واشنگٹن بھیجنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ کیا ہمارے حکمرانوں کو اس ملک کی مظلوم بیٹی عافیہ یاد ہے جس کو بے بنیاد الزامات کی پاداش میں شرمناک تعذیب کے کئی مراحل سے گزارا گیا اور اب 86 سال کیلئے زنداں کی ایک کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اپنے کئی کالموں میں قصر سفید کے عزائم اور حکمرانوں کی بزدلی کی طرف توجہ دلا چکا ہوں، اربابِ اقتدار کو تو این آر او کے تحت اسی لئے درآمد کیا گیا ہے کہ امریکی عزائم کے راستے کی ساری دیواروں کو مسمار کر کے ایک مرتبہ پھر پاکستان کو غلامی کے بدترین اندھیروں میں پھینک دیا جائے۔

باب ورڈز کی مشہور زمانہ کتاب "اوبامہ وارز" میں خاص طور پر پاکستان کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جہاں مصنف کے مطابق امریکا اپنی ایک اہم خفیہ جنگ میں برسرپیکار ہے۔ اپنی اس کتاب میں اس نے انتہائی خوفناک انکشافات کئے ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں تحریر کرتا ہے کہ،، امریکا نے پاکستان میں سرکاری اجازت سے کئی اڈے بنا رکھے ہیں جس میں کوئٹہ میں اڈہ قائم کروانے کیلئے سی آئی اے کا سربراہ خود پاکستان آیا۔ 17 نومبر 2009ء کو امریکی صدر اوبامہ کا خصوصی مشیر ٹونی بلیکن نے امریکا میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کو بتایا کہ گو پاکستان نے دہشتگردوں کے خلاف سوات اور وزیرستان میں بڑے کامیاب آپریشن کئے ہیں مگر اب بھی پاکستان کی کارکردگی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے اور امریکا کو پاکستانی انٹیلی جنس اور کچھ دہشتگرد گروپوں سے شکائت ہے اور پاکستان کو ان کے خلاف ہر روز کاروائی کرنا ہو گی۔ اس ملاقات کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد سی آئی اے کا ڈائریکٹر پنیٹا اسلام آباد آدھمکا جہاں وہ سیدھا آصف زرداری سے ملا اور اس کے فوری بعد عسکری قیادت سے اپنی ملاقات میں یہ مطالبہ دہرایا کہ "وہ امریکا کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں کیونکہ اس طرح پاکستان بچ سکتا ہے"۔

اس نے اپنی دھمکی میں زور دیتے ہوئے کہا کہ "طالبان کا کمانڈ اینڈ کنٹرول کوئٹہ میں ہے جہاں یہ بم وغیرہ بناتے ہیں جو بعد ازاں افغانستان میں امریکی اور اتحادی فوجیوں کی ہلاکت کا سبب بنتے ہیں اور کوئٹہ میں اسی لئے امریکی شہریوں کو بارہا قتل کیا جاتا ہے، اس لئے امریکا اب مزید برداشت نہیں کرے گا"۔ اس دھمکی کے بعد سی آئی اے نے کوئٹہ میں اپنی موجودگی کو لازمی قرار دیا۔ پاکستان نے یہ بات فوری مان لی اور اس طرح سی آئی اے نے

کوئٹہ میں اپنا بیس قائم کرنے میں بالکل تاخیر نہیں کی۔ اس وقت کوئٹہ بیس میں سی آئی اے کے کافی ایجنٹ موجود ہیں اور ان ایجنٹوں کو پاکستان کی موجودہ حکومت نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ اگر انہیں ملا عمر یا طالبان کی اعلیٰ قیادت نظر آجائے تو فوری طور پر کسی کو اطلاع دیئے بغیر انہیں ہلاک یا گرفتار کر سکتے ہیں اور اس کے بدلے امریکا کوئٹہ میں ڈرون حملے نہیں کرے گا۔ کوئٹہ میں اپنا بیس قائم کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر پنیٹا نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ اب بھی پاکستان کی طرف سے کیا جانے والا تعاون کم ہے اور اب پاکستانی انٹیلی جنس کو سی آئی اے کے ساتھ مل کر پاکستان میں آپریشنز بڑھانے ہونگے اور اس کیلئے پاکستان میں سی آئی اے کے ایجنٹوں کو بڑی تعداد میں پاکستان آنا ہو گا۔

پاکستان کی عسکری قیادت نے اس مطالبے پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن ہمارے حکمرانوں نے سی آئی اے کے ایجنٹوں کو پاکستان آمد کی اجازت دے دی اور فوراً ہی بڑے پیمانے پر سی آئی اے کے ایجنٹوں کو پاکستان کیلئے ویزے جاری کرنے شروع کر دیئے۔ مثلا 18 جنوری 2010ء کو سی آئی اے کے 36 / ایجنٹوں کو فوری طور پر پاکستان آنے کیلئے ویزے جاری کر دیئے گئے اور اس کے بعد 10 / اپریل 2010ء کو سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیو کاپس نے ذاتی طور پر مزید دس ایجنٹوں کیلئے پاکستانی ویزے حاصل کئے، اس طرح پاکستان میں سی آئی اے کے ایجنٹوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے جو پاکستان میں شتر بے مہار کی طرح کاروائیوں میں مصروف ہیں اور کیا لاہور میں ہونے والا یہ دہشت گردی اور خونی واقعہ پاکستانی عوام کی آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی نہیں؟

پاکستان کے بے بس عوام نے جب بھی اپنے جوان بچوں کے لاشے اٹھائے لیکن ہمیشہ آنسوؤں اور امیدوں میں یہی فقرہ بولا بس اب ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ اب حالات بدل جائیں گے اب انصاف ہو گا، امن ہو گا، خوشحالی ہو گی۔ وہ لوگ تو جان دے کر سرخرو ہو گئے لیکن میں کبھی کبھی ایک منظر سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ وہ منظر جس میں کسی بے انصافی پر، ظلم پر، زیادتی پر، دھوکے پر ایک ایسی عدالت میں سزا سنائی جائیگی جو سب سے بڑی عدالت ہے۔ اس محشر کے میدان کی تپتی زمین پر اگر ان جان دینے والوں نے میرے رب کے روبرو گریبان تھام لیا ان لوگوں کا جن کے دعوئوں، جن کے وعدوں اور جن کے نعروں پر اس نے جان دی تھی اور مقدمہ دائر کر دیا اس اللہ کے حضور کہ میں نے جان دی تھی کہ لوگوں کو روٹی کپڑا امکان ملے گا، کوئی گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہے گا میں نے نظام مصطفیٰ ﷺ کے لئے جان دی تھی، میں نے عدل و انصاف کے لئے جان دی اور پھر سوال کرے گا۔ اے عادل و منصف رب میں نے جان دی تا کہ یہ شخص سرفراز ہو، اس قابل ہو کر میرے جیسے اور جان دینے والوں کے خواب پورے کر سکے۔ اسے اختیار ملا، طاقت ملی۔ اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں کوئی مصلحت کام نہیں آئے گی۔ وہاں اس اختیار کا سب کو جواب دینا پڑے گا جس کی بنیاد میں بے گناہوں کا لہو ہوتا ہے۔ وہاں کیس تکنیکی وجوہات کی بنا پر خارج نہیں ہو گا اور وہاں پر گریبان پکڑنے والے کی اپیل قابل سماعت ہے اور تمام عمر سزا کے لئے صرف ایک خون ہی کافی ہے۔

بروز جمعتہ المبارک 24 صفر الحرام 1432ھ 28 جنوری 2011ء

"اٹھو وگرنہ سحر نہ ہو گی پھر کبھی"

قرون وسطیٰ میں بصرے کا ایک چور عباس بن الخیاطہ بہت نامور ہوا، اس کی وارداتوں نے بصرہ اور اس کے اطراف میں ایک عرصے تک اہل ثروت کے ہوش اُڑائے رکھے پولیس نے لاکھ جتن کئے مگر عباس کسی طور بھی ہاتھ نہ لگا ایک روز اپنی ہی معمول سی غفلت کے نتیجے میں گرفتار ہوا تو اسے بصرے کی جیل میں یوں زیر حراست رکھا گیا کہ چوبیس گھنٹے سوا من وزنی بیڑیوں میں جکڑا رہتا عباس کی گرفتاری کے بعد کچھ عرصے تک تو بصرے میں امن رہا مگر ایک روز نواحی شہر ایلہ میں ایک بہت بڑی واردات ہو گئی جس میں شہر کے ایک نامی گرامی تاجر کے گھر سے لاکھوں کے جواہرات چرا لئے گئے، متاثرہ تاجر کا گھر کسی طور بھی ایک قلعے سے کم نہ تھا جہاں واردات کا تصور ہی محال تھا نتیجہ یہ کہ گویا بصرے کی پوری چیمبر آف کامرس دہل گئی متاثرہ تاجر نے بصرے میں تمام تاجروں کے ساتھ ایک میٹنگ کی اور اگلے روز اعلان کر دیا کہ اس کے گھر ہونے والی واردات کے پیچھے حاکم بصرہ کا ہاتھ ہے۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر کوئی عام چور اتنی بڑی واردات کر سکے۔

یہ حربہ کامیاب رہا حاکم شہر نے کوتوال شہر اور اس کے ماتحتوں کا جینا حرام کر دیا اور حکم دیا جس طرح بھی ممکن ہو چور کو گرفتار کیا جائے اور مال برآمد کیا جائے۔ پولیس سر توڑ کوشش کے باوجود کیس حل کرنے میں ناکام رہی اور کوتوال نے حاکم کے سامنے ناکامی کا اظہار کیا تو وہ بھڑک گیا اور اعلان کیا کہ اگر کوتوال مال مسروقہ کی برآمدگی میں مزید ایک ماہ ناکام رہا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا اپنی جان کو یوں خطرے میں پا کر سیدھا جیل گیا اور وہاں صبح و شام عباس بن الخیاطہ کی خدمت شروع کر دی چوتھے ہفتے عباس نے اس سے پوچھا "خدمت تو بہت ہو گئی اب مقصد بتائو؟" اس نے سارا ماجرا بیان کر کے کہا "میری جان خطرے میں ہے اس کیس کو حل کرنے میں میری مدد کیجئے اور صرف اتنا بتا دیجئے کہ اتنی بڑی واردات کرنے کی اہلیت رکھنے " والے چور اس علاقے میں کون کون ہیں؟

عباس مسکرایا اور بولا: "غیرت مند لوگ دوستوں کی مخبریاں نہیں کیا کرتے" یہ کہہ کر اس نے اپنا دامن اُٹھایا اور مسروقہ جواہرات نکال کر یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ "تیری خدمت کے سبب تیرا حق مجھ پر واجب ہو چکا اور غیرت مند لوگ کسی کا حق اپنی جانب نہیں چھوڑتے یہ جواہرات لے، بصرے سے فرار ہو جا اور ساری زندگی عیش کر" کوتوال جیل سے نکلا اور سیدھا حاکم کے پاس جا پہنچا جواہرات پیش کر کے برآمدگی کا تمام احوال بھی بیان کر دیا۔

حاکم نے مال اس کے مالک کے حوالے کیا اور اگلے روز عباس کو جیل سے اپنے ہاں طلب کیا اپنے گھر پر اس کی بیڑیاں کھلوائیں اسے غسل کروایا اعلیٰ درجے کا لباس زیب تن کروایا اور پورا دن مختلف انواع کے ماکولات و مشروبات سے تواضع کی رات ہوئی تو اپنے ہی عالیشان بیڈ روم میں اسے سلا دیا اگلا دن طلوع ہوا تو پاس بلایا اور کہا "میں جانتا ہوں کہ اگر ایک لاکھ کوڑے بھی تمہیں لگوا دوں تب بھی تمہاری زبان نہیں کھلوا سکتا مگر میں نے کل سے تمہیں اپنا ذاتی مہمان بنا رکھا ہے ہر لحاظ سے تمہاری مہمان داری کی ہے اور اکرام میں کوئی کمی نہیں چھوڑی میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری سزا معاف کر دوں

گااور جیل سے بھی خود کو رہا سمجھو بس ازراہ مہربانی صرف اتنا بتادو کہ جیل میں رہتے ہوئے یہ واردات کیسے کی ؟"عباس مسکرایااور کہا" یہ معاملہ ذرا گھمبیر ہے اس کے لئے باقاعدہ "ڈیل" کرنی ہو گی جس میں میرے ساتھیوں کو بھی تحفظ حاصل ہو"۔

حاکم مان گیااور یوں بصرے کے چور اور حاکم کے مابین آج کی زبان کے مطابق ایک "قومی مفاہمتی آرڈی نینس " کے خدوخال طے ہونے شروع ہوئے "ڈیل" کے مطابق عباس نے یہ شرط منوائی کہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے تمام اگلے پچھلے جرائم معاف ہوں گے اور اس سے گزشتہ چوریوں کا مال اور حساب کتاب نہیں لیا جائے گا جبکہ حاکم نے یہ شرط منوائی کہ وہ اور اس کے ساتھی توبہ کریں گے اور گارنٹی دیں گے کہ آئندہ چوری کی کوئی بھی واردات نہیں کریں گے عباس اور حاکم نے ایک دوسرے کی شرائط مان لیں "ڈیل" کی پاسداری کے وعدے بھی کر لئے اور حلف بھی اُٹھا لئے چنانچہ "مفاہمتی آرڈی نینس" کا اجراء ہوتے ہی عباس نے اپنی آخری چوری کا پورا ماجرا بیان کر دیا کہ کس طرح جیلر کو ایک ہزار اشرفیاں بطور رشوت دے کر وہ جیل سے رات ہوتے ہی نکلا اور کس طرح اس قلعے کا حفاظتی نظام درہم برہم کر کے اسی رات جواہرات چرا کر حسب وعدہ سورج نکلنے سے قبل جیل واپس آ گیا، حاکم بصرہ نے عباس کو رہائش مہیا کر دی اور اس کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی رہیں جبکہ عباس اور اس کا گروہ بھی "ڈیل" کی تاحیات پاسداری کرتا رہا اور یوں اہل بصرہ کو ہمیشہ کے لئے چوری کی وارداتوں سے نجات مل گئی۔

پرانے وقتوں کے وہ انسان چونکہ ترقی یافتہ نہ تھے بلکہ پورے ہی "دقیانوسی" تھے اس لئے ان کے چور بھی معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق "وضعدار" تھے وہ غیرت کی بات بھی کیا کرتے تھے اور وعدوں کی پاسداری میں بھی اپنی پوری زندگی بتا دیا کرتے تھے۔ ہم آج کے انسان ہیں نہایت ترقی یافتہ اس لئے پرانے وقتوں کی وہ "خرافات" ہم میں نہیں پائی جاتیں البتہ ایک مسئلے میں ہم بھی اہل بصرہ کے ہم پلہ ہیں ہمارے ہاں بھی اہل بصرہ کی طرح چوری کی ایسی وارداتیں ہوتی ہیں جنہیں ثابت کرنا محال ہو جاتا ہے۔ میر ا اشارہ ان بیوقوفوں کی جانب ہر گز نہیں جو درّے سے دو ہزار کی ٹی ٹی منگواتے ہیں اور اس کے زور پر کسی امیر کے گھر سے لاکھوں یا بڑا تیر مارا تو کسی بینک سے کروڑ ڈیڑھ کروڑ لوٹ لیتے ہیں اور مہارت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگلے ہی دن پولیس افسر سینہ تان کے اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ "ہم ملزمان کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں" اور پھر ایک روز تو پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں یا گرفتار ہو کر سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔

میر ا اشارہ ان کی جانب ہے جو واردات سے قبل بھی محترم یا محترمہ ہوتے ہیں واردات کے دوران بھی ان کا مقام یہی ہوتا ہے اور واردات کے بعد تو کرہ ارض پر ان سے بڑا "مظلوم" کوئی نہیں ہوتا وہ بڑے دھڑلّے سے ٹی وی کی کھڑکی سے ہمارے گھروں میں جھانک کر منہ چڑاتے ہیں کہ اگر ہم چور ہیں تو دس سال میں ثابت کیوں نہیں ہوا۔ ان کی وارداتوں کا حجم اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بیرونِ ملک محلات کے محلات تعمیر ہو جاتے ہیں۔ ایک ایک کروڑ پاؤنڈ سے زائد مالیت کا تو ان کا صرف ایک نیکلس ہوتا ہے ان کے گھوڑوں کی خوراک وہ من سلویٰ ہوتا ہے جس کا تصور دور حاضر کا عام شہری تو کجا گئے وقتوں کے

جلال الدین اکبر نے بھی نہ کیا ہو گا، انہیں بھنڈی کھانے کی خواہش ہو تو پی آئی اے کے خصوصی طیارے تین پاؤ بھنڈی بیرون ملک پہنچانے کو فضا میں بلند ہو جاتے ہیں ان کی گاڑی بلٹ پروف اور دل شرم پروف ہوتے ہیں۔

ایسی ہی ایک ہستی کو باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کے تحت پاکستان کے ایوانِ اقتدار میں داخل کیا گیا کہ فاسق کمانڈو مشرف اب ان کیلئے مزید مفید نہیں رہا تھا۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ قصر سفید کے اصطبل میں پہلے سے ایسے گھوڑوں کی افزائش کی جاتی ہے جو انہی مواقع پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ فاسق کمانڈو کے ہاتھوں ایسے ہی "مفاہمتی آرڈی نینس" کا اعلان کروایا گیا جو یقیناً ایک "ڈیل" کا نتیجہ تھا۔ یہ آرڈی نینس پانچ صفحات پر مشتمل تھا اور ہر صفحے پر باوجود کوشش کے کوئی شق اس مفہوم کی نہ مل سکی کہ فاسق کمانڈو مشرف نے بھی حاکم بصرہ کی طرح شہریوں کو آئندہ کے لئے چوریوں سے تحفظ دلایا ہو اور نہ ہی وقت کے عباس بن الخیاط اس موڈ میں نظر آرہے ہیں کہ یقین کیا جاسکے کہ تائب ہو چکے ہیں سو اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہم سے تو اہل بصرہ اچھے رہے' کاش ہمیں بھی حاکمِ بصرہ کا مفاہمتی آرڈی نینس نصیب ہوتا؟

لیکن اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ قصر سفید کے اصطبل کے گھوڑوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی ہے یا پھر اصطبل والے اپنے گھوڑوں کے سواروں کو قابو میں نہیں رکھ سکے۔ تیونس میں ایک سبزی کے ٹھیلے سے معاملہ شروع ہوا جو یمن سے ہوتا ہوا گراں خواب مصریوں تک آن پہنچا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب و عجم سے آزادی کی اس لہر کا رخ اب اسلام آباد کی طرف ہے۔ مغرب سے مشرق تک آزادی کی اس لہر کو روکنا اب ممکن نہیں رہا۔ میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ وہ نئی صبح نمودار ہونے کو ہے جس کیلئے یہ ارضِ پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اگر مشرق میں تیونس' یمن اور مصر نے انگڑائی لی ہے تو اب تو پاکستانیوں کو بھی جاگنا ہو گا۔ "اٹھو وگرنہ حشر نہ ہو گی پھر کبھی!"

بروز منگل 28 صفر الحرام 1432ھ یکم فروری 2011ء

سروں کی فصل

کوئی سوچ سکتا تھا کہ چند سال پہلے عالمی عدالت انصاف میں ظالموں اور ڈکٹیٹروں کو کٹہرے میں یوں کھڑا کیا جائے گا کہ فرد جرم کے جواب میں ان کے پاس صفائی کیلئے نہ تو کوئی گواہ ہو گا اور نہ ہی وہ خود اپنے اوپر لگنے والے الزمات کی تسلی بخش صفائی دے سکیں گے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ عالمی عدا لت انصاف کے کٹہرے میں بوسنیا کا ایک جابر ڈکٹیٹر مار کووچ شیطان صفت ظالم پر یہ بھیانک اور خونچکاں فرد جرم عائد کی گئی کہ اس نے وژگراڈ نامی شہر کے وسط میں سٹی ہال سے چند گز دور ایک مسجد کو ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا تھا جہاں ان گنت مسلمان جو اللہ کے گھر میں پناہ لئے ہوئے تھے اس مسجد کے اندر ہی دفن ہو گئے۔ جابر ڈکٹیٹر مار کووچ نے صفائی میں یہ استدلال دیا کہ اس قصبے میں پارکوں کی بہت کمی ہے اور مسجد کیونکہ پارک پر قبضہ کر کے بنائی گئی تھی اس لئے دوبارہ پارک کی غرض سے اس مسجد کو منہدم کیا گیا تھا۔ مار کووچ کے مظالم کا نگراں صدر میلاوسوچ عالمی عدالت انصاف میں اسی مسجد کی تباہی کا جواب دینے لگا تو اس نے ایک عجیب الزام لگایا کہ مسجد میں مقیم مسلمان مسجد کے میناروں سے گولہ بارود برساتے اور مشین گنوں کا بے دریغ استعمال کرتے تھے اس لئے اس مسجد کو تباہ کرنا پڑا۔ عدالت کے ایک جج نے جب یہ پوچھا، اگر ایسا تھا تو کوئی گولی یا بم آس پاس کی عمارت کو کیوں نہیں لگا۔ میلاوسوچ کا رنگ فق ہو گیا، اسے ایسے سوال کی قطعاً توقع نہ تھی کہ تاریخ اپنے ساتھ ثبوت لئے پھرتی ہے۔ اس کے بعد فرد جرم میں عائد تمام الزامات، ظلم زیادتی، قتل وغارت، لوٹ مار یا آتش زنی اور بے شمار مسلمان خواتین کی عصمت دری کے بارے میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ میرے کمانڈروں نے کیا ہے۔ وہ بہت خود مختار ہو گئے تھے اور خود ہی ایسے فیصلے کرتے تھے۔ عالمی عدالت انصاف نے ایسے میں میلاوسوچ پر ایک ایسی فرد جرم عائد کی جو تاریخ میں ہر آمر، ڈکٹیٹر، ظالم اور فرعون پر اس لمحے عائد کی جاتی ہے جب وہ اپنے احتساب سے ڈر کر، اپنے انجام کے خوف سے سارا ملبہ اپنے ماتحتوں پر ڈال دیتا ہے اور خود کو پاک صاف بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عالمی عدالت انصاف نے پوچھا، جب تمہارے یہ کمانڈر بے گناہ لوگوں کا قتل عام کر رہے تھے تو تمہیں اس کا علم بھی ہوا تھا اور ابھی تم نے عدالت کے سامنے اس کا اعتراف بھی کیا ہے تو اس بات کا جواب دو کہ تم نے ان کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کیوں نہیں کیا اور ان کو سزا کیوں نہیں دی؟ عدا لت نے اسے "مشترکہ مجرمانہ گٹھ جوڑ" قرار دیا اور اسے ظالم کو سزا نہ دینے پر جرم کا شریک کار ٹھہرایا۔ صدیوں کا یہ اصول عالمی عدالت انصاف کے دروازے پر قانونی اعتبار کا درجہ حاصل کر گیا۔ یہی اصول تھا جس کی کسوٹی پر یزید بن معاویہ اپنی تقاریر میں لاکھ صفائیاں دینے کے باوجود سیدنا امام حسین کے ناحق خون کا ذمہ دار ٹھہرا، کیونکہ قاتلین حسین اسی کے دور میں دندناتے پھرتے رہے اور سب جانتے ہیں کہ بالآخر ان سے امام حسین کا انتقام مختار ثقفی نے لیا تھا۔

یہی وہ اصول ہے جو دنیا کے ہر آمر، ڈکٹیٹر، ظالم اور فرعون کو اس کے دور میں ہونے والے قتل، لوٹ مار، تشدد اور سیاسی اموات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور یہی وہ مشترکہ مجرمانہ گٹھ جوڑ ہے جو کسی ظالم کو بھاگنے کا باعزت راستہ نہیں دیتا۔ یہی وہ کسوٹی ہے جو بتاتی ہے کہ اگر قتل کرنے والے، ظلم کرنے والے، تشدد روا رکھنے والے اور انسانی جانوں سے کھیلنے والے کسی دور میں سرفراز تھے، اعلیٰ عہدوں پر براجمان تھے یا ہیں مگر ابھی تک کسی وجہ سے ان

پر فرد جرم عائد نہیں کی گئی لیکن ایک دن ان کو اسی طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا چاہے ان کو سروں پر قصر سفید کے فرعون کا سایہ ہو، چاہے ان کو وقت کے نمرود نے لندن میں پناہ دے رکھی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں بے گناہوں کی لاشیں بند بوری میں ڈال کر سر عام سڑکوں پر ڈال دی جائیں، نوجوان بے گناہ بچوں کے لاشے ناقابل شناخت حالت میں ان کے ورثاء کو اس تحریر کے ساتھ ملیں کہ،، جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے،،۔ جو پارٹی کے فاشزم کے خلاف زبان کھولے تو اس کے جسم میں ڈرل مشین کے ساتھ سوراخ کر کے اس کی زبان ہمیشہ کیلئے خاموش کر دی جائے۔ ایسا ہی عمل میلاوسوچ کے کارندوں نے بھی کیا تھا۔ انہوں نے بھی زندہ انسان کے جسم میں میخیں ٹھونک کر مسجد کی دیوار کے ساتھ صلیب کی شکل میں لٹکا دیا تھا۔ ان تمام مقدمات کی تفاصیل میں اس قدر مماثلت دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں کہ انسان اس قدر وحشی اور ظالم بھی ہو سکتا ہے۔

میلاوسوچ کے کارندے مظلوم لوگوں کو ہانک کر کسی گہرے دریا کے پل پر لیجا کر دھکا دے دیتے یا پھر گولی مار کر لاش کو دریا برد کر دیتے۔ ایسا ہی عمل کراچی میں ایک لسانی ماعت (فاشرم منشور رکھنے والی جماعت جس کے ہر رکن کو اپنے قائد سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے) نے بار بار دہرا کر اپنے ظلم کی ایسی دھاک بٹھائی تھی کہ کراچی کے بے شمار صنعت کاروں نے وہاں سے اپنے بڑے بڑے کاروبار کو سمیٹ کر اپنا سرمایہ کراچی سے نکال لیا تھا کیونکہ وہ بھاری بھتہ دینے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ کراچی شہر کے ماتھے پر اس لسانی جماعت کے ہاتھوں شہید ہونے والے بے شمار لوگوں میں حکیم محمد سعید شہید اور صلاح الدین شہید کا خون ناحق اس لسانی اور بھتہ خور جماعت کے قائد کے ماتھے پر ہمیشہ ایک کلنک کا ٹیکہ بن کر تاریخ کے سیاہ اوراق میں محفوظ ہو گیا ہے۔

اب ایک دفعہ پھر ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور ملک کی دو سیاسی جماعتیں جو مرکز اور صوبہ سندھ میں ایک دوسرے کی حلیف بھی ہیں، کو موردِ الزام ٹھرایا جا رہا ہے لیکن ان تمام مظالم بھری تاریخیں مجھے ایک بھی ایسا واقعہ نہیں مل سکا جو ظلم و تشدد، وحشت اور درندگی میں لال مسجد اور جامعہ حفضہ کی گرد کو بھی پہنچ سکتا ہو جہاں ان تمام معصوم بے گناہ یتیم بچیوں کو اس طرح خوفزدہ حالت میں اکٹھا کر کے بموں سے اس بے دردی کے ساتھ اڑا دیا گیا ہو کہ جب ان شہداء کی لاشیں سمیٹی جا رہی تھیں تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئی ملیں۔ جن کی بجلی، پانی اور خوراک کی تمام سپلائی کئی روز پہلے بند کر دی جائے۔ ایسا ہی تو یزید کی افواج کے سپہ سالار ابن زیاد نے کیا تھا لیکن ان تمام مظالم کی داستانوں میں کہیں بھی ثبوت مٹانے کیلئے سفید فاسفورس استعمال نہیں کیا گیا۔ ایسا واقعہ تو دنیا کے سب سے بڑے ظالم ملک اسرائیل کے چالیس سالہ دور میں بھی نہیں پیش آیا کہ ایک شخص اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ حفاظت کا راستہ مانگتا ہو تو اچانک اس کی ماں کا خون آلود لاشہ اس کی گود میں آ گرا ہو، اور پھر اچانک چاروں طرف سے بموں کی گھن گرج میں چیخوں، آہوں سسکیوں کی ایسی صدا بلند ہو جو آج بھی ان فضاؤں میں ان ظالموں کا پیچھا کر رہی ہوں۔

اے مرے دوست ذرا دیکھ میں ہارا تو نہیں
مرا سر بھی تو پڑا ہے مری دستار کے ساتھ

روس کے شہر باسلان میں دو سو بچوں کو جب یرغمال بنایا گیا تو روس کی فوج سخت ایکشن پر تلی ہوئی تھی لیکن پیوٹن کی آنکھوں سے نیند غائب چکی تھی۔ پورا روس جاگ رہا تھا۔ بچوں کے مرنے پر روس میں تین دن کا سرکاری سوگ منایا گیا اور اس صحافی کو اخبار سے نکال دیا گیا جو سخت ایکشن پر اکساتا تھا۔ تمام کاروائی کے انچارج اور افسران کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا لیکن لال مسجد اور جامعہ حفضہ کے آپریشن کرنے والوں میں اتنی سی انسانی حمیت اور رحم کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی بلکہ یہاں تو وزارت عظمٰی میں براجمان شوکت عزیز اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد کے بلیو ایریا میں قلفی کھانے چلا گیا اور دوسرا سفاک ایوان صدر میں، قصر سفید میں بیٹھے فرعون کے احکام کو بجالاتا رہا۔

اس سانحے کو گزرے ہوئے کوئی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی، پتہ نہیں مجھے کیوں ان معصوم پاکیزہ ارواح کی چیخوں کی صدائیں سنائی دے رہی ہیں۔ پانچ دن پانی کے بغیر جولائی کے مہینے میں کربلا کے شہیدوں کے نقش قدم پر چل کر شہادت کا جام نوش کرنے کا منظر آنکھوں کے سامنے جھلکتا ہے۔ بس ایک سوال سوچتا ہوں کہ اگر اس مجرمانہ گٹھ جوڑ کا اصول وضع کر دیا جائے، عالمی عدالت انصاف کی کرسی سج جائے تو کیا ہو گا؟ جس نے آخری وقت تک محفوظ راستہ دینے سے ان معصوم عورتوں، بچوں اور نمازیوں کو انکار کر دیا تھا لیکن زرداری حکومت نے اسے گارڈ آف آنر پیش کرتے ہوئے محفوظ راستہ فراہم کر کے اپنے گٹھ جوڑ کا عملی ثبوت دیا۔ ہاں یہ الگ بات ہے وہ بغیر وکیل کے، بغیر فرد جرم کے اور بغیر کسی مقدمے کے مارے گئے۔ مگر یہاں وکیل بھی ملے گا، فرد جرم بھی لگے گی، مقدمہ بھی چلے گا، صفائی کا موقع بھی ملے گا۔ زبان پر تالہ لگا دیا جائے گا، سب سے پہلے بائیں ران گواہی دے گی اور پھر آہستہ آہستہ اپنے جسم کے تمام اعضاء جب گواہی دے چکے تو آخر میں زبان کو بولنے کی اجازت ملے گی تو پہلا جملہ منہ سے یہ نکلے گا کہ،، ہائے تم سب نے میرے خلاف گواہی دے ڈالی حالانکہ میں تو ساری عمر تمہاری خدمت میں جتا رہا"۔

جو قومیں اس طرح کے،، مشترکہ مجرمانہ گٹھ جوڑ،، پر عدالتیں نہیں بٹھاتیں، انصاف نہیں کرتیں وہاں توابین کی تحریک کی صورت میں مختار ثقفی ضرور اٹھتا ہے اور تاریخ کا وہ منظر کتنا خوفناک ہے کہ اسی دربار میں ایک روز چبوترے پر ابن زیاد کا سر عبرت کے طور پر لا کر رکھا جاتا ہے۔ نجانے کیوں ماہ نومبر 1971ء کا یہ واقعہ قلم کی نوک پر آ گیا جب جنرل یحیٰی خان اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں لاہور گورنر ہاؤس میں کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے۔ جنرل عتیق الرحمان اس وقت گورنر تھے۔ گورنر ہاؤس کے باہر جنرل یحیٰی خان کے خلاف ایک بھرپور جلوس غصے میں ہائے ہائے، اوئے اوئے اور دوسرے نعرے بلند آواز میں لگا رہے تھے۔ ان نعروں کی آوازیں گورنر ہاؤس کی دیواریں عبور کر کے سبزہ زار تک پہنچ رہی تھیں۔ جنرل یحیٰی خان نے بڑے غصے سے پوچھا،، عتیق! یہ کیا چاہتے ہیں؟،، جنرل عتیق الرحمان جو حالات سے بری طرح چڑ چکے تھے اور وقت کی نبض پر ان کا صحیح ہاتھ تھا، انہوں نے دائیں بائیں دیکھ کر فوری طور پر وہ تاریخی فقرہ کہا جو جنرل یحیٰی خان کے ساتھ ہمیشہ کیلئے چپک گیا" سر یہ لوگ آپ کا سر مانگتے ہیں"۔ جنرل یحیٰی خان اپنے ماتحت سے ایسے جواب کی ہرگز توقع نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے جنرل عتیق الرحمان کو انتہائی گھور کر دیکھا اور غصے سے باہر جانے لگے۔ جنرل یحیٰی خان جب دروازے کے پاس پہنچے تو جنرل عتیق الرحمان تیزی سے سامنے آئے، ایک اور تاریخی فقرہ کہا" جنرل صاحب! میں تاریخ کا کیڑا ہوں، میں نے تاریخ میں پڑھا ہے آج تک کوئی آمر اقتدار سے عزت اور توقیر سے رخصت نہیں ہوا، میرا خیال ہے کہ آپ بھی عزت کے ساتھ نہیں جائیں گے لیکن اس کے باوجود میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنا اور ہمارا سر بچائیں، عزت کے ساتھ استعفٰی دے دیں، یہ ملک بھی بچ جائے گا اور ہم

بھی"۔میرا خیال ہے اگر تمام فوجی ڈکٹیٹر یہ فقرہ لکھ کر اپنی میز پر لگا لیتے تو آج پاکستان کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی جو جنرل عتیق الرحمان نے جنرل یحییٰ خان سے کہا تھا۔

ساری قوم کا خیال ہے کہ صدر زرداری کو ہمارے سروں کی سلامتی کیلئے اپنے عہدے سے مستعفی ہونے میں اب ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اگر صدر صاحب آپ نے عہدے کی قربانی نہ دی تو پورا ملک قربان گاہ بن جائے گا اور ہر شخص اپنا اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اس قربان گاہ کا طواف کر رہا ہو گا۔اس وقت ہم تاریخ کی اس گلی کی نکڑ پر کھڑے ہیں جہاں سخت اندھیرے میں سروں کی بہت بڑی فصل کٹنے کیلئے تیار کھڑی ہے۔

میں موجودہ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف چار سال پہلے انہوں نے اڈیالہ جیل راولپنڈی میں دوران اسیری ایک کتاب تحریر کی تھی،وہ اپنی اس کتاب "چاہ یوسف سے صدا" کا صفحہ نمبر 262 ضرور پڑھ لیں جہاں انہوں نے لکھا ہے کہ بلوچستان اور وزیرستان کے مسئلے کی صحیح تشخیص کر کے فوجی آپریشن بلا تاخیر بند کئے جائیں۔اب وہ وزیر اعظم بن کر سرحد میں فوجی آپریشن کو بہت ضروری سمجھ رہے ہیں۔بہتر ہو گا کہ وہ قصر سفید میں بیٹھے فرعون کے احکام کی اندھا دھند تعمیل کی بجائے مسئلے کی صحیح تشخیص کیلئے پارلیمنٹ کی مشترکہ قرارداد پر عملدرآمد کو یقینی بنائیں۔اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی کتاب کو تو مت بھولیں۔اس تاثر کو بھی زائل کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اٹھارویں ترمیم کے باوجود ایک بے بس کٹھ پتلی کی طرح پس پردہ زرداری کے ہاتھوں میں ناچ رہے ہیں۔

اب وقت آگیا ہے اور مزید تاخیر کے تو ہم بالکل متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔ہمیں بالخصوص امریکہ اور بالعموم اس کے اتحادی (نیٹو) ممالک پر واضح کر دینا چاہئے کہ ان کے آئندہ مجوزہ پروگرام کے کتنے مضر نتائج نکل سکتے ہیں۔اس مجوزہ پروگرام کے نتیجے میں اس قدر خودکش حملہ آور پیدا ہونگے کہ تاریخ میں اس کی مثال بڑے خوفناک مناظر کے ساتھ پڑھی جائے گی۔اس خطے میں دنیا کے امن کو تباہ کرنے کا اصل ذمہ دار قصر سفید میں بیٹھا فرعون اور دیگر 40 ممالک کی 70 ہزر افواج کی موجودگی ہے۔ افغانستان میں روس کے سفیر ضمیر کابلوف کا کہنا ہے کہ قصر سفید میں بیٹھا فرعون اور دیگر 40 ممالک 70 ہزر افواج فغانستان کے اندر امن قائم کرنے کیلئے نہیں آئیں بلکہ پورے خطہ میں بالادستی قائم کرنے کا منصوبہ لیکر آئی ہیں۔

افغانستان میں پہلی دفعہ روس نواز،ایران نواز اور پاکستان کی حامی سمجھی جانے والی طاقتوں میں ایک غیر اعلانیہ اتحاد بن رہا ہے۔اس اتحاد کا سب سے زیادہ نقصان،امریکا اور اس کے اتحادی قوتوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کو ہو گا۔جونہی افغانستان میں خطرات بڑھیں گے پاکستان پر اتنا ہی دباؤ بڑھتا جائے گا۔اس لئے پاکستان میں مضبوط سیاسی قیادت کا ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے جو قصر سفید کے فرعون اور اس کے حواریوں کو انہی

کے ممالک میں جاری اور ساری جمہوری قواعد وضوابط کے حقیقی اصولوں کا حوالہ دیکر پاکستانی عوام کے جذبات سے آگاہ کر سکے کہ یہ آپ کی جنگ ہے اور آپ خود اس کا خمیازہ بھگتیں۔ ہم آپ کے امن کی خاطر مزید اپنا امن کیوں داؤ پر لگائیں؟

اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں سیاست دانوں کی نہیں بلکہ ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو صرف پاکستانی عوام کے مفادات کو مد نظر رکھے، ایسا لیڈر جس کا پہلا اور آخری ٹھکانہ پاکستان ہو جو سب فیصلے پاکستان میں بیٹھ کر کرے، نہ ہی اپنے آقاؤں سے اپنے اقتدار کے استحکام کیلئے مدد طلب کرے اور نہ ہی لندن میں بیٹھے کسی بھتہ خور کے سامنے مجرموں کی طرح گردن جھکا کر اس کی وساطت سے بیرونی آقاؤں کی جی حضوری کرے۔ ہمیں کاغذ کی ناؤ میں بیٹھے لیڈروں سے کسی طوفان کا مقابلہ کرنے کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ ہمیں آج سے ہی ایسے لیڈر کی تلاش شروع کر دینی چاہئے جو اس مشکل گھڑی میں اس قوم کا نجات دہندہ بن سکے۔ اگر ہمارا عزم مضبوط اور اپنے اللہ پر یقین کامل ہو جائے تو یہ منزل اب بھی ایسی دور نہیں۔ سجنو بس نام رہے گا میرے رب کا جس کو فنا نہیں!

آواز دے کے دیکھ لو شائد وہ مل ہی جائے

ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

بروز جمعرات 30 صفر الحرام 1432ھ 3 فروری 2011ء

وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

برطانیہ کا مشہورِ زمانہ اخبار سنڈے ٹائمز ہر سال برطانیہ کے ایک ہزار امیر ترین افراد کی فہرست شائع کرتا ہے۔ اس سال بھی اس نے ہزار ارب پتیوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ایک دفعہ پھر رومین ابراموویچ برطانیہ کا امیر ترین شہری قرار پایا ہے اور اس کے اثاثوں کی ملکیت آٹھ بلین پاؤنڈ ہے۔ اس کی دولت میں ہر گھنٹے 57 ہزار پاؤنڈ (78 لاکھ 66 ہزار روپے) اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد فلپ گرین اور بھارت نژاد لکشمی متل کا نمبر آتا ہے۔ لکشمی متل نے چند برس پہلے سنٹرل لندن میں 72 ملین پاؤنڈ کا ایک محل خریدا تھا جو دنیا کا مہنگا ترین محل ہے اور اس لحاظ سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہو چکا ہے۔ اس فہرست میں سر انور پرویز اور عارف پٹیل سمیت سات پاکستانی بھی شامل ہیں۔ سنڈے ٹائمز کا کہنا ہے کہ پورے یورپ میں سب سے زیادہ ارب پتی برطانیہ میں آباد ہیں اور آبادی کے لحاظ سے بھی برطانوی باشندے یورپ بھر میں سب سے زیادہ امیر ہیں۔

مجھے اس فہرست اور اس فہرست میں شامل لوگوں کا پروفائل پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس میں بڑے بڑے امیر لوگ موجود ہیں۔ لوگوں کے پاس محلات ہیں ،ہوائی اور بحری جہاز ہیں، وہ کار سازاداروں سے اپنے لئے مخصوص گاڑیاں بنواتے ہیں۔ ان کے دفتروں، کمپنیوں اور کارخانوں میں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کے جوتے اور کپڑے ڈیزائن کرنے کیلئے، ان کی خوشبویات اور باتھ رومز کی اشیاء بنانے کیلئے الگ کمپنیاں ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی ایک کمپنی برطانیہ کے صرف سو خاندانوں کیلئے جوتے بناتی ہے۔ ایک ڈینش کمپنی ان لوگوں کے کتوں اور بلیوں کیلئے خوراک بناتی ہے۔ یہ خوراک ان لوگوں کے گھروں پر پہنچائی جاتی ہے، یہ کبھی مارکیٹ نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی ذاتی زندگی، ان لوگوں کے اخراجات اور پسند و ناپسند ایک الگ کہانی ہے، یہ کہانی ہم کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔

سرِ دست ہم اس فہرست پر غور کرتے ہیں۔ اس فہرست میں ایک ہزار لوگ شامل ہیں لیکن آپ دلچسپ بات ملاحظہ کیجئے، ان ہزاروں لوگوں میں ایک بھی سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹ نہیں۔ یہ سب لوگ بیوپاری، تاجر اور صنعتکار ہیں۔ مجھے یہ جان کر حقیقتاً حیرت ہوئی کیونکہ اگر کبھی پاکستان میں ارب پتیوں کی فہرست بنی تو اس میں صرف سینکڑوں سیاستدان وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس شامل ہوں گے۔

یہ حقیقت، یہ نکتہ ہی پاکستان کی پسماندگی کی واحد وجہ ہے۔ معاشروں اور ریاستوں میں تاجر، بیوپاری اور صنعتکار پیسہ بنایا کرتے ہیں اور سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس ایسی پالیسیاں جن کے ذریعے صنعتکاروں، تاجروں اور بیوپاریوں کے اثاثے، اکاؤنٹس اور منافع ٹیکس کے دائرے میں آجائیں اور وہ لوگ اپنے مالیاتی حجم کے مطابق سرکاری خزانے میں جمع کرائیں، اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ خیراتی کاموں میں خرچ کریں اور عوامی فلاح کے منصوبوں میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں لیکن جس معاشرے میں سیاستدان ،وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس ارب پتی ہوں، وہ خود صنعتکار ،بیوپاری اور تاجر ہوں، اس ملک میں کبھی ٹیکس کے مضبوط قوانین پاس نہیں ہو سکتے۔ جس ملک میں قانون توڑنے والے ہی قانون ساز ہوں، اس ملک

میں کبھی قانون کی پاسداری نہیں ہو سکتی اور جس ملک میں حکمرانی کی جڑیں جاگیرداروں کی ڈیوڑھیوں میں پیوست ہوں، اس ملک میں جاگیرداری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

آپ خود سوچئے اگر آپ کسی جواری کو ایس ایچ او لگا دیں تو کیا اس تھانے کی حدود سے جوا خانے ختم ہوں گے ؟ کبھی ختم نہیں ہو سکتے! لہٰذا برطانیہ جیسے معاشرے، پارلیمنٹ اور چیمبر آف کامرس کے درمیان ہمیشہ ایک خندق کھود کر رکھتے ہیں۔ وہ کسی سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس کو سرمایہ دار بننے دیتے ہیں اور نہ ہی کسی سرمائے دار کو سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس!

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے کہ جس ملک میں دواساز کمپنیاں اپنے کسی نمائندے کو محکمہ صحت کا وزیر مقرر کروالیں تو کیا اس ملک کی ادویات کی قیمتوں میں کمی آسکتی ہے ؟ جی نہیں، قیامت تک کم نہیں ہونگی جبکہ اس ملک میں اگر یہ محکمہ کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیا جائے جو عرصے تک خود دوائیں خرید تا رہا ہو جو اپنی جیب سے دوائیں خرید کر غریبوں میں تقسیم کرتا رہا ہو یا جس نے طویل عرصے تک لوگوں کے چندے سے چلنے والے کسی اسپتال میں کام کیا ہو، آپ دوسرے روز ہی اس وزارت میں تبدیلی محسوس کر لیں گے۔ ا، مگر یہ کام ہمارے معاشروں میں ممکن نہیں۔ ہمارے ملک میں تو اقتدار اور پیسے کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ہم خربوزوں کی رکھوالی کیلئے ہمیشہ گیدڑ بھرتی کرتے ہیں اور اس کے بعد چھلکے گنتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی حال ہماری چند دوسری وزارتوں کا ہے جس میں وزارتِ پانی و بجلی، وزارت پٹرولیم اور وزارت، تجارت سرِ فہرست ہیں اور علاوہ ازیں ملک کا کوئی بھی وفاقی محکمہ ایسا نہیں جس پر بدعنوانی اور کرپشن کے الزامات نہ ہوں۔

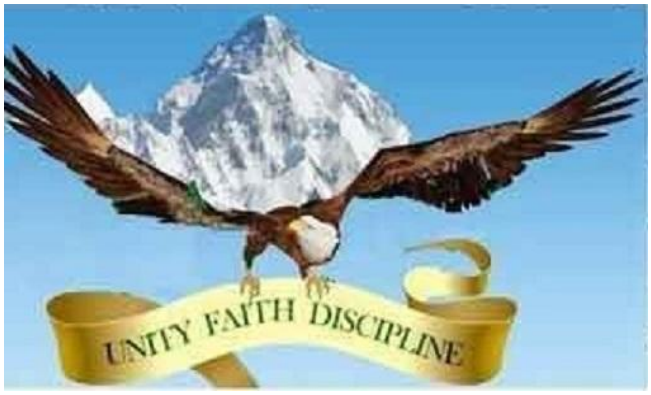

یقین کیجئے جن معاشروں میں ایک ہی شخص مدعی بھی ہو اور منصف بھی ان معاشروں میں کبھی انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ منتخب ہونے کے بعد گھر سے نکلے تو حضرت عمر نے پوچھا،، امیر المومنین کہاں کا قصد ہے ؟" فرمایا،، اپنی دوکان پر جا رہا ہوں "حضرت عمر مسکرائے اور عرض کیا" جناب عالی! جس بازار میں خلیفہ کی دکان ہو گی وہاں دوسروں کی دوکانیں کہاں چلیں گی ؟" حضرت ابو بکر صدیق نے اثبات میں گردن ہلائی اور گھر واپس چلے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب جرمنی پوری طرح تباہ ہو گیا تو وہاں ایک قانون پاس ہوا" کوئی صنعتکار، تاجر، بزنس مین، بیوپاری پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بن سکتا، اگر کوئی بننا چاہے تو اسے پہلے کاروبار بند کرنا ہو گا" یہ قانون صرف یہیں تک محدود نہیں رہا۔ آج یہ حالت ہے جرمنی میں کوئی سیاستدان سیاست سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جرمنی میں کاروبار نہیں کر سکتا جبکہ ہمارے ملک میں دوکانوں، شاپنگ پلازوں، کارخانوں اور فارم ہاؤسز پر وزارت کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس کارخانے دار ہیں لہٰذا ہم ترقی کیسے کریں گے ؟

پاکستانی الیکشن کمیشن ہر سال پارلیمنٹ کے ممبران، حکومتی عہدیداران سے ان کے اثاثوں کی فہرست طلب کرتا ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے بہت سے سیاستدان اور حکمران تو اتنے غریب ہیں کہ وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔ امسال صرف سابقہ وزیر خزانہ کو ارب پتی اور وزیرِ داخلہ کو کروڑ پتی بتایا گیا ہے ۔ ہمارے بعض سیاستدانوں کے پاس رہنے کیلئے نہ گھر ہے اور نہ سواری کیلئے کوئی گاڑی، جن محلات میں وہ مقیم ہیں وہ یا تو ان کی اولاد کی ملکیت ہے اور وہ قیمتی کاریں بھی ان کے رشتہ داروں کی ملکیت ہوتی ہیں اور مالی لحاظ سے بھی وہ مقروض ہیں۔ محلات میں مقیم اور قیمتی گاڑیوں کے جلو میں سفر کرنے والے ان رہنماؤں کو کیا معلوم کہ اس ملک کے کتنے گھروں میں بھوک اور مسلسل مفلسی کے ہاتھوں کتنے افراد خودکشی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

اس وقت سیاستدان جو تماشہ لگائے بیٹھے ہیں اور پوری قوم کو ساری دنیا کے سامنے ایک تماشہ بنایا ہوا ہے دراصل اس کی روح یہ ہے کہ سیاستدان جب اقتدار کی غلام گردشوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی سب سے بڑی خواہش ریاست کی تمام طاقت پر مکمل قبضہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق ملک کے تمام وسائل پر کنٹرول حاصل کرنا ہوتا ہے جہاں یہ کسی کو جوابدہ نہ ہوں۔ بھٹو صاحب نے 1967ء میں پیپلز پارٹی کے نام سے ایک باندی جماعت قائم کی اور 2002ء تک، 35 سال کے عرصے تک اس ملک میں طاقت کے تین ستون تھے۔ ایک پیپلز پارٹی، دوسری مسلم لیگ اور تیسری قوت اس ملک کی افواج! جب طاقت کے دو حصے ایک طرف ہو جاتے تھے تو اس ملک کی باگ ڈور وہ سنبھال لیتے تھے اور اس طرح اقتدار کی میوزیکل چیئر 35 سال تک اس ملک کی قسمت سے اپنے مفادات کے خوفناک کھیل میں مصروف رہی۔

لیکن اب اگست 2002ء میں اس طاقت کے تگڈم میں آزاد میڈیا کو بھی باریابی ملی۔ پہلی دفعہ پاکستانی عوام نے اس میڈیا کو اپنے مسیحا سمجھتے ہوئے اس کا بھرپور ساتھ دینا شروع کر دیا اور اقتدار کی تگڈم کو جو ابدہی کا احساس ہونے لگا اور اس طرح طاقت کے مراکز کی تعداد چار ہو گئی۔ پھر 2007ء میں آزاد عدلیہ کی حیرت انگیز تحریک شروع ہو جاتی ہے جو عوام اور میڈیا کے تعاون سے کامیابی حاصل کر کے پاکستانی اقتدار کی اس،، چوکر،، کو اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے تمام غیر قانونی کاموں کا جواب طلب کرتی ہے تو گویا اس ملک کے طاقت کے مراکز کی تعداد اب بڑھ کر پانچ ہو کر ایک پنجہ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پچھلے پچاس برس سے اقتدار کی تگڈم نے ہمیشہ عدلیہ کو اپنا ماتحت سمجھا اور اپنی مرضی کے مطابق اس کو استعمال بھی کیا اور عدلیہ بھی طوہاً کرہاً اسی میں اپنی عافیت سمجھ کر ان کے ہر غلط اقدام کی توثیق کرتی رہی۔

لیکن 2007ء میں بے بس، مجبور و مقہور عوام کی قربانیوں کے ساتھ اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ موجودہ حکومت کو جب اپنے اقتدار کا سنگھاسن ڈولتا ہوا نظر آیا تو طاقت کے
دوسرے مراکز نے موجودہ حکومت کو آزاد عدلیہ کی بحالی پر مجبور کر دیا اور اب طاقت کے اس سرچشمے یعنی عدلیہ نے اپنی اس آئینی ذمہ داری کا مطالبہ کر دیا جو ملک کے آئین میں اس کا حق ہے تو اقتدار میں بیٹھے فرعونوں نے اس کا بہت برا منایا۔ آزاد عدلیہ آخر کیا کہہ رہی ہے۔ آرٹیکل 177 یا آرٹیکل 6 کا فی الحال ذکر نہ بھی کریں لیکن آزاد عدلیہ ان اقتدار کے نشے میں بدمست افراد سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں سے اخلاقیات کا جو سبق آپ بھولے بیٹھے ہیں اس پر اب عمل کرنا ناگزیر ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے سرمایہ دار، سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرلیں لیکن ہماری موجودہ حکومت کو یہ بالکل گوارہ نہیں کہ ملک کو لوٹنے کا ایک اور نادر موقع ملا ہے اور طاقت کا یہ پنجہ نہ صرف ان کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے بلکہ وہ پہلی سے لوٹی ہوئی قومی دولت کو واپس لانے کا مطالبہ کر رہا ہے اس لئے موجودہ حکومت کو اب آنے والے انقلاب میں اپنی موت نظر آرہی ہے جس کی بناء پر آئے دن قوم کو مختلف بحرانوں میں مبتلا کر کے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگا کر پوری قوم کی توجہ اپنی بدعنوانی سے ہٹا کر خود کو مظلوم بنانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے لیکن اب قوم مزید دھوکہ کھانے کو تیار نہیں اور اب وہ آزاد عدلیہ کے ساتھ آزاد میڈیا کو اپنا مسیحا جانتے ہوئے ایک صاف اور شفاف نظام چاہتے ہیں جہاں ہر کسی کو انصاف ملے اور ظالموں کا بڑا عبرت ناک احتساب ہو۔ میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور اس دفعہ پاکستان میں یہ ہو کر رہے گا چاہے اس کیلئے ظالم بدعنوان کو انجام تک پہنچانے کیلئے کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے!

رہے نام میرے رب کا جس نے ظلم، فسق و فجور کے خاتمے کا حکم دیا ہے۔

بتوں کو آج سروں پر سجا کے نکلے لوگ
وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

بروز سوموار 4 ربیع الاوّل 1432ھ 7 فروری 2011ء

آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو

آج پھر کشمیریوں سے یکجہتی کا دن منایا جارہا ہے اور قارئین اسی موضوع پر کوئی تحریر پڑھنے کی امید رکھتے ہونگے لیکن تحریر، ہاں کیا ہر واقعہ تحریر کیا جاسکتا ہے؟ شاید، ہو سکتا ہے خود پر تھوڑا سا جبر کریں، خود کو جمع کریں تو آپ لکھ لیں گے لیکن کیا ہر بات لکھی جاسکتی ہے؟ خوشی کو تو لکھا جاسکتا ہے، غم کو دکھ تو تحریر ہو سکتا ہے لیکن درد، آنسوؤں کو کیسے لکھا جاسکتا ہے۔ کرب کو کیسے لکھیں، اضطراب کو، بے کلی کو، بے حسی کو، انا کو تحریر میں کیسے سموئیں۔

لفظ وہی ہوتے ہیں، قلم وہی ہوتا ہے، صفحات وہی ہوتے ہیں... سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ لیکن آپ بے دست و پا ہوتے ہیں۔ رحمت کو تو بیان کیا جاسکتا ہے، تحریر کیا جاسکتا ہے۔ نحوست کو کیسے پابند تحریر کیا جاسکتا ہے! اداسی کو تحریر کرسکتے ہیں آپ؟ کچھ نہیں کرسکتے ہم۔ فیض صاحب نے تو کہا ہے،، جو دل پہ گزرتی ہے سو گزرتی ہے، اسے بیان کیسے کریں! میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ نہیں مجھے یہ ہنر نہیں آتا۔ اور مجھے یہ سیکھنا بھی نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں ہے مجھے سب کچھ آتا ہو۔ نہیں، میں نہیں لکھ سکتا دل کو، اداسی کو، بے کلی کو، اضطراب کو... بالکل نہیں لکھ سکتا۔ آنسوؤں کو کیسے تحریر کروں؟ بتایئے آپ؟ اگر آپ تحریر کرسکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔ کالم کی تحسین میں کئی ایسی تحریریں ملتی ہیں کہ جن کے الفاظ چیخ چیخ کر آسمان کو بھی خوں کے آنسو رلا دیتے ہیں۔ ان بہت سی تحریروں میں صرف ایک تحریر کے چند حصے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

کئی ماہ پہلے ہفتہ وار "رہبر" میں آپ کا پہلا کالم شائع ہوا تو میری شدید خواہش تھی کہ آپ کے کالم تو کشمیر کے تمام اخبارات کی زینت بننے کے لائق ہیں کیونکہ آپ کے کالم کیلئے ہفتہ بھر انتظار کرنا دشوار محسوس ہوتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ہم سب کی دعائیں رب العزت نے قبول فرمائیں اور اب کشمیر کے بڑے اخبارات میں تقریباً روزانہ کوئی نہ کوئی کالم آپ کا پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

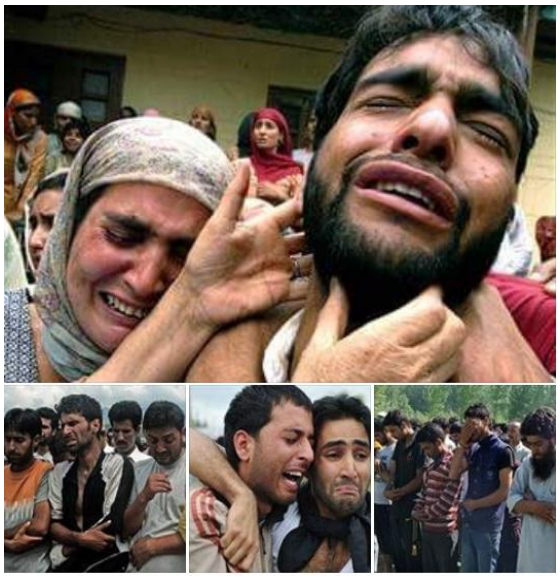

پرانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شاعر کی مقبولیت کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھا جاتا تھا کہ اس شہر کے مانگنے والے کتنے فقیر اور خوش گلو گانے والیاں اس کلام کو ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں لیکن اب اس دور میں سیاسی تجزیہ نگاروں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کیلئے کسی سروے کی ضرورت اس لئے باقی نہیں رہتی کہ کالج و یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء، وکلاء کے علاوہ شکارے کے ملاح بھی بڑی محبت سے آپ کے کالم کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پچھلی چھ دہائیوں سے صنم کے پنجروں سے اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ پہاڑوں میں رہنے والے عقاب اپنی پرواز سے ناآشنا ہوگئے ہیں لیکن جذبہ

حریت کی غیرت و حرمت کو جب ٹھیس پہنچتی ہے تو اقبال کے ان شاہینوں کو دوبارہ چٹانوں کی چوٹیوں میں اپنے آشیانے یاد آتے ہیں۔ آپ کے کالم پڑھ کر ان شاہینوں نے دوبارہ پھڑ پھڑانا شروع کر دیا ہے اور ان شاہینوں کو پھر سے اپنی کھوئی ہوئی منزل سامنے نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ آپ کے کالم میں مستور پیغام کی ہر کوئی تشریح اپنے انداز میں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات کلاس روم میں اس دلچسپ بحث میں اساتذہ کو بھی مجبوریوں کا دامن بھلا کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ آج کل انٹرنیٹ کی پابندیوں کے باوجود سچ کا وجود زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہتا۔

بعض اوقات پاکستان کے کچھ بھائیوں کے کے خیالات پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔ کیا اب تک اسی ہزار سے زائد جانوں کا نذرانہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ کشمیری اب بھی آپ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ہماری محبت کو تو یہ عالم ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی ہوئی تو سارے کشمیر میں اس کا سوگ منایا گیا اور سارے کشمیر میں ہڑتال ہوئی اور جب ضیاء الحق کو شہید کر دیا گیا تو کئی دن گھروں میں چولہا نہیں جلا (یہاں کسی فرد سے محبت کا اظہار مقصود نہیں بلکہ پاکستان سے ہر معاملے سے اپنی محبت کا اظہار مقصود ہوتا ہے) ۔جب بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم کا مقابلہ بھارت کی ٹیم سے ہوتا ہے تو پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی فتح کیلئے سب سے زیادہ دعائیں کشمیر میں ہی مانگی جاتی ہیں اور پاکستان کی فتح پر کشمیر کے ہر گھر سے پاکستانی جھنڈا اٹھائے ہوئے سب مائیں بہنیں اس کا جشن مناتی ہیں۔

ہمیں اپنے شہداء کے قبرستانوں پر بڑا فخر ہے اور ہر "نامعلوم شہید" کے کتبے پر "محمد بن قاسم "کا نام کندہ کر دیا جاتا ہے۔ ان شہداء میں اکثریت ان جانبازوں کی ہے جو اپنی بہنوں اور ماؤں کی عصمتوں کی حفاظت کیلئے قربان ہو گئے اور کشمیری مائیں اپنے بچوں کو ان کے نام کی لوریاں سناتی ہیں اور ہر اسلامی تہوار پر ان شہداء کے مزارات پر کشمیری مائیں اپنے خونِ دل سے چراغ روش کرتی ہیں اور اپنے آنسوؤں کے پھولوں سے ان مزارات کو منور کرتی ہیں کیونکہ یہ وہ شاہین تھے جو کوہستانی مردوں کو نیند سے بیدار کرنے آئے تھے اور ہم روزِ قیامت بھی ان کے احسانات کی گواہی دیں گے .....میں شائد کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی ہوں کیونکہ میں بھی اک ماں ہوں اور مجھے ان ماؤں کی کوکھ پر ناز ہے جہاں انہوں نے جنم لیا۔

آپ کے کئی کالم دلوں کو اس قدر چھو جاتے ہیں کہ ہفتوں ان کا درد اور کسک دل میں رہتا ہے۔ کچھ ماہ پہلے آپ نے اپنے کالم میں ڈاکٹر کشور کی پاکستان ہجرت کی جو داستان تحریر کی اس نے مجھے کئی دن بے حال رکھا لیکن میرے بھائی اب تو ایسی داستانیں آپ کو کشمیر کے گلی کوچوں میں عام ملیں گی اور شادی و بیاہ اور دوسری تقریبات میں ہم اپنے ان اعزازات کو شمار کر کے حساب لگاتے ہیں کہ اس دفعہ بازی کس کے ہاتھ رہی۔ میں بہت زیادہ لکھ گئی ہوں ویسے بھی بہنیں اپنے بھائیوں کو ہی دل کے زخم دکھاتی ہیں۔ اللہ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ اسی طرح کالم لکھتے رہیں اور ہمارے دلوں کی جوت جگاتے رہیں۔ آخر میں آپ ہی کا ایک جملہ "رہے نام میرے رب کا"

!..... آپ کی ایک دعا گو گمنام بہن

میری بہن! سونے میں تولنے کے لائق ہے آپ کی یہ تحریر اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس قوم اور نسل میں آپ جیسی مائیں ہوں ان کو غلام بنائے رکھنا اب کسی کے بس میں نہیں۔ روس کو بھی اپنی طاقت کا بہت گمان تھا لیکن جب آپ جیسی ماؤں سے واسطہ پڑا تو اب کئی حصوں میں بٹ گیا۔ اب امریکا اور اس کے تمام اتحادی بھی اپنی جان بچانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اس کمبل سے جان چھوٹ جائے

!پھر آپ کو غلام بنانے والی طاقت تو ان سامر جی قوتوں کے مقابلے میں انتہائی کمزور ہے وہ بھلا کس طرح آپ کے جذبۂ حریت کے سامنے ٹھہر سکتی ہے؟

اس پیغام کے موصول ہونے کے بعد مجھے انسانی حقوق کے چیمپئن بہت یاد آئے اور جبہ و دستار والے بھی۔ ہاں وہ بھی۔ کیا ہم سب حکمرانوں کا محاصرہ کر کے انہیں اپنی کشمیری مجبور و مقہور بہنوں کا یہ پیغام نہیں پہنچا سکتے؟ لیکن ہم اپنے راحت کدوں میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے، انسانی حقوق کے چیمپئن بھی اور جُبّہ و دستار والے بھی، ہاں میں بھی ! کیا سال میں ایک دفعہ یکجہتی کشمیر کا دن منانے سے کشمیریوں کے زخم مندمل ہو جائیں گے اور کیا اس سے کشمیر آزاد ہو جائے گا؟؟ ہم پہلے بھی سب کے سب زبانی جمع خرچ کرتے رہے بلکہ وہ جسے اس کا بالکل اختیار نہیں تھا کشمیر کی تقسیم کے کئی منصوبے اپنی طرف سے پیش کرتا رہا اور موجودہ حکومت نے تو سرے سے کشمیر کا نام لینا بھی ترک کر دیا ہے۔ ان کیلئے تو سب سے بڑا مسئلہ قوم کی لوٹی ہوئی دولت کو محفوظ کرنا ہے چاہے اس کیلئے ملک میں کو داؤ پر لگانا پڑ جائے۔

نجانے اس موقع پر مجھے وہ لڑکی "راچل کوری" کیوں یاد آئی ہے۔ جب فلسطینیوں کے گھر بلڈوز کرنے کے لیے اسرائیلی فوج آگے بڑھی تو اس امریکی لڑکی نے ان کا راستہ روکا تھا: "نہیں تم نہیں گرا سکتے ان کے گھر"... اور پھر ہوا کیا تھا، جانتے ہیں آپ؟ جی، اس لڑکی پر سے بلڈوزر گزار دیا گیا تھا۔ آپ کچھ نہ کر سکے۔ لیکن قربانی کہاں رائیگاں جاتی ہے۔ میری کشمیری بہن کے اس پیغام نے مجھے ایک امتحان میں مبتلا کر دیا ہے۔ نتیجہ تو بعد میں نکلے گا۔ کیا ؟ میں نہیں جانتا۔ بس میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا کیا اور ان کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟ ہاں دعا کروں میں... لیکن کس منہ سے دعا کروں؟ کیسے اپنے رب کا سامنا کروں؟

اک نئی کربلا میرے سامنے بپا ہوئی۔ بچے اور بچیاں تہہ تیغ کئے جا رہے ہیں۔ آپ کہاں ہیں اور کیا کہتے ہیں؟ معصوم بچوں اور بچیوں کی چیخیں مجھے جینے نہیں دیں گی۔ میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکا۔ ہاں مجھے زندگی پیاری ہے... ہاں میں سانس کی آمد و رفت کو زندگی سمجھتا ہوں... ہاں میں نے ذلت و رسوائی کی زندگی قبول کر لی ہے... ہاں میں موت سے بہت ڈرتا ہوں... ہاں میں نے اپنا رب بدل لیا ہے... ہاں میں عزت و ذلت کا مالک انہیں سمجھتا ہوں جن کے ہاتھ میں بے حس بندوقیں ہیں۔ شعلہ اگلتی ہوئی بندوقیں۔ میں انہیں زندگی اور موت کا مالک سمجھتا ہوں جن کے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سے دل دہل جاتا ہے۔ ہاں وہی ہیں میرے مالک... آپ کے متعلق کیسے کہہ سکتا ہوں! آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں نے کشمیر کے مقتل سے ایک مجبور و مقہور بہن کی صدا کا کچھ حصہ آپ کے گوش گزار کر دیا ہے۔

حق و باطل کا وہی معرکہ عہدِ قدیم
گرم دنیا میں بہ اندازِ جدید آج بھی ہے
فرق یہ ہے کہ کہ نہیں عزمِ حسینی ورنہ
کربلا آج بھی ہے، روحِ یزید آج بھی ہے

بروز ہفتہ 2 ربیع الاوّل 1432ھ 5 فروری 2011ء

خوابیدہ ضمیر

وطن عزیز میں پند و نصائح کی مجالس میں اگر موجودہ حالات کے تناظر میں آئینہ دکھانے کی جسارت محض اس خوش گمانی کی نیت سے بھی کی جائے کہ چہرہ کے بگاڑ کو ذرا بنا سنوار لیں تو ہر طرف سے اس آئینے کے ساتھ ساتھ آپ پر بھی پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بے شمار بودے دلائل کا سہارا لیکر نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور بالآخر تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ غیروں کے خورشید کا سہارا لیکر ہماری ظلمتوں کا مذاق مت اڑائیں۔ لیکن جو بات صحیح ہے اس کو غلط کیسے کہوں؟ گمراہوں کیلئے راستے کی کیا قید! جب اپنی گمراہی کو ہی سیدھا رستہ سمجھ لیا جائے تو سمجھانا بیکار۔ مجھے اپنی تمام تر خامیوں کا اعتراف ہے اور میں اس کا برملا اعتراف بھی کرتا رہتا ہوں لیکن کیا سچ اور حق بات کہنے اور لکھنے سے بھی منہ موڑ لوں؟ مجھے اپنے بارے میں ایسا کوئی عارضہ بھی لاحق نہیں کہ آپ میری تحریروں کو پڑھ کر میرے بارے میں یہ گمان کریں کہ مجھے کسی داد و تحسین کی خواہش ہے لیکن دل میں یہ آرزو ہر وقت تڑپائے رکھتی ہے کہ وطن عزیز کی قسمت بدل جائے۔

ان گنت تعداد میں ٹیلیفون، ای میلز اور خطوط کا تانتا اس بات کی ہمت دلاتا رہتا ہے کہ یہ مشن جاری و ساری رہنا بہت ضروری ہے۔ میں یہ تمام خطوط اور ای میلز پڑھنے کی بھی پوری کوشش کرتا ہوں اور کچھ کے جوابات بھی دیتا ہوں۔ لیکن کچھ مراسلے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود ان کا جواب دینے سے قاصر رہتا ہوں۔ لیکن شاید آپ کے پاس اس کا کوئی جواب ہو! دن اور رات عجیب و غریب واہموں میں کٹ رہے ہیں۔

"بہت سمجھایا آپ کو، بے شمار دلائل بھی سامنے رکھے لیکن آپ کسی کی سنتے اور مانتے کب ہیں! شاید ہماری آواز میں اتنا زور نہیں کہ جس میں آپ کی آواز دب کر رہ جائے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو ہماری صدا سننی پڑے، نہ ہمارے قلم کی وہ رفتار اور برق بازی جو آپ کے ارادوں کا منہ موڑ سکے اور آپ کے ضمیری طوفان کو روک سکے۔

جانتے ہیں کیوں روکنا چاہتا ہوں آپ کو؟ آپ کی آواز کو؟ آپ کے الفاظ کی آتش سے بچنے کیلئے۔ بارہا چاہا کہ آپ کی چیخوں سے بے بہرہ رہوں مگر کیسے؟ کچھ دنوں کیلئے آپ کے مضامین پڑھنے پر خود ساختہ پابندی لگائی لیکن اس ارادہ پر بھی قابو نہ رکھ سکا کہ بازگشت سے اب پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ہے۔

خود تو آپ مضطرب بھی ہیں، طوفان بھی، کرب کا میدان بھی اور باضمیر بھی، انہی امراض کا نتیجہ آپ کی تحریریں بھی ہیں مگر.....!!! آپ کیوں نہیں سمجھتے؟ بھینسوں کے آگے بین بجانے سے کیا حاصل؟ برسوں سے لکھنے کا مرض پال رکھا ہے آپ نے، بے شمار مضامین اور کتابیں بھی لکھ ڈالیں، لوگوں کو بے کل کیا اور خود بھی ہوئے، قلم کو دن میں چین آیا نہ رات کو..... مگر اونٹ نہ اِس کروٹ بیٹھا نہ اس کروٹ۔

میرا مشورہ اب تو مان لیں! چھوڑیئے، اب الفاظ کے زہر نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کچھ بھی کہیں، بے ضمیروں پر اثر نہیں ہوتا اور باضمیروں پر اثر .....ہاں یہ بھی کا کیا فائدہ! میرا یہ سچ آپ کو بھی کڑوا لگے گا ورنہ کوئی تو بدلا ہوتا۔ کیا کہا، بدلا ہے،، ! دن یا رات کا موسم یا نظام؟ انسانوں کو بدلئے ناں

سچ کہا! بھلا انسان ہیں کہاں؟ ورنہ خالد بن ولید سے لیکر محمد بن قاسم تک انسان ہی تو تھے۔ ہاں آدمیوں کی بھیڑ ضرور ہے کہ دم لینا یہاں محال ہو رہا ہے! بھیڑ بھی ہے اور مرے ہوئے ضمیروں کی لاشوں کا تعفن بھی! اب اسی تعفن سے مزید اموات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔

آدمیوں کی بھیڑ سے انسانوں کی تلاش؟ کیا خوب ہیں آپ! نمک کی کان سے مٹھاس کی تلاش کر رہے ہیں!!! ہاں آپ اور دوسرے اہل قلم جو بے چین روحوں کی مانند ہیں وہ بھی تو پورے انسان نہیں آدھے ضرور ہیں۔ پورا انسان تو عافیہ صدیقی کو کہتے ہیں جس نے قلم کی بجائے تلوار کو اپنے ہاتھوں کی زینت بنایا۔ ہاں وہی عافیہ صدیقی جس کیلئے آپ کے کئی مضامین نے ہم کو ہلکان کر دیا، خود بھی بے چین رہے اور ہم سب کو بھی رلاتے رہے، جانتے ہیں ناں آپ!

اس پتلی دھان پان کی لڑکی کو یہ پیغام بھیجنا مت بھولئے کہ اب محمد بن قاسم کا خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ عافیہ صدیقی کو یہ پیغام بھی ضرور دیں کہ جب قصر سفید کے گھمنڈی فرعون کی جیل سے تمہاری روح کو اپنے جسم سے رہائی ملے تو اس مُردوں کی زمین پر مت آنا، ہاں یہی پاکستان جو اب مردوں کی زمین ہے۔

کیا کریں گی یہاں آکر؟ وہ زندہ لاش ہی سہی، مگر یہ تو خود مُردوں کی بستی ہے.... ہم انہیں وہ ماہ و سال، زندگی کی وہ بہاریں، جو انہوں نے سسکتے بلکتے ہوئے تنہا گزار دیں، کہاں سے لا کر دیں گے؟ خدارا! آپ وہاں سے آزاد ہوتے ہی روح کو بھی آزاد کروالیجئے گا!!!

مجھے رنگینی صحن چمن سے خوف آتا ہے
یہی ایام تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

اب تک ہمارے ارباب اقتدار نے پاکستان کو کیا تحائف دیئے ہیں؟ کبھی جامعہ حفصہ کی مسخ شدہ لاشیں، کبھی وزیرستان اور باجوڑ کے بے گناہوں کی لاشیں، کبھی پاکستان کی ایک اجڑی ہوئی بیٹی کی داستان اور بربادی کا افسانہ، کبھی آمنہ مسعود کے تڑپتے شب و روز، چینی کے صرف ایک سودے میں چھ ارب پاکستانی روپے کی کرپشن، پٹرولیم کے سودوں میں اربوں روپے کی لوٹ کھسوٹ، رینٹل پاور کے نام پر اربوں روپے ہضم، کراچی ٹارگٹ کلنگ میں مارے جانے والے بے گناہ معصوم شہری، سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ جانے والے ڈھائی ہزار سے زائد شہداء اور 25 لاکھ سے زائد بے گھر ہونے والے پاکستانی، اور دورانِ سیلاب ہمارے صدر محترم زرداری کا تحفہ تو اور بھی نایاب تھا.... ان تمام آفات میں صدرِ پاکستان کا فرانس اور برطانیہ کا تفریحی دورہ جس کے تمام اخراجات ملک کے خزانے سے ادا کئے گئے تھے، ہمیں تو اس تاریخی تحفے کا کبھی علم نہ ہوتا مگر برطانیہ کے مشہور اخبار "ڈیلی میل آن لائن" نے پاکستانی صدر آصف زرداری کے ان تمام ساتھیوں کے جھوٹ پر پانی پھیر دیا جو زرداری کے برطانیہ کے دورے کو برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون سے پاکستان کے خلاف

حالیہ بیان پر باز پرس کرنا قرار دے رہے تھے۔ برطانوی اخبار ڈیلی میل نے پاکستانی صدر کے بارے میں جو لکھا وہ پاکستان کی 63 سالہ تاریخ میں کسی پاکستانی صدر یا کسی حکومتی اہلکار کے بارے میں آج تک کسی نے نہیں لکھا:

(Why Cameron should count his fingers after shaking hands with Pakistan‹s Mr Ten percent)

برطانوی اخبار ڈیوڈ کیمرون کو صدر زرداری (مسٹر ٹین پرسینٹ) کے ساتھ ہاتھ ملانے کے بعد انگلیاں گننے کا مشورہ دے رہے تھے۔

عدلیہ بحال تو ہوئی لیکن..... اس کے احکامات کا کھلا مذاق، عدلیہ بحالی کے بڑے بڑے کردار، اعتزاز احسن، کرد، جسٹس ریٹائرڈ طارق اور دیگر وکلاء لیڈر سب پارلیمان کو سپریم قرار دیتے ہوئے عدلیہ کی آزادی سے یکسر الگ تھلگ، کہ اب پارلیمنٹ کے ارکان اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی تقرری کریں گے ،جی ہاں! وہ پارلیمان جس کے کئی ارکان جعلی ڈگریوں کے ساتھ ملک و قوم کو لوٹ رہے ہیں، پاکستانی افواج کو پرائی جنگ میں مصروف کر دیا گیا ہے اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ قصر سفید کا فرعون اپنے اس اہلکار کی رہائی کا مطالبہ کر رہا ہے جس نے کھلے عام ہمارے شہریوں کو بھرے بازار میں گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ بتائیں ناں کیسا لگا، کیسا لگا یہ تحفہ ؟

ضمیر بحال نہ سہی، تاحال آپ کا قلم تو بحال ہے، اسی کے کرتب دکھائیں، شاید عوام اسی سے بہل جائیں اور چپ چاپ مہنگائی، ناانصافی اور عریانی و فحاشی کے سیلاب میں ڈوب جائیں..... بے فکر رہیں بڑا اجر و ثواب ملے گا اس کا.....!!!،،

فقط آپ کا خوابیدہ ضمیر

آنکھ کھلی تو پسینے سے شرابور کانپتا جسم دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا کہ یہ خواب تھا۔

گردش دہر ہی کیا کم تھی جلانے کو

تو بھی آپہنچا ہے دہکتے ہوئے رخسار کے ساتھ

بہت سادہ ہو تم! میں کہاں سے باضمیر ہو گیا ہوں، کہاں کی بے چینی اور بے کلی، کون سا کرب! میں تو ایلیٹ کلاس سے ہوں، مزے اڑا رہا ہوں، دنیا کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ کبھی ایک لمحے کیلئے بھی ایسے کسی کرب سے نہیں گزرا جس سے تم ہر روز وطن عزیز پاکستان میں گزرتے ہو۔ ہاں! یہ تم نے صحیح کہا، الفاظ کی بازی گری آتی ہے مجھے اور میں مداری کی طرح قلم سے ہر روز کرتب دکھاتا ہوں۔ اور ہاں! مجھ میں تو خود آگ نہیں تو پھر میرے الفاظ میں کہاں سے آگئی یہ آگ!

بہر حال آئینہ دکھانے پر تم بڑے خوش نظر آرہے ہو، میں بھی تمہارا بڑا مشکور ہوں،، بہادر ہمیشہ باوقار موت کا سامنا کرتے ہیں،، اور میں کہاں سے باوقار ہو گیا۔ ہاں! میں نے کہیں یہ ضرور پڑھا تھا کہ: جوگی کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتے، وہ صرف خواہشات دریافت کرتے ہیں، کسی کو محل بنانے کی خواہش ہو تو منع نہیں کرتے۔ اپنے اگلے پھیرے میں بھی صرف خواہش جاننا چاہتے ہیں، کسی بھی خواہش کا اظہار کیا جائے تو کامیابی اور خوش

رہنے کی دعائیں دیکر اپنا راستہ لیتے ہیں، لیکن اگر کوئی ان کا دامن تھام کر خود ہی چیخ چیخ کر کہے کہ میری ساری خواہشیں تو پوری ہوگئیں مگر میں اب بھی بے چین ہوں، پہلے سے کہیں زیادہ مضطرب!..... تو اسے سکون کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

"میں کہاں جاؤں؟ میں کیا کروں؟ کائنات لامحدود ہے۔ میں یہاں لمحے بھر کو چمکنے کے بعد بجھنے والا ہوں، اب میں کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن..... اس طرف سے زمین کھود کر ادھر نکل جاؤں، اس طرف سے کھود کر واپس اس طرف نکل آؤں..... اپنی موجودہ حالت سے نجات ممکن نہیں! اس لئے براہ کرم میرے سہانے خوابوں کو تو برباد مت کرو"

یہ آنکھ کا بادل تو برستا ہی نہیں ہے
اور عمر کے دریا میں روانی ہے بہت کم
وہ دن جو گزرنے تھے، گزر ہی گئے آخر
اب مہلت گریہ ہے نہ ہے فرصتِ ماتم

بروز بدھ 6 ربیع الاول 1432ھ 9 فروری 2011ء

اک ذرا صبر

اگر اس قوم کی تاریخ میں 18 مئی 1980ء نہ آتا تو شاید یہ پورے مشرق بعید کی ایک پسماندہ قوم ہی کہلاتی قوم جس کے بارے میں ہمارے خوش فہم تبصرہ و نگار اکثر یہ جملہ دہراتے ہیں کہ ہمارا پہلا پانچ سالہ منصوبہ وہ یہاں سے لے کر گئے اور پھر اسے نقل کر کے اپنا ترقیاتی پلان بنایا اور آج دیکھو یہ ملک کتنا ترقی کر چکا ہے۔ اس ملک کی تاریخ ہم سے مختلف نہیں سیاسی بے یقینی ایسی کہ 1979ء سے اب تک 25 وزیر اعظم دیکھ چکا ہے۔ یعنی ایک وزیر اعظم کا اوسط عرصہ اقتدار گیارہ ماہ بنتا ہے آئین کا حلیہ بگاڑنے میں بھی ان کی تاریخ ہم سے مختلف نہیں۔

انہوں نے 1948ء میں آئین بنایا اور پھر فوجی اقتدار کو تحفظ دینے کے لئے 1952، 1954، 1962، 1981 اور 1987ء میں ہر دفعہ ایسی ترامیم کیں کہ ہر بار آئین کا حلیہ ہی بدل گیا۔ یہ ملک جس میں صرف 17 فیصد رقبہ قابل کاشت ہے اور قدرتی وسائل تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن صرف ایک دن کی بدولت اور اس دن سے جاگی ہوئی اس قوم کی حالت یہ ہے کہ وہاں صرف 3 فیصد لوگ بے روزگار ہیں، صرف چار فیصد غربت کی لیکر سے نیچے ہیں، 99 فیصد پڑھے لکھے ہیں اور آج وہ دنیا بھر کے 189 بلین ڈالر کی مصنوعات درآمد کرتا ہے۔ اس کی معیشت پر دفاعی اخراجات بھی اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہر سال 13 بلین ڈالر اپنے دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کے کسی حاکم کو یہ کہنے کی نوبت نہیں آتی کہ ہم اس لئے ترقی نہیں کر رہے کہ ہم پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ ہے۔ ان پر 120 بلین ڈالر قرض ہے لیکن آج دنیا بھر میں ان کی کمپنیاں ملٹی نیشنل کمپنیوں کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اپنے سستے مال کی وجہ سے دنیا بھر کی مارکیٹوں پر چھائی ہوئی ہے۔ ایسا سب کچھ کیسے اور کس طرح ممکن ہو گیا۔ یہ ملک طویل ترین فوجی اقتدار کی زد میں بھی رہا۔ جس زمانے میں پاکستان کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ انہوں نے نقل کیا اس دور میں وہ ہمارے وطن عزیز سے کئی درجے زیادہ پسماندہ ترین تھا۔ بلکہ اس کا شمار دنیا کے پسماندہ ترین ملکوں میں ہوتا تھا۔ نہ کوئی قیادت میسر تھی جس کی سمت لوگ آرزو اور امید بھری نظروں سے دیکھ سکیں اور کوئی ایسا نہ تھا کہ جو ان کے اندر ہر نام اور میولہ صوبوں کی کشمکش کو ختم کروا سکے۔ لوگ ایک دوسرے پر استحصال کے الزام دھرتے اور اس لڑائی کا فائدہ صرف ان کو ہوتا جو بندوق کے زور پر اقتدار پر قابض رہنا چاہتے تھے اور اس اقتدار کو طول دینے میں امریکہ ان کا ممد و معاون ہوتا کہ کہیں عوام برسر اقتدار آ گئے تو امریکہ کا بستر اس پورے علاقے سے گول نہ ہو جائے۔

لیکن 7 مئی 1980ء کو اس ملک کے سات لاکھ کی آبادی والے شہر کوانجو میں فوجی اقتدار، غلبے اور آمریت کے خلاف ایک جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس جدوجہد کو اس قصبے کے لوگوں نے جمہوریت اور انسانی حقوق کی جدوجہد کا نام دیا۔ 18 سے 21 مئی تک شہر کے لوگوں نے جلوس نکالے، ہڑتالیں کیں، شہر کا شہر سڑکوں پر نکل آیا۔ انہوں نے احتجاج اس حد تک آگے بڑھایا کہ پورے کوریا کے شہری ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ کوریا کے ڈکٹیٹر پارک چنگ ہی کو اس کے انٹیلی جنس چیف نے قتل کر دیا لیکن جیسے ہی اس خوشی میں ملک بھر کے لوگ طلبہ کی سرکردگی میں جمہوریت کی بحالی کے لئے سڑکوں پر نکلے تو جنرل چن و دہان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ سارے کے سارے شہر خوف کی وجہ سے خاموش ہو گئے لیکن کوانجو کے شہریوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

پہلے ہی دن کئی لوگوں کے سر ڈنڈوں سے توڑ دیئے گئے۔ لوگ پھر جمع ہوتے تو سپاہیوں کا جتھہ ایک ایک کو علیحدہ کر کے عبرتناک انجام تک پہنچاتا۔ یہ آپریشن ختم ہونے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ لاشیں ٹماٹو ساس میں بھیگی پڑی ہیں۔ سب کو اٹھا کر ٹرک میں ڈالا گیا اور ڈالتے ہوئے بھی سپاہی انہیں ٹھڈے مارتے رہے۔ راتوں رات کالجوں اور یونیورسٹیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ طلبہ کو سر عام ننگا کیا گیا، سنگینوں سے زخمی کیا گیا اور بونٹ مارے گئے۔ ایک رپورٹر کے مطابق سامنے کھڑے ایک بچے نے اپنے باپ سے سوال کیا کہ کمانڈو اتنا ظلم کر رہے ہیں، ہماری فوج کیوں نہیں آتی۔ ساتھ کھڑے ایک دوسرے بچے نے کہا میرے ابو کہتے ہیں فوج پر کمیونٹس چھا گئے ہیں۔ یہ کمانڈو اتنے آگے بڑھ گئے کہ جس پولیس اسٹیشن کے انچارج نے انہیں ایسا کرنے سے روکا اسے سنگینیں مار کر مار دیا لیکن اگلے دن لوگ پھر سڑکوں پر تھے۔ جو زخمی کسی بس یا ویگن پر سوار ہو کر علاج کے لئے جا رہا ہوتا اس ویگن ڈرائیور کا حشر کر دیا جاتا۔ بہت سے پولیس والے چھٹی لے کر چلے گئے۔ پولیس کے انچارج نے گولی چلانے سے انکار کر دیا اور پھر 20 مئی کو ان لوگوں نے اپنا اخبار جاری کر دیا۔ روز لوگ مرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے ٹیکس کی بلڈنگ کو آگ لگا دی کہ اس پیسے سے ان پر چلانے کے لئے گولیاں خریدی جاتی ہیں اور پھر اس جدوجہد کے بعد لوگوں نے شہر کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کوئی لیڈر نہ تھا لوگ خود سارا انتظام چلانے لگے، نہ چوری نہ قتل، نہ ڈاکا اور نہ ہی بجلی اور پانی کا نظام خراب، انہوں نے 27 مئی تک ایک مثالی حکومت قائم کر کے دکھا دی اور پھر ان پر پورے ملک کی فوج نے ظالمانہ طریقے سے ایکشن کر کے قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ چند دن لوگوں کو یہ اعتماد دے گئے کہ وہ کسی پولیس کے بغیر امن قائم کر سکتے ہیں، کسی سرکاری محکمے کے بغیر تمام سروسز بحال کر سکتے ہیں اور کسی لیڈر کے بغیر سات لاکھ کے ایک شہر کو امن کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی مثال صرف فرانسیسی کیمون میں 1871ء میں ملتی ہے جس کے بعد وہاں لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ملک کی بقا نہ سپاہ کے پاس ہوتی ہے اور نہ بیوروکریسی اور پولیس کے پاس۔ ملک تو عوام کا ہوتا ہے اور وہی اسے بہتر اور خوبصورت طریقے سے چلا سکتے ہیں۔

مئی 1980ء میں ملنے والا یہ اعتماد تھا جس نے 1987ء میں کوریا کو ایک ایسی جدوجہد کا منہ دکھایا کہ جس کے بعد نہ وہاں فوج آئی اور نہ ہی آئین میں ترمیم۔ بس لوگوں نے صرف یہ دیکھا کہ غربت و افلاس میں ڈوبا کوریا جب ایسی حکومت کے سائے میں پروان چڑھنے لگتا ہے تو خواہ فوج پر اخراجات کا بوجھ ہو، غیر ملکی قرضہ بے تحاشا ہو، اس قوم کو دنیا میں سر اٹھانے کے قابل بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ صرف چند مہینوں کی تحریکیں اور چند سو یا ہزار لوگوں کی قربانی وقتی طور پر مایوسی کی لہر تو لے کر آئی ہے۔ لیکن اس کی کوکھ میں جو اعتماد ہوتا ہے وہ ایک دن قوموں کی تقدیر بدلتا ہے۔ پاکستانی قوم بے شمار امتحانات کے مراحل سے گزر کر اعتماد تو حاصل کر چکی لیکن اب اس تجربے کی نقل کب کرے گی؟ ایک ذرا صبر کہ صیاد کے دن تھوڑے ہیں۔

بروز جمعرات 7 ربیع الاول 1432ھ 10 فروری 2011ء

اپنے سائے سے بھی خوفزدہ

ہاں بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے انسان... بہت کوشش، بہت تگ ودو... کس لیے؟ اس لیے کہ وہ سکون سے رہے، آرام سے رہے، محفوظ رہے۔ ناموری کا خواہش مند ہوتا ہے وہ... واہ، واہ سننا چاہتا ہے داد و تحسین کا طالب اور چہار دانگ عالم میں تشہیر... بس یہی ہے۔

سکون سے رہنا چاہتا ہے اور بے سکون ہوتا رہتا ہے۔ آرام فوم کے گدوں پر سونے سے ملتا نہیں ہے، لاکھ توپ و تفنگ پاس ہو، اپنوں سے بھی ڈرتا رہتا ہے۔ سائے سے بھی ڈر جانے والا۔ ناموری کے شوق میں ایسی ایسی بے ہودہ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں اُس سے کہ بس۔ چہار جانب بچہ جمہورے واہ، واہ کرتے رہتے ہیں اور خلقِ خدا تھو تھو۔ داد و تحسین کیلئے نت نئے ڈرامے اور اداکاری... لیکن ذلت لکھ دی جاتی ہے۔ میں غلط کہہ گیا ہوں، اپنی ذلت و رسوائی کا سامان ساتھ لیے پھرتا ہے وہ، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا گھوڑا اسے اپنے سموں تلے روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔

سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی۔ اپنی انا کے بت پوجنے والا کب کسی کو خاطر میں لاتا ہے! بس ذرا سا اختلاف کیجیے تو چڑھ دوڑتا ہے اپنے لشکر کو لے کر، یہ جانتے بوجھتے بھی کہ لشکروں کو پرندوں کا جھنڈ کنکریاں مار کر کھائے ہوئے بھس میں بدل دیتا ہے۔ عبرت سرائے ہے یہ۔ لیکن نہیں مانتا وہ۔ وہ ناز کرتا ہے اپنے لشکر پر۔ اور دنیائے فانی میں کوئی سدا نہیں جیتا۔ اپنے سینے پر سجے تمغے دیکھ کر نہال ہو جانے والے بھی تنہا اور لاچار ہو جاتے ہیں اس لیے کہ زندگی پر موت کا پہرا ہے اور موت کسی سے خائف نہیں ہوتی۔
ہاں وہ کسی چار دیواری، کسی پناہ گاہ، کسی قلعے، کسی نسب، کسی منصب و جلال، کسی لشکر کو نہیں مانتی، دبوچ لیتی ہے... اور پھر ایسا کہ سامان سو برس کا ہوتا ہے، جو دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جسم کے پنجرے کو توڑ کر موت اچک لیتی ہے اس کی روح۔

موت تو خیر آتی ہے، موت سے پہلے بھی کبھی موت آجاتی ہے۔ وہ موت اور بھی بے حس ہوتی ہے۔ ہاں اُس وقت جب زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دینے لگتی ہے۔ بے کلی، بے چینی، اضطراب، وحشت، تنہائی... کیا یہ سزا کم ہوتی ہے! سب کو تہہ تیغ کر کے آگے بڑھ جانے والا سوچتا رہ جاتا ہے لیکن پھر وقت ہاتھ نہیں آتا۔

اقتدار کی خاطر انہیں بھی برداشت کرنا پڑ گیا جنہیں کرپٹ کہتا تھا، نہیں آنے کی دھمکیاں دیتا تھا... اس لیے کہ اپنے رب کا غلام نہیں ہوتا وہ۔ وہ تو طاقتِ عارضی کا ادنیٰ غلام ہوتا ہے، اور جب ارضی خدا اسے کہہ دیں پھر کیا مجال کہ انکار کر دیا جائے! ہاں پھر سب تذلیل برداشت کرنا پڑتی ہے جناب۔

انکار کی لذت اُسے محسوس ہوتی ہے جو ربِ کعبہ کا غلام ہو۔ ہاں وہ خائف نہیں ہوتا جسے رب کا قرب نصیب ہو جائے۔ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ رب کے بندے تو غلامی کا آغاز ہی انکار سے کرتے ہیں۔ "لا" سے کرتے ہیں، نہیں مانتے وہ ارضی خدائوں کی... وہ ہوتے ہیں اپنے رب کے بندے۔ نفس کی بندگی سے انکاری، جعلی دنیاوی خداؤں کے منکر، بس اک نعرۂ مستانہ "لا" ہر کسی کے مقدر میں کہاں؟

لباسِ فاخرہ بھی اتارنا پڑ گیا تھا جناب۔ چھیالیس برس تو کیا ہزار سال بھی پہن لیا جائے، زیبِ تن کر لیا جائے، آخر اتارنا پڑتا ہے۔ ہاں اُس وقت آواز بھرا جاتی ہے اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ لیکن اَنا پرستی کا کیا علاج۔ جانتے بوجھتے کہے چلا جاتا تھا، اُس نے دو جنگیں لڑی ہیں، ڈیرہ بگٹی اور کوہلو جیسے خطرناک مقامات پر فرائض انجام دیئے ہیں۔ کون سی جنگیں جناب، کون سے خطرناک مقامات!!!

اپنوں کو خاک و خون میں نہلا دیا... یہ ہے بہادری! رہنے دیجئے، سب جانتے ہیں اس فاسق کو۔ تاریخ کو کون مسخ کر سکا ہے جناب، کوئی نہیں۔ کارگل میں کیا ہوا، یہ دوہرانے کی ضرورت ہے کیا، 1971ء میں کیا ہوا، کتنا بتائیں۔
جبری اقتدار پر قبضہ کرنے سے لیکر رخصت ہونے تک کی تاریخ... شرم آتی ہے۔ کون سی چیز سلامت چھوڑی اس نے؟ سب کچھ تو برباد کر دیا جناب، لیکن اصرار تھا کہ ہم نے بچا لیا پاکستان۔ کیا اس کے دورِ حکومت میں عدلیہ آزاد ہو گئی، صحافت آزاد ہو گئی، ہزاروں گمشدہ لوگ مل گئے، گولی چلائے بغیر سارے مسائل حل ہو گئے، عوام نہال ہو گئے؟؟؟ کیا تیر مار لیا اس کمانڈو نے! سب کچھ ملیامیٹ ہی تو کر دیا اس نے۔ تباہ کر دیا، برباد کر دیا۔ قوم کو ایمرجنسی کے عذاب میں مبتلا کر کے دو مرتبہ آئین معطل کر دیا گیا، یہ تھا ان کا دورِ زریں، کیا قوم یہ سب کچھ بھول سکتی ہے؟؟ ہرگز نہیں۔

عبرت سرائے خانہ ہے یہ۔ اب توق لیگ جناب کا تذکرہ بھی نہیں کرتی، اُس کے پوسٹروں پر سے تو آپ غائب ہو ہی گئے تھے مگر اب تو وہ سبھی افراد شرمندہ ہیں جو آپ کے دست و بازو بنے رہے۔ ان کی دلیل یہ کہ اب آپ کے ساتھ نتھی ہو کر وہ اپنی مقبولیت کھو دیں گے۔ بلکہ آپ کی موجودگی میں آپ کے چہیتے شوکت عزیز کو ٹکٹ نہیں دیا گیا اور وہ دہائی دیتا ہوا ملک چھوڑ کر بھاگ گیا اور اب آپ بھی اپنے آقاؤں کے در پر اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ایک ہی آقا کی چھت کے نیچے پناہ گزیں لیکن ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے محروم! اپنے اقتدار کو دوام دینے کیلئے اپنے دوستوں کو ہر جگہ لوٹ مار کی اجازت دی۔ بالآخر جنابِ شیخ رشید طعنہ دینے سے باز نہ رہ سکے" جس بندے کا انتخابی حلقہ ہی نہ ہو اس کا یہی حال ہوتا ہے" حالانکہ خود بھی اسی در کے فقیر رہے۔ کیا شیخ رشید اپنا کھویا ہوا عوامی اعتماد بحال کر سکے؟

اب ایسا ہی وقت موجودہ حکمرانوں پر بھی آن پڑا ہے۔ سفاک امریکی قاتل ریمنڈ کی رہائی کیلئے قصرِ سفید خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا ہے۔ گویا اب پاک امریکا تعلقات آزمائش کے اس موڑ پر ہیں کہ اقرار یا انکار دونوں ہی اقتدار کے سنگھاسن کو ڈبو سکتے ہیں اسی لئے کل جماعتی کانفرنس طلب کر کے امریکا کے تیور سے بچنے کی دہائی دی جا رہی ہے۔ کبھی سفارتی استثناء کا بہانہ تراشا جا رہا ہے اور کہیں ملک کی نازک اقتصادی حالات کی مزید بربادی کا خوف دلا کر اس بدمست ہاتھی کو راستہ دینے کی سازش ہو رہی ہے۔ کیا تاریخ سے ایک دفعہ پھر چشم پوشی کرنے کا ارادہ ہے؟ قصرِ سفید کا تو ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے کہ اس نے اپنے دوستوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں عبرتناک انجام تک پہنچایا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ شہنشاہ ایران رضا پہلوی 'فلپائن کا مارکوس اور اسی پاک دھرتی پر دونوں مکے لہرا کر قوم کو خوفزدہ کرنے والا فاسق کمانڈو اتنی جلدی نظروں سے اوجھل ہو گئے کیا؟

یہ ہے دنیا جناب! سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ انسان کر ہی کیا سکتا ہے جناب! جو اپنے رب پر بھروسہ کریں انہیں ملتا ہے سکون، انکار کی جرأت اور خوف سے نجات۔ بندہ بشر ہے ہی کیا اپنے سائے سے بھی خوفزدہ۔

جی جناب! وقت کا گھوڑا انہیں اپنے سموں تلے روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر نعرہ بلند ہوتا ہے "دیکھو جو مجھے دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔
کچھ نہیں رہے گا جناب، کچھ بھی نہیں... بس نام رہے گا میرے رب کا، جس نے وقت کی قسم کھا کر کہا کہ بیشک انسان خسارے میں ہے۔

کہاں سکندر، کہاں ہے دارا، جام کہاں ہے، جم کا
جن کی تیغ سے دیو بھی کانپیں، دل دہلے رستم کا
ان کی راکھ ملے نہ ڈھونڈے، دنیا کا گھر ہے غم کا
ہاشم، جان غنیمت جانو، نہیں بھروسہ دم کا

بروز اتوار 10 ربیع الاول 1432ھ 13 فروری 2011ء

عید میلاد النبی

امت مسلمہ اس وقت جس صورتحال سے دوچار ہے اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نگاہ آگاہ ہے کہ عزت ،وقار اور سربلندی گویا کہ ہم سے چھین لی گئی ہے اور بعض اوقات یہ لکھتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے جو "مغضوب علیھم" قوموں کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچا گیا ہے، مختلف اعتبار سے وہی نقشہ آج ہمیں اپنے اوپر منطبق ہوتا نظر آرہا ہے، افتراق ہے، باہمی خانہ جنگیاں ہیں، اختلافات ہیں۔ وحدتِ امت جو مطلوب ہے، اس کا تو شیرازہ بکھر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کا حل کیا ہے؟ اس کیلئے ہم کس سے رجوع کریں؟ اس کا جواب اگر ایک لفظ میں جاننا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ خلوص اور اخلاق کا رشتہ اور وفاداری کا تعلق از سرِ نو اللہ سے، اس کی کتاب سے، اس کے رسول اکرم ﷺ سے استوار کیا جائے اور صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ایک حدیث کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
"دین تو بس خیر خواہی، خلوص، اخلاص اور وفاداری کا نام ہے،،۔ پوچھا گیا کہ،، حضور ﷺ کس کی وفاداری، کس سے خلوص واخلاص؟،، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا،، اللہ سے، اس کی کتاب سے، اس کے رسول سے اور مسلمانوں کے رہنماؤں اور قائدین سے، اور عامتہ المسلمین سے"۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص واخلاص کا جہاں تک تعلق ہے، تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، وہ ایک لفظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ التزام توحید اور شرک کی ہر نوعیت سے اجتناب اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری ہے، اگرچہ یہ کام آسان نہیں، بقول حکیم الامت علامہ اقبال:

براہمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

جہاں تک قرآن مجید اور حضور اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص واخلاص کا معاملہ ہے تو یہ درحقیقت دو چیزیں نہیں ہیں، جیسے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمائش کی گئی کہ ہمیں حضور اکرم ﷺ کی سیرت واخلاق کے بارے میں بتائیں تو آپ نے سوال کیا،، کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟" اور جواب اثبات میں آیا تو آپ نے فرمایا کہ "کان خلق القران " حضور اکرم ﷺ کی سیرت اور اخلاق قرآن ہی تو ہے"۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلقات کی بنیادیں چار ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت 157 کا پس منظر بڑا عجیب ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے اور اپنی قوم کیلئے بارگاہِ خداوندی میں رحمت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا:

"میری ایک رحمت عام ہے جو تمام مخلوقات کیلئے کھلی ہوئی ہے اور جو میری رحمتِ خصوصی ہے تو اسے میں نے مخصوص کر دیا ہے ان لوگوں کیلئے جو میرے نبی امی سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں گے۔ وہ تعلق کیا ہے؟ اس کو مذکورہ آیت کے آخری حصے میں بیان کر دیا گیا ہے: (پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی امّی کی پیروی اختیار کریں..... لہٰذا جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے، ان کی تعظیم کریں گے، ان کی نصرت

وحمائت کریں گے اوراس روشنی کی پیروی اختیار کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کی گئی ہے وہی فلاح پانے والے ہیں(اصل معنی میں کامیاب اور میری رحمتِ خصوصی انہی لوگوں کے حصے میں آئے گی)"۔

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔سب سے پہلی بنیاد ہے تصدیق وایمان، یہ تصدیق کرنا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا اپنی طرف سے نہیں فرمایا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمَایَنطِقُ عَنِ الْھَوَیٰ إِنْ ھُوَ إِلَّاوَحْیٌ یُوحَیٰ عَلَّمَہُ شَدِیدُ الْقُوَیٰ

"اور ہمارا نبی اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے، اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے"۔(سورۃ النجم 3۔5)

اب اس ضمن میں یہ جاننا چاہئے کہ اس ایمان اور تصدیق کے دو درجے ہیں، ایک زبانی اقرار جس سے انسان اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے، وہ قانونی ضرورت پوری ہو جاتی ہے

جو امتِ محمدی میں شامل ہونے کیلئے لازمی اور ضروری ہے لیکن اصلی ایمان دل سے تصدیق کا ہے جبکہ آنحضرت رسول اکرم ﷺ کی رسالت ونبوت پر دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ ہے ایمانِ مطلوب، اس کے بغیر جو دوسرے حقوق ہیں نبی اکرم ﷺ کے وہ ہم ادا نہیں کر سکتے، پھر زبانی کلامی تعلق رہے گا جیسا کہ اللہ معاف فرمائے ہماری ایک عظیم اکثریت کا ہے۔دوسرا تعلق ہے تعظیم ومحبت، یہ لازمی تقاضہ ہے یقینِ قلبی کا۔اگر یہ یقین ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کی عظمت کا نقش قلب پر قائم ہو جائے گا، آپ کی محبت دل میں جاگزیں ہو گی۔جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا،، تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اس کے اپنے بیٹے سے ،اس کے اپنے باپ سے اور تمام انسانوں سے،،۔یعنی اگر مومن کے دل میں آنحضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزاء اقرباء اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں ہوئی ہے تو وہ حقیقتاً مؤمن ہے۔اس حدیث میں بیٹے اور باپ کا ذکر نے تمام عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلوں اور قوموں کا احاطہ کر لیا ہے۔ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے، ایسا نہیں کہ بات واضح نہیں بلکہ صاف صاف اور دوٹوک انداز میں ارشاد ہوا ہے کہ حقیقی ایمان کا لازمی تقاضہ ہے کہ حضور ﷺ ایک بندۂ مومن کو دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب ترین ہو جائیں اور ان کی حرمت پر جان بھی چلی جائے تو اس کو سعادت سمجھیں۔

تعظیم ظاہری بھی مطلوب ہے اور قلبی بھی، اس طرح محبت کا زبانی اظہار بھی ہو اور دل میں بھی محبت جاگزیں ہو اور اس کا سب سے بڑا مظہر ہے حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنا جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی دعا کل کی کل صرف حضور ﷺ پر درود بھیجنے پر مشتمل کر دے تو اس کا مقام اور مرتبہ کہیں زیادہ ہو گا اس سے، کہ وہ خود اپنے لئے کوئی سوالات کرتا رہے۔

تیسرا تعلق حضور ﷺ کے ساتھ ہمارا حضور ﷺ کی نصرت و حمائت ہے جو لازمی نتیجہ ہے ان پہلی دو بنیادوں کا، وہ ہے حضور اکرم ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانا تو اب آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی چہ معنی دارد۔ آپ ﷺ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہو گا۔ اس میں تو البتہ انسان تحقیق کا حق رکھتا ہے کہ واقعتاً محمد رسول اللہ نے یہ حکم دیا ہے یا نہیں، لیکن جب طے ہو جائے کہ یہ آپ ﷺ کا فرمان ہے تو اب چوں چراں کا کوئی سوال نہیں، اب تو اطاعت کرنی ہو گی اور اطاعت بھی کیسی؟ وہ اطاعت جس کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا:
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا
"پس نہیں تیرے رب کی قسم! یہ لوگ ہر گز مؤمن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ آپ ﷺ کے فیصلے کے آگے پوری دلی آمادگی اور خوشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم نہ کر دیں (سورۃ نساء۔ 65)

یہی بات آنحضور ﷺ نے فرمائی: "تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس ہدائت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لیکر آیا ہوں"۔ جب اطاعت کے ساتھ محبت کی شیرینی شامل ہو جائے تو اس طرزِ عمل کا نام ہے اتباع۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت تو ان احکام کی ہو گی جو حضور ﷺ نے دیئے ہوں لیکن اتباع ان تمام اعمال و افعال کا ہو گا جن کا صدور و ظہور ہوا نبی اکرم ﷺ سے، چاہے اس کو کرنے کا حکم آپ ﷺ نے بالفعل نہ دیا ہو۔ اس اتباع کا جو قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ بھی سن لیجئے۔ آل عمران آیت 132 میں فرمایا: وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے"۔

اس آیت کریمہ سے اتباع رسول ﷺ کی یہ اہمیت سامنے آتی ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو جناب ﷺ کا اتباع لازم ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ اللہ ہم سے محبت فرمائے گا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اس کی مغفرت کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے زیادہ ایک بندۂ مومن کی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کا محبوب اور اس کی مغفرت کا سزاوار بن جائے۔

چوتھااورآخری اوریوں کہئے کہ یہ عروج ہے حضورﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا،وہ ہے تائیدونصرت۔ حضورﷺ ایک مشن لیکر تشریف لائے تھے۔ صحابہ کرام نے دورانِ خلافتِ راشدہ اس عمل کو جہاں تک پہنچایا تھاہم اپنی بے عملیوں کے طفیل وہ اثرات بھی ختم کر چکے ہیں۔اب تواز سرِ نو پیغام محمدیﷺ کی نشرواشاعت کرنی ہے۔پیغام محمدیﷺ کو پہنچانا ہے تمام اقوام وملوک تک،اوراز سرِ نو اللہ کے دین کو فی الواقع قائم ونافذ کرنا ہے کرّہ ارضی پر اوراس کیلئے پہلے اللہ جہاں بھی توفیق دے، جس خطہ ارضی کی قسمت جاگے، عہدِ حاضر میں انقلابِ محمدیﷺ کا تواس ملک کی خوش بختی اور خوش نصیبی پر تو واقعتاً رشک کرناچاہئے۔ یہ ہے وہ فریضہ منصبی جو امت کے حوالے کیا گیاہے۔ آنحضورﷺ کا مشن زندہ وتابندہ ہے۔ حضورﷺ گویا کہ اب بھی پکار رہے ہیں:"کون ہے اللہ کی راہ میں میرا مددگار،یعنی کون ہے جو میرے پیغام کی نشرواشاعت کا کام کرے،میرے دین کا علمبردار بن کر کھڑا ہو اور پورے کرۂ ارض پر اس کا جھنڈا سربلند کرنے کیلئے تن من دھن لگانے کیلئے آمادہ ہو جائے"۔

اس ضمن میں آخری بات یہ ہے اس آیہ مبارکہ میں، کہ اس عمل کا ذریعہ کیاہے۔ محمد رسول اللہﷺ نے جو انقلاب برپا کیاتو آلۂ انقلاب تھا قرآن حکیم۔ پس معلوم ہوا آپﷺ کی دعوت کا مرکز ومحور قرآنِ حکیم تھا۔ آپﷺ نے قرآن کریم کے ذریعے لوگوں کے اذہان وقلوب بدل کر رکھ دیئے۔اسی قرآن حکیم کی بدولت لوگوں کی سوچ میں انقلاب برپا کر دیا۔اسی قرآن الفرقان کی آیاتِ بینات سے اذہان کی تطہیر فرمائی،یہی قرآنی آیات وبینات لوگوں کے تزکیہ نفس کا ذریعہ بن گئیں،اسی قرآن کریم کے نور سے خارج وباطن منور ہوگئے۔وہ کتاب آج بھی اسی حالت میں اس امت کے پاس محفوظ ہے بس اس کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرناہو گا۔ یہ آنحضوخاتم النبین رﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی آخری اوراہم ترین بنیاد ہے۔اس وراثتِ محمدیﷺ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم ہے اوراسی کو حبل اللہ قرار دیا گیاہے۔یہی کتاب اللہ،امت کے اندراز سرِ نو اتحاد ویکجہتی پیدا کرے گی،اسی سے وحدتِ فکر پیدا ہو گی،اسی سے وحدتِ عمل کی توفیق ملے گی،اسی سے ہماری جدوجہد یکجہتی کے ساتھ اپنے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھے گی۔اس کتاب کے حقوق کو پہچاننا ہمارے حقیقی اور قلبی ایمان کیلئے ضروری ہے،یہی درحقیقت میلادالنبیﷺ کا اصل پیغام ہے۔یہی اصل لمحہ فکریہ ہے،اس کتاب کو مانیں جس طرح ماننے کا حق ہے،اسے پڑھیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے،اس کو سمجھیں جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے،اس پر عمل کریں جیسا کہ اس پر عمل کرنے کا حق ہے اور پھر اس کے داعی، مبلغ اور معلم بن جائیں جیسے کہ اس تبلیغ، دعوت، تعلیم اور تبین کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان جملہ امور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم نبی اکرمﷺ کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کیلئے راست سمت میں پیش قدمی کر سکیں ثم آمین۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

بروز منگل 12 ربیع الاوّل 1432ھ 15 فروری 2011ء

معتبر اندھیرا کیوں؟

پورا رستہ جب اس کی ڈیڑھ سالہ بچی موٹر سائیکل کی ٹینکی پر بیٹھی اپنی ماں اور پانچ سالہ بھائی کے ساتھ سفر کر رہی تھی تو اس کے باپ نے نجانے کتنی مضبوطی سے اس کو تھاما ہو گا ۔ موٹر سائیکل کی رفتار کو بھی انتہائی آہستہ رکھا ہو گا، کہیں اونچی نیچی جگہوں پر پاؤں زمین پر رکھ کر گزارا ہو گا کہ کہیں جھٹکے سے ننھی صوفیہ گر نہ جائے۔ اس کے دونوں بازو غیر ارادی طور پر تھامے ہوئے ہونگے لیکن وہ انہی بازوؤں میں اس خون آلود بچی کو تھامے بھاگ رہا تھا۔ اس کی گردن پتنگ کی کٹی ہوئی ڈور پھرنے سے کٹ چکی تھی۔ خون آلود بچی اس کے کپڑے بھگو رہی تھی اور پھر انہی مضبوط بازوؤں میں صوفیہ کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور بے جان جسم کے ساتھ اس کے رونے چیخنے کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔

میں سرخ لباس میں ملبوس صوفیہ کی وہ مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ رہا ہوں جس میں اس نے سرخ گوٹے والا لباس چند دن پہلے اپنے باپ سے ضد کر کے عید پر پہننے کیلئے بنوایا تھا اور اس بدنصیب باپ نے فیکٹری میں اوور ٹائم کر کے اس کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ مجھے میرے ایک قاری نے یہ تصویر بھیجی ہے۔ یہ تصویر شائد کہیں بچوں کے صفحے پر ہنستے مسکراتے بچوں کے درمیان سجنے کے قابل تھی، مگر کیا ہے اسے دیکھ کر تو آنسو نہیں رکتے۔ دل بند ہونا شروع ہو جاتا ہے، تصویر پر نظریں نہیں جمائی جا سکتیں لیکن یہ ہنستی مسکراتی ہوئی تصویر کی حامل ننھی معصوم ہر دیکھنے والوں کو بے اختیار اشکبار کر رہی ہے اور وہ بدنصیب باپ کبھی اپنے ان خون آلود ہاتھوں کو دیکھتا ہے اور کبھی مجبوری کی حالت میں آسمان کی طرف دیکھ کر نجانے اپنے رب سے کن الفاظ میں محوِ کلام ہے اور ماں اپنی اکلوتی بچی کی لاش کے سرہانے کھڑی گم سم ہے اور اڑوس پڑوس کی عورتوں کی رونے کی آوازیں آسمان تک تو پہنچ رہی ہیں لیکن اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے مست حکمرانوں کو اس کی بالکل خبر نہیں۔

یہ ایک اور عجیب بدنصیب گھرانہ ہے۔ پورا شہر ہنسی میں غرق ہے، رقص ہے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا، گیت ہیں کہ چاروں جانب گونج رہے ہیں۔ بجلی آئے یا نہ آئے، جنریٹر اس ماحول کو خراب نہیں ہونے دیتے، لیکن اس گھرانے کی قسمت میں یہ نازونعم کہاں؟ وہ تو صبح سے بجلی کی آنکھ مچولی میں گرفتار ہیں۔ رات کا اندھیرا ہے، محنت مزدوری کر کے رزق کمانے والا منظور تھکا ہارا دیہاڑی لگا کر گھر پہنچا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تھوڑا سا کھانا ہے جو اس نے بسنت منانے والے گھر کے باہر فقیروں کی لائن میں کھڑے ہو کر حاصل کیا ہے ۔ وہ سارا دن کا بھوکا ہے لیکن اس نے بھیک میں ملے کھانے کی امانت میں محض اس لئے خیانت نہیں کی کہ اگر اس نے یہ کھانا کھالیا تو بچے گھر میں پھر بھوکے سو جائیں گے۔ منظور کی بیوی بچوں کو بہلا پھسلا کر سلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اندھیرے کے خوف بھی عجیب ہوتے ہیں، نیند آ کر نہیں دیتی۔ اس نے اپنے چاروں بچوں کو کمرے میں بڑی مشکل سے سلایا اور روشنی کیلئے بستر کے قریب موم بتی جلادی کہ بچے اندھیرے سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی مالکن سے دو عدد موم بتیاں حاصل کی تھیں اور ان موم بتیوں کیلئے اسے کڑوی کسیلی باتیں بھی تو سننے کو ملیں تھیں، اور پھر یہ ہنستا بستا گھر قبرستان میں تبدیل ہو گیا۔

آگ نے اکبر، اصغر، انور اور مقدس کی جان لے لی۔ ماں حواس کھو بیٹھی، بس بچوں کی لاشوں کے پاس بیٹھی لوگوں کو رونے سے منع کر رہی ہے کہ شور مت کرو، بچے سو رہے ہیں ۔ پتا نہیں کیوں اسے رونے کا شور تو محسوس ہوتا ہے لیکن چاروں جانب چھتوں چوباروں، دالانوں اور کوٹھوں پر اس بے خبر مخلوق کا شور سنائی نہیں دیتا جو اس کے دکھ سے بے پرواہ محوِ رقص ہے کہ ان کے نزدیک کبھی کبھی تو خوشی کے مواقع آتے ہیں۔ جنہیں اندازہ ہی

نہیں کہ ان کی پتنگ بازی سے شہر میں 4100 مرتبہ ٹرپنگ ہوئی اور بجلی منقطع ہوئی لیکن شائد بد نصیبی نے منظور کاہی گھر دیکھا ہوا تھا۔ لاشوں کے سرہانے بیٹھی سکتے میں آئی ہوئی ماں کی وہ تصویر بھی عجب ہے، کتنے سالوں پر پھیلی اس خوں رنگ بسنت کی تاریخ دہرا دیتی ہے۔

پتا نہیں کیوں ان ساری ہنستی مسکراتی، رقص کرتی تصویروں میں، اپنی دھن میں مگن زندگی کی مسرتیں لوٹتے لوگوں کے چہروں پر مجھے ایک تمسخر نظر آتا ہے۔ اس موت کا تمسخر جو ہم سب کی طرف بڑھ رہی ہے، جو اس سال کے اس دن تین سالہ صوفیہ پر آئی جس کی گردن پتنگ کی ڈور سے کٹ گئی، نو سالہ آصف منیر پر آئی جو دھاتی تار لگنے سے بس مرغِ بسمل کی طرح پھڑ پھڑایا اور اگلے لمحے اپنے خالق کے ہاں پہنچ گیا، دس سالہ جاوید پر آئی جو چھت سے گرا، اور پھر اسے اٹھانے کیلئے گھر والے پہنچے تو کسی کے پکارنے، بلانے، چیخنے اور فریاد کرنے کا جواب تک نہ دے سکا۔ موت ان کے پاس بھی جا پہنچی جو اپنی دھن میں مگن آسمانوں پر پتنگوں کے پیچ دیکھ رہے تھے، کٹی پتنگ کے پیچھے بھاگ رہے تھے کہ گاڑی کے پہیوں پر ان کے خون کے دھبے دور تک نشانات بناتے گئے۔

جس شہر میں رات بھر چھتیں بقعہ نور بنی رہیں، قہقہے گونجتے رہیں، رقص ہوتے رہیں، خوشبودار کھانوں کی لپٹیں پھیلتی رہیں، اسی شہر کی گلیوں، محلوں اور گھروں سے 21 جنازے بر آمد ہوئے اور چھ سو کے قریب لوگوں کو ان کے دوست اور عزیز و اقارب اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر ہسپتالوں میں مارے مارے پھرتے رہے اور اپنے ان عزیزوں کی صحت کیلئے اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے رہے۔ ہم کس بے حس معاشرے میں سانس لیتے ہیں، کس بے روح کلچر کے نمائندے ہیں کہ جب میں نے ان بسنت منانے والوں سے ان المیوں کا ذکر کیا تو مسکرا کر ٹالتے ہوئے بس یہی بولے،، لوگ تو ہر روز حادثوں میں بھی مر رہے ہیں، لوگوں کو خوشی منانے دو، ایک ہی تو موقع ملتا ہے،، اور پھر جب ایک ٹیلی ویژن چینل نے مزاحیہ پروگرام میں ایک بسنت کے رسیا سے سوال کیا گیا کہ بسنت سے لوگ مرتے ہیں تو اس نے بلا توقف جواب دیا کہ اس سے کہیں زیادہ تو مسجدوں میں بھی تو لوگ مرتے ہیں، کیا مسجدوں کو بند کر دیا جائے۔

لیکن میرا دکھ عجیب ہے، میرا درد انوکھا ہے کہ ان کے مرنے پر لوگوں کی آنکھ نم ضرور ہوتی ہے، لوگ افسوس ضرور کرتے ہیں، ماتم ضرور بپا ہوتے ہیں لیکن یہ کیا بے حس لوگ ہیں کہ جنہیں اپنے تعیش میں، اپنے رقص و سرور میں نہ چار سالہ بچی کی کٹی ہوئی گردن دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی اس ماں کی دلخراش چیخیں۔ انہیں تو کٹی پتنگ، رقص کرتی محفل اور چمکتی روشنیوں میں یہ قیامت نظر ہی نہیں آتی، لیکن ایسے معاشروں میں جب لوگ یہ تصور کر لیں کہ ان کی بے حسی پر لوگ احتجاج نہیں کرتے اور وہ ان کی بے بسی کا تمسخر اڑاتے جائیں تو پھر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ایک سرد آتش فشاں کے دھانے پر لوگ پھول اگا کر، گھر بنا کر خوش ہو رہے ہوتے ہیں لیکن ایک دن بس ایک کھولتا پگھلتا، چنگھاڑتا لاوا ابلتا ان کو چاروں طرف سے

گھیر لیتا ہے، اور کسی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا، نہ رقص، نہ پتنگ، نہ سرور، بس وہ آگ سے شدید اور بدترین جلا دینے والا الاؤ بالآخر ان کو ڈھانپ لیتا ہے اور پھر اہل نظر کیلئے ان کی راکھ ماسوائے عبرت کے اور کچھ بھی تو نہیں ہوتی!

سوال یہ نہیں کیوں نور کی ہے بے قدری
سوال یہ ہے کہ ہے معتبر اندھیرا کیوں

بروز ہفتہ 16 ربیع الاول 1432ھ 19 فروری 2011ء

زندگی موت کی امانت ہے

ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بس میں کا چکر۔ دھوکا ہی دھوکا اور خود فریبی۔ دربارِ عالیہ میں مسندِ نشین خوشامد پسند حکمران اور چاپلوس مشیرانِ کرام... راگ رنگ کی محفلیں، نائو نوش کا دور اور عوام کا درد و غم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں! ہو ہی نہیں سکتے۔ نہیں جناب آپ نے بجا ارشاد فرمایا... آپ ہی تو صحیح فرماتے ہیں... آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں آپ کے ارشاداتِ عالیہ۔ دُرنایاب ہیں آپ، نجات دہندہ اور زمین پر خدا کا سایا۔ رحمتِ باری تعالیٰ اور اوتارِ زمانہ ہیں آپ سرکار آپ جئیں ہزاروں سال سدا جئیں کا نعرہ۔ اور خود فریبی میں رچا بسا فریب خوردہ انسان۔ اتنی آوازوں میں کون اپنے آپ میں رہتا ہے۔ جامے سے باہر ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن کون جیا ہے سدا! کوئی بھی نہیں۔ سب کو چلے جانا ہے۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ نہیں بچا کوئی۔ کوئی بھی تو نہیں بچا۔ لیکن کون سمجھائے جب قلب سیاہ ہو کر پتھر بن جائے چاہے دھڑکتا ہی ہو، اس سے کیا ہوتا ہے! ہاں پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔ فریب ہی فریب اور دھوکا ہی دھوکا۔ زمین پر پائوں ٹکنے ہی نہیں دیتا یہ دھوکا۔

چاہے کچھ کر لیں... ہاں کچھ بھی، نہیں بچ سکا کوئی بھی موت کے منہ سے۔ بے حس و سفاک موت، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ ہاں وہ کسی کی بھی دھمکی نہیں سنتی، کسی کے نام و نسب، منصب و جاگیر سے اجنبی موت۔ لیکن پھر بھی جیئے جیئے سدا جیئے کا خمار۔ ایسا نشہ جو سارے نشے کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کر دے۔ آہ نہیں بچا کوئی۔

آگ و خون کی بارش کرنے والے بھی اور مظلوم، معصوم اور مقہور بھی۔ نہیں کوئی نہیں بچا۔ لیکن پھر سب ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ تب خیال آتا ضرور ہے لیکن ساعت و لمحات بیت چکے ہوتے ہیں، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے، پھر پل کی خبر نہیں ہوتی حالانکہ سامان سو برس کا دھرا ہوتا ہے۔

وہ مجھے اکثر کہتا ہے کو الٹی لائف ہونی چاہیے۔ ہاں وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر چیز وافر اور وقت نپا تلا۔ لیکن کیا یہ ہے کو الٹی لائف! اچھی نوکری کے لیے بہترین تعلیم حاصل کرنا۔ پھر پیسے جمع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا۔ پھر ایک خوب صورت لڑکی سے شادی۔ ایک آسائشوں بھرا گھر اور اس کے لان میں بچھی ہوئی آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے گپ شپ۔

بس یہ ہے آج کی کو الٹی لائف۔ کیا یہی ہے زندگی! میرا ایک دیہاتی دوست بہت ہنستا اور کہتا تھا: کچھ لوگوں کی زندگی پتا ہے کیسی ہوتی ہے؟ میں کہتا نہیں پتا۔ تو کہنے لگتا: ان کی زندگی ہوتی ہے" نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی"۔ کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں... بس میں، میں اور میں کا چکر۔

زندگی موت کی امانت ہے۔ ان کا یہ جملہ ہر وقت میری سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ میں اکثر ان سے ملتا تھا۔ بس ہر وقت ایک ہی بات تھی ان کی، پیٹ کی نہ ماننا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ دنیا بھر کی نعمتیں اس پیٹ میں ڈال لے، اگر ایک وقت کا فاقہ آ گیا تو ہٹ دھرمی سے کہنے لگتا ہے میں نے تو آج تک کچھ کھایا ہی نہیں۔ پیٹ بھی ایک جہنم ہے۔ کیا تشبیہ ہے یہ۔ زندگی موت کی امانت ہے، مت بھولنا۔

ہم اگر بھول بھی جائیں تب بھی کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔ خود کو فریب دیں گے۔ موت تو ہمیں نہیں بھولتی۔ زندگی کے ساتھ ہم سفر موت، کبھی نہیں مہلت دیتی۔ آ کر رہتی ہے۔

بس ایک فرق ہے۔ کس نے کس طرح موت کا استقبال کیا۔ بس یہ ہے اصل۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا تھا: دیکھ، سامان اول تو ہونا ہی نہیں چاہیے اور اگر ہو بھی تو بس مختصر۔ دیکھ، موت کی گاڑی زندگی کے ساتھ ہی روانہ ہوتی ہے، تجھے کسی اسٹیشن پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کوئی وقت ہی نہیں جو تجھے معلوم ہو۔ لیکن آتی بروقت ہے۔ اس لیے بس چھوٹی سی گٹھڑی سے زیادہ جمع نہ کرنا، موت کی ٹرین آئے تو بس ہنس کھیل کر سوار ہو جانا۔ ہونا تو ہے، تو پھر ہنس کھیل کر کیوں نہیں۔ اور پھر ان کا نعرۂ مستانہ گونجتا" کوئی بھی نہیں بچے گا، آ آ مجھے تو تیار پائے گی"۔ انسان اور بندۂ عاجز لیکن طاقت کے زعم میں لتھڑا ہوا۔ فریب خوردہ سمجھ ہی نہیں پاتا، بس اتنی طاقت کے نشے میں چُور چلاتا رہتا ہے: یہاں سے ماریں گے، وہاں ماریں گے، کوئی نہیں بچے گا، نہیں چھوڑیں گے، بس ماریں گے ہم، ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر آگ و خون کی بارش برستی ہے اور موت کا ہرکارہ پروانۂ اجل تقسیم کرنے لگتے ہے، اور پھر سب رخصت ہو جاتے ہیں، سب نے ہونا ہے رخصت۔

مجھے یاد آیا، اُس کی گردن تن سے جدا کرنے لگے تو پکارنے لگا: رب کعبہ کی قسم، میں تو کامیاب ہو گیا۔ ہاں یہ بھی ایک موت ہے، بارود کی بارش میں معصومیت کا قتل عام۔ کوئی بھی نہیں بچے گا جناب۔ زندگی موت کی امانت ہے اور مہلتِ عمل بہت تھوڑی۔ دنیا دھوکا ہے، سراسر دھوکا۔ کسی کی رہی نہ رہے گی، اپنے اپنے حصے کی آگ اور اپنے اپنے حصے کے پھول لے کر سب چلے جائیں گے۔

بس دیکھ کہیں تُو اپنے لیے آگ ہی آگ تو جمع نہیں کر رہا۔ اس کی ماں نے اس ریگستان کی ٹھنڈ سے بیتاب ہو کر اس سے کہا تھا: جا آگ لا۔ بہت دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹا اور ماں کے حضور دست بدستہ عرض گزاری: ماں کہیں سے آگ نہیں ملی "تب ماں نے تلخ ہو کر پکارا" جا کر جہنم سے ہی لے آتا۔" تو پھر اپنا سر خم کیا اور عرض کی" ماں وہاں بھی گیا تھا، میں نے وہاں کے نگراں سے کہا مجھے کچھ آگ درکار ہے، تب اس نے مجھے کہا جا اپنا رستہ لے، ہر انسان اپنی آگ دنیا سے خود لے کر یہاں آتا ہے" ۔

اب ایک بار پھر حکومت اور عدلیہ آمنے سامنے آگئے ہیں، عدلیہ نے چیئرمین نیب کا تقرر اس لئے کالعدم قرار دیدیا کہ خود آئین کے بالادستی کا نعرہ بلند کرنے والوں نے آئین کے مطابق اپنے وزیر اعظم اور حزب اختلاف کے سربراہ سے کوئی مشاورت نہیں کی لیکن حکومت کے وکیل حفیظ پیرزادہ ایک نئی موشگافی کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ ہر کام کیلئے اپوزیشن کے لیڈر سے مشورہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو آپ آئے روز کیوں آئین کی بالادستی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے عدالتِ عالیہ کی مدد کے طلبگار رہتے ہیں؟ سنا ہے کہ گیلانی نے دوبارہ تقرر کی سمری صدر کو بھجوادی ہے اور دوسری طرف سندھ میں حکومتی پارٹی نے عدالت کے فیصلے کے خلاف مکمل ہڑتال کا اعلان کر دیا ہے اور عدالت کو یہ پیغام دینا مقصود ہے کہ مرضی ہمارے چلے گی۔ سپریم کورٹ "بینکنگ کورٹ بنانے کا حکم دیتی ہے کہ قومی دولت لوٹنے والوں کے خلاف فوجداری مقدمات درج کروائے جائیں اور سرکلر 29 کا غلط استعمال کر کے قرضے معاف کرنے والے بینکوں کے خلاف بھی کاروائی کی جائے اور ملک کی لوٹی ہوئی دولت کو دوبارہ قومی خزانے میں جمع کروایا جائے کہ یہ قوم کی امانت ہے لیکن حکومت نے یہ ٹھان رکھا ہے کہ اپنے پیٹی بند بھائیوں پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

جناب اب بھی وقت ہے، نہ جانے مہلتِ عمل کب ختم ہو جائے۔ زندگی کی ہمسفر ہے موت۔ نہ جانے کہاں اچک لے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

کبیر سریر سرائے ہے، موت سووت تُو دن رین

بروز سوموار 2 ربیع الثانی 1432ھ 7 مارچ 2011ء

"گاڑی بلٹ پروف اور دل شرم پروف"

قرون وسطیٰ میں بصرے کا ایک چور عباس بن الخیاطہ بہت نامور ہوا، اس کی وارداتوں نے بصرہ اور اس کے اطراف میں ایک عرصے تک اہل ثروت کے ہوش اُڑائے رکھے پولیس نے لاکھ جتن کئے مگر عباس کسی طور بھی ہاتھ نہ لگا ایک روز اپنی ہی معمول سی غفلت کے نتیجے میں گرفتار ہوا تو اسے بصرے کی جیل میں یوں زیر حراست رکھا گیا کہ چوبیس گھنٹے سوا من وزنی بیڑیوں میں جکڑا رہتا عباس کی گرفتاری کے بعد کچھ عرصے تک تو بصرے میں امن رہا مگر ایک روز نواحی شہر ایلہ میں ایک بہت بڑی واردات ہو گئی جس میں شہر کے ایک نامی گرامی تاجر کے گھر سے لاکھوں کے جواہرات چرا لئے گئے، متاثرہ تاجر کا گھر کسی طور بھی ایک قلعے سے کم نہ تھا جہاں واردات کا تصور ہی محال تھا نتیجہ یہ کہ گویا بصرے کی پوری چیمبر آف کامرس دہل گئی متاثرہ تاجر نے بصرے میں تمام تاجروں کے ساتھ ایک میٹنگ کی اور اگلے روز اعلان کر دیا کہ اس کے گھر ہونے والی واردات کے پیچھے حاکم بصرہ کا ہاتھ ہے۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر کوئی عام چور اتنی بڑی واردات کر سکے یہ حربہ کامیاب رہا حاکم شہر نے کوتوال شہر اور اس کے ماتحتوں کا جینا حرام کر دیا اور حکم دیا جس طرح بھی ممکن ہو چور کو گرفتار کیا جائے اور مال برآمد کیا جائے۔ پولیس سر توڑ کوشش کے باوجود کیس حل کرنے میں ناکام رہی اور کوتوال نے حاکم کے سامنے ناکامی کا اظہار کیا تو وہ بھڑک گیا اور اعلان کیا کہ اگر کوتوال مال مسروقہ کی برآمدگی میں مزید ایک ماہ ناکام رہا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا اپنی جان کو یوں خطرے میں پا کر سیدھا جیل گیا اور وہاں صبح و شام عباس بن الخیاطہ کی خدمت شروع کر دی چوتھے ہفتے عباس نے اس سے پوچھا "خدمت تو بہت ہو گئی اب مقصد بتائو؟" اس نے سارا ماجرا بیان کر کے کہا "میری جان خطرے میں ہے اس کیس کو حل کرنے میں میری مدد کیجئے اور صرف اتنا بتا دیجئے کہ اتنی بڑی واردات کرنے کی اہلیت رکھنے والے چور اس علاقے میں کون کون ہیں؟" عباس مسکرایا اور بولا:

"غیرت مند لوگ دوستوں کی مخبریاں نہیں کیا کرتے" یہ کہہ کر اس نے اپنا دامن اُٹھایا اور مسروقہ جواہرات نکال کر یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ "تیری خدمت کے سبب تیرا حق مجھ پر واجب ہو چکا اور غیرت مند لوگ کسی کا حق اپنی جانب نہیں چھوڑتے یہ جواہرات لے، بصرے سے فرار ہو جا اور ساری زندگی عیش کر" کوتوال جیل سے نکلا اور سیدھا حاکم کے پاس جا پہنچا جواہرات پیش کر کے برآمدگی کا تمام احوال بھی بیان کر دیا۔

حاکم نے مال اس کے مالک کے حوالے کیا اور اگلے روز عباس کو جیل سے اپنے ہاں طلب کیا اپنے گھر پر اس کی بیڑیاں کھلوائیں اسے غسل کروایا اعلیٰ درجے کا لباس زیب تن کروایا اور پورا دن مختلف انواع کے ماکولات و مشروبات سے تواضع کی رات ہوئی تو اپنے ہی عالیشان بیڈ روم میں اسے سلا دیا اگلا دن طلوع ہوا تو پاس بلایا اور کہا "میں جانتا ہوں کہ اگر ایک لاکھ کوڑے بھی تمہیں لگوا دوں تب بھی تمہاری زبان نہیں کھلوا سکتا مگر میں نے کل سے تمہیں اپنا ذاتی مہمان بنا رکھا ہے ہر لحاظ سے تمہاری مہمان داری کی ہے اور اکرام میں کوئی کمی نہیں چھوڑی میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری سزا معاف کر دوں گا اور جیل سے بھی خود کو رہا سمجھو بس ازراہ مہربانی صرف اتنا بتا دو کہ جیل میں رہتے ہوئے یہ واردات کیسے کی؟"

عباس مسکرایا اور کہا "یہ معاملہ ذرا گھمبیر ہے اس کے لئے باقاعدہ "ڈیل" کرنی ہو گی جس میں میرے ساتھیوں کو بھی تحفظ حاصل ہو" حاکم مان گیا اور یوں بصرے کے چور اور حاکم کے مابین آج کی زبان کے مطابق ایک "قومی مفاہمتی آرڈی نینس" کے خدوخال طے ہونے شروع ہوئے "ڈیل" کے مطابق عباس نے یہ شرط منوائی کہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے تمام اگلے پچھلے جرائم معاف ہوں گے اور اس سے گزشتہ چوریوں کا مال اور حساب کتاب نہیں لیا جائے گا جبکہ حاکم نے یہ شرط منوائی کہ وہ اور اس کے ساتھی توبہ کریں گے اور گارنٹی دیں گے کہ آئندہ چوری کی کوئی بھی واردات نہیں کریں گے عباس اور حاکم نے ایک دوسرے کی شرائط مان لیں "ڈیل" کی پاسداری کے وعدے بھی کر لئے اور حلف بھی اُٹھا لئے چنانچہ "مفاہمتی آرڈی نینس" کا اجرا ہوتے ہی عباس نے اپنی آخری چوری کا پورا ماجرا بیان کر دیا کہ کس طرح جیلر کو ایک ہزار اشرفیاں بطور رشوت دے کر وہ جیل سے رات ہوتے ہی نکلا اور کس طرح اس قلعے کا حفاظتی نظام درہم برہم کر کے اسی رات جواہرات چرا کر حسب وعدہ سورج نکلنے سے قبل جیل واپس آ گیا، حاکم بصرہ نے عباس کو رہائش مہیا کر دی اور اس کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تا کہ اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی رہیں جبکہ عباس اور اس کا گروہ بھی "ڈیل" کی تاحیات پاسداری کرتا رہا اور یوں اہل بصرہ کو ہمیشہ کے لئے چوری کی وارداتوں سے نجات مل گئی۔

پرانے وقتوں کے وہ انسان چونکہ ترقی یافتہ نہ تھے بلکہ پورے ہی "دقیانوسی" تھے اس لئے ان کے چور بھی معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق "وضعدار" تھے وہ غیرت کی بات بھی کیا کرتے تھے اور وعدوں کی پاسداری میں بھی اپنی پوری زندگی بتا دیا کرتے تھے۔ ہم آج کے انسان ہیں نہایت ترقی یافتہ اس لئے پرانے وقتوں کی وہ "خرافات" ہم میں نہیں پائی جاتیں البتہ ایک مسئلے میں ہم بھی اہل بصرہ کے ہم پلہ ہیں ہمارے ہاں بھی اہل بصرہ کی طرح چوری کی ایسی وارداتیں ہوتی ہیں جنہیں ثابت کرنا محال ہو جاتا ہے۔ میرا اشارہ ان بیوقوفوں کی جانب ہرگز نہیں جو دڑے سے دو ہزار کی ٹی ٹی منگواتے ہیں اور اس کے زور پر کسی امیر کے گھر سے لاکھوں یا بڑا تیر مارا تو کسی بینک سے کروڑ ڈیڑھ کروڑ لوٹ لیتے ہیں اور مہارت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگلے ہی دن پولیس افسر سینہ تان کے اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ "ہم ملزمان کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں" اور پھر ایک روز تو پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں یا گرفتار ہو کر سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔

میرا اشارہ ان کی جانب ہے جو واردات سے قبل بھی محترم یا محترمہ ہوتے ہیں واردات کے دوران بھی ان کا مقام یہی ہوتا ہے اور واردات کے بعد تو کرہ ارض پر ان سے بڑا "مظلوم" کوئی نہیں ہوتا وہ بڑے دھڑلّے سے ٹی وی کی کھڑکی سے ہمارے گھروں میں جھانک کر منہ چڑاتے ہیں کہ اگر ہم چور ہیں تو دس سال میں ثابت کیوں نہیں ہوا ان کی وارداتوں کا حجم اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بیرونِ ملک محلات کے محلات تعمیر ہو جاتے ہیں۔ ایک ایک کروڑ پاؤنڈ سے زائد مالیت کا تو ان کا صرف ایک نیکلس ہوتا ہے ان کے گھوڑوں کی خوراک وہ من سلویٰ ہوتا ہے جس کا تصور دور حاضر کا عام شہری تو کجا گئے وقتوں کے

جلال الدین اکبر نے بھی نہ کیا ہو گا، انہیں بھنڈی کھانے کی خواہش ہو تو پی آئی اے کے خصوصی طیارے تین پائو بھنڈی بیرون ملک پہنچانے کو فضا میں بلند ہو جاتے ہیں ان کی گاڑی بلٹ پروف اور دل شرم پروف ہوتے ہیں۔

اس ملک کے سابق جابر حاکم وفاسق کمانڈو پرویز مشرف نے ایک "مفاہمتی آرڈی نینس" کا اعلان فرمایا تھا جو یقیناً ایک "ڈیل" کا نتیجہ تھا یہ آرڈی نینس پانچ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر باوجود کوشش کے کوئی شق اس مفہوم کی نہ مل سکی کہ حاکم وقت نے بھی حاکم بصرہ کی طرح شہریوں کو آئندہ کے لئے چوریوں سے تحفظ دلا دیا ہو اور نہ ہی وقت کے عباس بن الخیاط اس موڈ میں نظر آرہے ہیں کہ یقین کیا جاسکے کہ تائب ہو چکے ہیں سو اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہم سے تو اہل بصرہ اچھے رہے کاش ہمیں بھی حاکمِ بصرہ کا مفاہمتی آرڈی نینس نصیب ہوتا؟ عدالتِ عالیہ بھی تو ابھی تک اس آرڈیننس سے مستفید حاکم وقت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بھلا بیچاری بھوکی ننگی عوام مایوسی میں کس کا دروازہ پیٹے گی!

بروز جمعرات 5 ربیع الثانی 1432ھ 10 مارچ 2011ء

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ کہنا یا لکھنا آسان نہیں ہوتا، زبان و قلم کی ساری صلاحیتیں ناکافی لگنے لگتی ہیں۔ خصوصاً ایسے موضوعات جن کا تعلق ہماری ذاتی یا ملّی ناکامیوں سے ہو، وہاں ہمارا خاص قومی مزاج خود پسندی اور رجحان راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے دور میں جب انسان مادی ترقی کی معراج پر پہنچ چکا ہے، مسلم دنیا کے تصور کے ساتھ ہی ایک ایسی شکست خوردہ قوم کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے جوہر سے ناآشنا اور مغربی دنیا کی اسیر ہے جس کا کوئی متعین مقصد ہے نہ متعین پالیسی اور نہ منزل۔ آج کوئی بھی مسلم ملک جید علوم و تحقیقات کے میدان میں کسی قابل ذکر مقام پر نہیں کھڑا۔ دنیا بھر میں مسلمان عالمی طاقتوں کے نرغے میں ہیں۔ کہیں مسلمانوں کا وجود زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے تو کہیں وہ نفسیاتی غلامی کا شکار ہے کہ اندھی تقلید سے آگے کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہے۔ یہ ہماری موجودہ ملکی صورتحال کی ایک جھلک ہے۔

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف بڑے ظرف کا کام ہوتا ہے اور اگر احتساب اور اصلاح کے جذبے کے ساتھ ہو تو رب کی عظیم نعمت اور کامیابی کی طرف پہلا قدم ثابت ہو سکتا ہے۔ یہاں ٹھہر کر یہ بات سوچنے کی ضرورت ہے کہ بحیثیت امت محمدؐ ہمارے سامنے کامیابی کا تصور کیا ہے؟ اس وقت امت مسلمہ جن بے دین تہذیبوں کے درمیان موجود ہے، ان کے سامنے تو کامیابی کا تصور "زیادہ سے زیادہ خوشیوں کے حصول اور قول و عمل کی آزادی" سے زیادہ کچھ نہیں ہے جبکہ اسلامی الہامی نقطہ نظر کے مطابق کامیابی اور فلاح اللہ کی زمین پر اللہ کی خلافت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے انسانی زندگی کو تابع امر رب کرنا اور پوری دنیا پر قرآن کا نظام نافذ کر دینا ہے۔ "اسی تصور کے تحت امت مسلمہ نے پہلے بھی دنیا کی امامت کا منصب حاصل کیا تھا اور اب بھی اسلام کے غلبے کا راستہ یہی ہے۔

کامیابی کا راستہ، ترقی و خوشحالی کا راستہ، پستی سے نکل کر عروج کی طرف سفر کرنے کا راستہ، چند مہینوں یا سالوں کا نہیں بلکہ قوموں کے عروج کا سفر صدیوں پر محیط ہوتا ہے اور اپنے افراد کی اتنی ہی جدوجہد اور پیہم عمل کا متقاضی ہوتا ہے۔ ایک مشہور چینی کہاوت ہے:
"تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لیے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کے لیے ہے تو درخت لگاؤ اور اگر دائمی ہے تو تربیت یافتہ افراد تیار کرو۔"

اس لحاظ سے معاشرے کی تعمیر کے لیے فرد کی تعمیر کا کام جتنا اہم ہے، اتنا ہی نازک بھی ہے جس کے لیے ایک ایسے لائحہ عمل اور مربوط نظام تخلیق کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے فرد کی تعمیر عین مطلوبہ خطوط پر ممکن بنائی جا سکے۔ اس حوالے سے ایک موقع پر نیلسن منڈیلا نے کہا تھا:
"ہم دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے سب سے زیادہ طاقتور اسلحہ کے طور پر تعلیم کو استعمال کر سکتے ہیں"۔

کسی بھی قوم بلکہ تہذیب کی بقاء و استحکام کے لیے تعلیم کی اہمیت بنیادی ستون کی سی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں علم سے مراد محض حرف شناسی نہیں ہے بلکہ علم کا صحیح ترین تصور معرفتِ الٰہی، معرفتِ کائنات، معرفتِ انسان اور مقصد زندگی کی صحیح معرفت پر مبنی ہے جس کا ماخذ قرآن ہے۔ اسی علم سے مستفید

ہونے والی نسل رب العالمین، کائنات اور اس کے اندر انسان کی صحیح حیثیت کو پہچان کر جب اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں مقصدِ زندگی کی طرف لگائے گی تو یقیناً کامیابی اور ترقی کی معراج حاصل کر کے رہے گی۔ اگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس تعلیمی فارمولے پر دمشق، بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور ثمرقند کے تعلیمی مراکز نے کام کیا تھا اور اپنے زمانے کی امامت کا منصب سنبھالا تھا تو ہماری نگاہیں کسی مغربی نظام تعلیم سے مرعوب نہ ہوں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ خود وطن عزیز میں سیکولر اور لبرل تعلیمی فلسفہ ایک بڑا معیار بن کر ابھرا ہے جبکہ اس بے دین "کوالٹی ایجوکیشن" کے اثرات تمام دنیا پر اس صورت میں رونما ہوئے ہیں کہ نفس پرستی اور دولت پرستی کے جذبات نسل انسانی کا خاصہ بن گئے۔ خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا۔ معاشرتی جرائم میں ہوش ربا اضافہ ہوا اور بدترین اخلاقی گراوٹ نے احترام انسانیت کو پامال کیا۔ غرض کوئی تعمیری پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انسان کو اپنے قول و فعل کی مکمل آزادی مل گئی اور زیادہ سے زیادہ خوشیاں سمیٹنے کیلیے تمام ذرائع جائز قرار پائے۔

وطن عزیز کے اندر تعلیمی نظام کی صورت حال اور بھی بھیانک ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک 63 سال گزر جانے کے باوجود ہم اپنے نظامِ تعلیم کبھی مغرب سے ادھار لیتے ہیں، کبھی امریکا سے، کبھی برطانیہ سے اور کبھی جاپان سے جس کے ساتھ ان کے تہذیبی عناصر بھی وطنِ عزیز میں خود بخود اپنی راہ نکال لیتے ہیں۔ مقام فکر یہ ہے کہ ایک اسلامی نظریاتی مملکت جو پہلی اسلامی ایٹمی قوت بھی ہے، رب العالمین کی طرف سے ایسی نعمتِ عظیم ہے، جہاں اسلامی نظامِ تعلیم کے فروغ کے ذریعے امامتِ دنیا کے مقصد کی طرف پیش رفت کی جانی چاہیے تھی مگر ستم ہوا کہ لارڈ میکالے کے عطا کردہ 19 ویں صدی کے فرسودہ نظام تعلیم کو اس طرح سینے سے لگائے رکھا گیا جیسے آسمانی صحیفہ ہو جبکہ لارڈ میکالے نے اپنی تعلیمی سفارشات میں واضح طور پر کہا تھا کہ ہمارا مقصد ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنا ہے جو اپنی نسل اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں مگر ذہن اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہوں۔ علامہ اقبال اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

مزید یہ کہ ارباب اختیار کو وقتاً فوقتاً نظامِ تعلیم کے فرسودہ ہونے کا احساس تو ہوتا رہتا ہے مگر پھر قوم کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کو سیکولر بنیادوں پر استوار کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ان کے زعم میں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں اس بنیاد پر پہلی جماعت سے میٹرک اور انٹر، بی اے تک کے نصابوں میں زبردست تبدیلیاں کی گئیں۔ بائیولوجی (نویں جماعت) کی کتاب سے قرآنی آیات کا اخراج، اولیول کے نئے نصاب میں انتہائی حیاسوز مواد اسلامیات کا نہ پڑھایا جانا، نصاب سے نماز کے طریقے کو خارج کر دینا، میٹرک کے نصاب سے سورۃ التوبہ اور سورۃ الانفال نکال دینا اور چھٹی جماعت کے لیے طبع شدہ نصاب میں آنحضورؐ، اسلام، جہاد اور محترمہ فاطمہ جناح پر مشتمل ابواب شامل نہ کرنا ان اقدامات کی ہلکی سی جھلک ہے۔

منظرِ عام پر آنے والی چشم کشا رپورٹوں کے مطابق یہ تمام کاروائیاں بیرونی آقاؤں کے اشاروں پر کی گئیں جو اپنے عالمی اقدار کے مستقبل کو لاحق خطرات سے پریشان ہیں۔ یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ہمارا نظامِ تعلیم براہِ راست حملے کی زد میں ہے اور یہ حملہ ہمارے ایمان اور نظریات پر حملہ

ثابت ہو رہا ہے جسے کوئی صاحب شعور برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر اس موقع پر بھی تساہل کا مظاہرہ کیا گیا اور اسے ٹھنڈے پیٹوں ہضم کر لیا گیا تو اس کے ہولناک نتائج اس صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

یہ ہمارے نظامِ تعلیم کو لاحق نظریاتی مسائل کا ہلکا سا عکس ہے جبکہ انتظامی مسائل اس سے الگ ہیں۔ انگریزی ذریعہ تعلیم، طبقاتی نظام، نجکاری، آغا خان بورڈ، خواتین کے لیے علیحدہ تعلیمی اداروں کا نہ ہونا، مہنگی تعلیم، امتحانی نظام کے نقائص، کاپی کلچر، تعلیمی اداروں کا نظم و نسق، اساتذہ کی قلت اور ان کی تربیت کا فقدان جیسے تمام مسائل ارباب اختیار کی پر خلوص محنتوں کے متقاضی ہیں۔ قوم کا پسپائی سے نکل کر عروج کی منزلیں طے کرنے کے لیے تعلیم سے بڑھ کر کوئی ذریعہ ثمر آور نہیں۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالے ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اس وقت اولین ضرورت اس امر کی ہے کہ قومی نظام تعلیم کو نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ کر کے اس کے واضح مقاصد متعین کیے جائیں۔ اس کے ذریعے طلبہ کی اخلاق و کردار سازی پر توجہ دی جائے۔ اسی طرح طلبہ کا کام یہ ہے کہ وہ انگریزی میں بھی مہارت حاصل کریں۔ مغرب کی سائنسی و تکنیکی تحقیقات سے بھی مستفید ہوں مگر مرعوب و مقلد بن
کر نہیں بلکہ آزاد اور نقاد ذہن کے ساتھ اپنے سامنے حصول علم کا وہی مقصد رکھیں جو قرآن نے دیا ہے۔ سیکولرازم اور لبرل ازم کے چیلنج کے سامنے کمر بستہ ہو جائیں اور قیادت
زمانہ کے اپنے عزم کو مستحکم کریں۔ ایک ساز گار روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

بروز اتوار 8 ربیع الثانی 1432ھ 13 مارچ 2011ء

حکمت یا حماقت

پرویز مشرف کی قوت کا انحصار تو قصرِ سفید کے فرعون کا مرہونِ منت تھا، سولہ کروڑ عوام اس کی حکمت عملی سے خارج تھے لیکن 18 فروری کے انتخابات مشرف کی مکمل نفی اور ہمہ پہلو تبدیلی کا پیغام لائے تھے، اس پیغام کو اس قدر عجلت میں نظر انداز کر دیا جائے گا اس کی بہر حال اس درماندہ قوم کو توقع نہیں تھی۔ انتخابات کے بعد کاروبار مملکت سنبھالنے والے، امریکہ سے رشتہ و تعلق رکھتے ہوئے، اپنے عوام سے ناتا جوڑتے، ان کے دلوں میں جھانکتے، ان کی پیشانیوں پر رقم نوشتوں کو پڑھتے، کروسیڈ کے حامیوں کی عبرتناک شکست کے اسباب پر غور کرتے، نام نہاد،، وار آن ٹیرر،، کو مشرف کی عینک کی بجائے قومی مفادات کی نگاہوں سے دیکھتے اور تین سال کے بعد بریفنگ کی بساط بچھانے کی بجائے بااختیار وزیر اعظم کے انتخاب کے فوراً بعد پارلیمان کو اپنی اتھارٹی استعمال کرنے دیتے تو صورت حال میں بہت بہتری آچکی ہوتی۔

خود امریکہ، انتخابی نتائج دیکھ کر اپنی حکمت عملی میں تبدیلیوں کیلئے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکا تھا، لیکن ہماری موجودہ حکمرانوں کے بزدلانہ طرز عمل اور رویے سے اسے ویسی ہی خوشگوار حیرت ہوئی جیسے نو سال پہلے کولن پاؤل کو مشرف کے رد عمل سے ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ پہلے سے بھی زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ قبائلی علاقوں کے بعد ہمارے ملک کے دیگر شہروں میں کاروائیاں کرنے لگ گیا اور پہلے سے زیادہ بڑھ چڑھ کر ہماری آزادی اور خود مختاری کا مضحکہ اڑانے لگ گیا ہے۔ گویا مشرف تو چلا گیا لیکن اس کا چلن اور پالیسی پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ نافذ ہے۔ آگ قبائلی علاقوں سے لیکر لاہور کے جوس کارنر تک تو جا پہنچی، قوم کو ڈرانے کیلئے،، ڈرون،، حملوں کے علاوہ اب صہیونی ایجنٹوں کو پاکستانی عوام کا کھلے عام قتل عام کا لائسنس مہیا کر دیا گیا ہے اور اس شرمناک فعل کے بعد اگر وہ افراد گرفتار کر لئے جاتے ہیں تو انہیں انتہائی ڈھٹائی سے فوری سفارتی استثناء دینے کا مطالبہ زور پکڑ جاتا ہے۔

میرا وجدان نجانے کیوں مجھے اس طرف دھکیل رہا ہے کہ کہیں،، دوبارہ دھماکے، ادھڑی ہوئی لاشیں، گوشت کے لوتھڑے، خون کے چھینٹے، بین کرتی مائیں، دہائی دیتی بیوائیں، زاری کرتے کمسن یتیم بچے، عصائے پیری سے محروم ہو جانے والے فریاد کرنے والے بوڑھے، کھنڈر ہوتی عمارتیں، اندوہ میں ڈوبے دردانگیز مناظر، دانشوروں کے تبصرے، ماہرین کے تجزیے، صاحبان اختیارات کے تعزیتی بیانات، مجرموں کو بہت جلد کیفر کردار پہنچانے کی جھوٹی نوید، دہشت گردی کے خلاف جنگ اسی جوش و جذبے کو ساتھ لڑنے کا عزم،، کی فلم شروع نہ ہو جائے! اس کے جواب میں وہی پرانے فارمولے میدان میں اپنی کارکردگی کے جوہر دکھانے کیلئے قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے قومی سلامتی کے تمام اداروں کی انتھک محنت کا راگ سنا کر بہلانے کی ایک ناتمام کوشش اور موقع واردات پر بکھرے سروں میں سے کسی ایک سر کا انتخاب کر لیا جائے گا اور پھر اس کٹے ہوئے سر کو مفروضہ خودکش حملہ آور کا سر قرار دیکر طالبان یا القائدہ سے اس کا تعلق جوڑ کر اس چوکھٹے میں سجی تصویر کے نیچے،، اپنی جنگ،، کی تختی سجا کر قصر سفید سے تحسین کی امید
کے ساتھ حکومت کی مضبوطی کی سند حاصل کی جائے گی۔

گزشتہ کئی برسوں سے یہ لاحاصل مشق جاری ہے۔ کسی خودکش حملہ آور کی شناخت نہیں ہو سکی، کسی خودکش حملہ آور کا شجرہ نسب معلوم نہیں ہو سکا، کوئی ڈی این اے ٹیسٹ کسی بھی مجرم کا پتہ نہیں چلا سکا، کوئی بھی تفتیشی ادارہ ان دہشت گردوں کی کمین گاہوں کا سراغ نہیں لگا سکا۔ وحشت و درندگی کا یہ برہنہ رقص پاکستان کے گلی کوچوں میں جاری ہے اور ہمارے حکمران آنکھوں، کانوں اور ذہنوں کی تمام کھڑکیوں اور دریچوں کو بند کر کے اب بھی،، یہ ہماری جنگ،، کی صدا لگا رہے ہیں۔ لیکن کوئی ان سے یہ بھی تو پوچھے کہ ہمارے اس ظالم اور سفاک دشمن کا نام کیا ہے؟ اس قاتل کا اتہ پتہ بتاؤ؟ کوئی ٹھوس شہادت تو لاؤ کہ کون ہماری زندگی سے اس بہیمانہ طریقے سے کھیل رہا ہے؟ کسی پاکستانی کو ایسے خونخوار درندوں سے کوئی ہمدردی نہیں، لیکن پورا سچ بولتے ہوئے تمہاری زبان پر چھالے کیوں پڑ جاتے ہیں؟ قوم کو کب تک خود فریبی کے جال میں جکڑ کر رکھ سکو گے؟
حکمرانوں کے اصرار اور بعض "حکومتی مفکرین" کی منافقت بھری دانش کے باوجود اس جنگ کو بن باپ بچے کی طرح اب تک کیوں پذیرائی نہیں مل سکی۔

کئی مرتبہ انہی کالموں میں کچھ بیرونی ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان دہشت گردوں کو اسلحہ اور بھرپور مالی وسائل مہیا کر رہے ہیں۔ ہمارے موجودہ حکمران کبھی کبھی ڈرے اور سہمے ہوئے اس بات کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔ کیا پاکستان کے عوام اس دشمن ہمسایہ کو نہیں پہنچانتے جس نے آج تک پاکستان کو اکھنڈ بھارت بنانے کا اعلانیہ عزم کر رکھا ہے؟ تین سال پہلے بھارتی فوج کا ایک لیفٹیننٹ کرنل سری کانت پروہت، میجر رمیش اپادھیائے اور سادھی پرگیہ ٹھاکر کو مالیگاؤں بم دھماکوں کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ایک سابقہ فوجی میجر جنرل اور اس کے ساتھی کو بھی تحقیقات کیلئے پونے سے حراست میں لیا گیا تھا۔ یہ سابق فوجی افسر میجر جنرل اور اس کے ساتھی گرفتار سادھوی پرگیہ ٹھاکر کی شعلہ بیان تقاریر سے بہت متاثر تھے جس نے اڑیسہ میں سوامی لکشمانند کے قتل پر بھارت سے مسلمانوں اور پڑوسی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کیلئے ملک میں ایک بھرپور تحریک شروع کر رکھی ہے۔ یہ فوجی افسران شدت پسند ہندو تواوادی تنظیم ہندو جن جاگرن منچ کو بم بنانے کی تربیت کے علاوہ مبینہ طور پر فوجی اسلحہ اور ڈپو سے آر ڈی ایکس مسلمانوں کے اجتماعی قتل، ہندوستان میں تخریب کاری اور دہشت گردی پھیلانے کیلئے فراہم کرتے تھے جس کا الزام فوری طور پر پاکستان کی آئی ایس آئی کے سر تھوپ دیا جاتا تھا۔

چار سال قبل ناندیڑ میں آر ایس ایس کے ممبر کونڈوار کے گھر میں بم بناتے ہوئے دھماکہ ہو گیا تھا جس میں دو افراد موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس واقعے میں زخمی افراد کے نارکو ٹیسٹ میں یہ راز افشاں ہوا تھا کہ سمجھوتہ ایکسپریس، پربھنی پورنا اور جالنہ کی مساجد میں انہیں لوگوں نے دھماکے کئے تھے۔ ان تحقیقات کو چھپانے کیلئے پس پردہ بہت اثر و رسوخ بھی استعمال ہوا لیکن اس کو منظر عام پر لانے میں وہاں کے میڈیا نے بڑی جانفشانی سے کام لیا اور بالآخر وہاں کے ان اداروں کو اس شازش کو بے نقاب اس لئے بھی کرنا پڑا کہ یہ تمام دھماکے ہندوستان کی سرزمین پر ہوئے تھے اور ان واقعات کی تحقیقات کے سلسلے میں ان پر بڑی کڑی نکتہ چینی کی جا رہی تھی۔ اب تو سمجھوتا ایکسپریس میں بیدردی کے ساتھ پاکستانی بے گناہ مسافروں کو آگ میں بھسم کر دینے والے دہشت گردوں کو بھی گرفتار کیا جا چکا ہے، اس معاملے پر موجودہ حکومت کو کیوں سانپ سونگھ گیا ہے؟ اگر ایسا معاملہ پاکستان کے ساتھ ہوتا تو کیا اب تک بھارت خاموش رہتا؟؟

پاکستان کے سارے دشمن،،وار آن ٹیرر،، کی چھتری تلے افغانستان میں آن بیٹھے ہیں۔ سی آئی اے کی معیت میں بھارت کی،،را،، اسرائیل کی ،،موساد،، بھارت کے نان نفقہ پر پلنے والا شمالی اتحاد اور افغانستان کی پرانی خاد کے فتنہ پرور عناصر سب مل کر پاکستان میں بے چینی، انتشار، عدم استحکام اور فتنہ وفساد کے ذمہ دار ہیں۔ پاکستان کے وجود پر چرکے لگانے اور لہولہو کرنے والی یہ تمام غیر ملکی قوتیں تو مکمل آزادی کے ساتھ مکروہ کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہمارے صاحبان اقتدار ان کا راستہ روکنا تو درکنار، ان کا نام تک لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے لیکن ہم اب بھی کٹے ہوئے سر، خودکش بمبار طالبان یا القائدہ کے نام پر قوم کی آنکھوں میں دھوکے اور مکاری کی دھول جھونک کر بودے دلائل کی مینا کاریوں میں مشغول ہیں۔ آگ اور بارود کا یہ کھیل بلاشبہ ہمارے دشمنوں نے بڑی مہارت سے شروع کر رکھا ہے لیکن میرے خدشات مزید اس لئے بڑھ رہے ہیں کہ دشمن نئی چالوں کے ساتھ میدان میں اتر چکا ہے۔ سی ائی کے سربراہ کے ساتھ ٹیلیفونک مذاکرات میں جنرل پاشا نے سی ائی اے کے سربراہ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ انہیں فوری طور پر پاکستان میں تعینات تمام صہیونی ایجنٹوں کی فہرست فراہم کی جائے لیکن کیا سی آئی اے اپنے سینکڑوں ایجنٹوں کی فہرست اتنی آسانی کے ساتھ آپ کے حوالے کرے گی جس کیلئے سی آئی اے نے موجودہ پاکستانی حکومت کے تعاون کے ساتھ آئی ایس آئی کے پر کاٹنے کے احکام صادر کئے اور ساری دنیا میں آئی ایس آئی کو ایک "روگ ایجنسی" کے طور پر متعارف کروانا شروع کر دیا؟

کتنے سادہ ہیں میر بیمار ہوئے جس کے سبب
اس عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

کروسیڈ کی لگائی ہوئی یہ آگ پانی اور پھونکوں سے تو نہیں بجھے گی۔ آتش فشاں سے دوستی اور لاوے سے دشمنی حکمت نہیں حماقت کہلاتی ہے۔

بروز منگل 10 ربیع الثانی 1432ھ 15 مارچ 2011ء

کڑکتے کوڑے یا ڈالروں کے توڑے

تحریر، ہاں کیا ہر واقعہ تحریر کیا جا سکتا ہے؟ شاید۔ ہو سکتا ہے خود پر تھوڑا سا جبر کریں، خود کو جمع کریں تو آپ لکھ لیں گے۔
لیکن کیا ہر بات لکھی جا سکتی ہے؟ خوشی کو تو لکھا جا سکتا ہے۔ اور غم کو!
دکھ تو تحریر ہو سکتا ہے اور درد!
آنسوؤں کو کیسے لکھا جا سکتا ہے، کرب کو کیسے لکھیں... اضطراب کو، بے کلی کو، بے حسی کو، انا کو تحریر میں کیسے سموئیں!

لفظ وہی ہوتے ہیں، قلم وہی ہوتا ہے، صفحات وہی ہوتے ہیں... سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ لیکن آپ بے دست و پا ہوتے ہیں۔ رحمت کو تو بیان کیا جا سکتا ہے، تحریر کیا جا سکتا ہے، نحوست کو کیسے پابند تحریر کیا جا سکتا ہے! اداسی کو تحریر کر سکتے ہیں آپ؟ کچھ نہیں کر سکتے ہم۔ فیض صاحب نے تو کہا ہے " جو دل پہ گزرتی ہے سو گزرتی ہے، اسے بیان کیسے کریں! میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ نہیں مجھے یہ ہنر نہیں آتا۔ اور مجھے یہ سیکھنا بھی نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں ہے مجھے سب کچھ آتا ہو۔ نہیں میں نہیں لکھ سکتا دل کو، اداسی کو، بے کلی کو، اضطراب کو... بالکل نہیں لکھ سکتا۔ آنسوئوں کو کیسے تحریر کروں؟ بتایئے آپ۔ اگر آپ تحریر کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔

لیکن یہ ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا، یہی ہے ریت۔ کوئی نئی بات نہیں، کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ خلق خدا کے حق میں نغمہ سرائی جرم تھی، جرم ہے، جرم رہے گی۔ خلقِ خدا کی گردنوں پر سوار اس وقت بھی یہی کرتے تھے اب بھی یہی کرتے ہیں اور آئندہ بھی یہی کرتے رہیں گے۔ کوئی نئی بات نہیں، یہ ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا۔ آپ زمینی خدائوں کو للکاریں گے تو وہ آپ کو ہار پھول پیش نہیں کریں گے۔ یہی ہو گا۔ آپ آئینہ دکھائیں گے اور وہ اپنی مکروہ صورتوں کو دیکھ کر آپ کو پتھر ماریں گے۔ گولیاں داغیں گے۔ لاٹھیاں برسائیں گے۔ آنسو گیس کے شیلوں کی برسات کریں گے۔ لیکن اپنے قلم کو خلقِ خدا کی امانت سمجھنے والے کبھی باز آئے ہیں نہ آئندہ آئیں گے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں:

ہوں جب سے آدمِ خاکی کے حق میں نغمہ سرا
میں دیوتاؤں کے بپھرے ہوئے عتاب میں ہوں

زمینی خداؤں کے زر خرید غلام خلقِ خدا کی آواز کو خاموش کرنے کا سپنا دیکھتے ہیں اور وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا، نہ ہو گا۔ تو بس پھر یہی منظر ہو گا آئندہ آنے والے چند دنوں میں۔ ہر طرف بپھرا ہوا عتاب اور اہل جنوں کا نعرۂ مستانہ۔ سر بلند رہے گا یہ نعرۂ " فرعون پہلے بھی غرقاب ہوا تھا، آئندہ بھی اس کا نصیبا یہی ہے"۔ مبارک ہو انہیں جو خلق خدا کے لئے سر عام پٹتے رہے۔ جن کے خون سے سڑکیں رنگین ہوئیں۔ آج کچھ نہیں ہے کہنے کو، بس جو کچھ سن رہا ہوں وہ لکھ رہا ہوں۔ ٹی وی چینلز پر لوگوں کے پیغام دیکھ رہے ہیں آپ! میں نے بھی دیکھے ہیں، سنے ہیں... وہی تحریر کر رہا ہوں، اس لئے کہ میں زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھتا ہوں۔ اندھے، بہرے نوشتۂ دیوار نہیں پڑھ سکتے تو ہم کیا کریں!

ہاں فرعون مرتا ہے، فرعونیت نہیں مرتی۔ اس کے پیروکار آتے ہیں، آتے رہیں گے۔ پھر وہ پکارنے لگتے ہیں، ہمارا منصوبہ کامیاب رہا۔ ہم ہیں اعلیٰ وارفع۔ ہمارے پاس ہیں وہ دانش و بینش جو بچالے جائیں گے سب کو۔ بس ہمارے پیچھے چلو۔ ہماری پیروکاری کرو کہ نجات اسی میں ہے۔ یہاں ہر فرعون یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ بس وہی ہے عقل و فکر کا علم بردار... بہت ضروری ہے وہ۔ اس کی ہدایت ورہنمائی ہی نجات کا سبب ہے۔ بس وہی "میں" کا چکر۔ نخوست کا چکر۔ اسی لیے وہ پکارتا رہتا ہے۔ وہی ہے اعلیٰ وارفع، وہی ہے رب اور رب اعلیٰ بھی۔ خود فریبی کی چادر میں لپٹا ہوا۔ موت ... موت تو اسے چھو بھی نہیں سکتی۔ سامان حرب سے لیس۔ خدام اس کی حفاظت پر مامور ہیں۔ چیڑیا بھی پر نہیں مار سکی۔ دور دور تک کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسے گزند پہنچا سکے۔ مصاحبین کے نعرہ ہائے تحسین اسے اس زعم میں مبتلا رکھتے ہیں۔ کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس کی مرضی سے چلتا ہے کاروبار حیات... جیسے وہ موت کو بھول بیٹھتا ہے، خود فریب تو سمجھتا ہے کہ موت بھی اسے بھول جائے گی۔ سمجھ بیٹھے ہیں یہ محفل سدا سجائیں رہیں گے۔ واہ، واہ، آفرین آفرین کرنے والے درباری یونہی داد دیتے رہیں گے۔ نہیں جناب بالکل بھی نہیں۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

لیکن پھر ایک اور دریا ہوتا ہے اور انجام وہی۔ بالکل یہی سمجھتا ہے کہ جس طرح وہ موت کو بھولا ہوا ہے، موت بھی اسے بھول چکی ہو گی۔ لیکن آتی ہے وہ۔ ہزار پہرے بیٹھا دیجئے، دیواریں چنوا لیجئے، کیمرے لگا لیجئے۔ وہ نہیں رکتی۔ آتی ہے اور سر عام آتی ہے۔ کوئی نہیں بچ سکا اس سے۔ لیکن ہوتا کچھ اور ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے... محافظ بھی، سامان حرب بھی، محلات بھی، ساز و سامان بھی، آفرین بھی، واہ واہ بھی... سب کچھ ہوتا ہے۔ اور پھر نیل ہوتا ہے، لہریں ہوتی ہیں، منہ زور لہریں... رب حقیقی کے حکم کی پابند۔ اور جب وہ گھر جاتا ہے پھر دور دور تک کوئی نہیں ہوتا مددگار۔ تب وہ آنکھ کھولتا ہے اور پکارنے لگتا ہے" نہیں نہیں، میں ایمان لاتا ہوں، ہاں میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لاتا ہوں۔" لیکن بند ہو جاتا ہے در۔ کسی آہ و بکا سے نہیں کھلتا۔ اور پھر وہ غرق ہو جاتا ہے۔ موت اس کی شہ رگ پر دانت گاڑ دیتی ہے۔ ختم شد۔ نشانِ عبرت۔ داستان در داستان۔

ہاں ایک امتحان تھا گزر گیا۔ نتیجہ تو بعد میں نکلے گا۔ کیا؟ میں نہیں جانتا۔ بس میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا کیا اور ان کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہاں دعا کروں میں... لیکن کس منہ سے دعا کروں؟ کیسے اپنے رب کا سامنا کروں؟

اک نئی کربلا میرے سامنے بپا ہوئی۔ ہمارے بچے اور بچیاں تہہ تیغ کئے جا رہے ہیں اور معاملہ خون بہا کی ادائیگی پر ختم کرنے کا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ اس قدر عجلت میں معاملہ طے پاتا ہے کہ جہاز پہلے سے اپنے مسافر کیلئے تیار، بس ڈالروں کی کھنک سے قومی غیرت کو دفن کر کے آقا اپنی منزل کی طرف پرواز کر جاتا ہے..... کس کو بے وقوف بنا رہے آپ؟

آپ کہاں ہیں اور کیا کہتے ہیں؟ معصوموں کی چیخیں مجھے جینے نہیں دیں گی۔ میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکا۔ ہاں مجھے زندگی پیاری ہے... ہاں میں سانس کی آمد و رفت کو زندگی سمجھتا ہوں... ہاں میں نے ذلت و رسوائی کی زندگی قبول کر لی ہے... ہاں میں موت سے بہت ڈرتا ہوں..... ہاں

میں نے اپنا رب بدل لیا ہے..... ہاں میں عزت و ذلت کا مالک انہیں سمجھتا ہوں جن کے ہاتھ میں ہمارے اقتدار کی ڈوری ہے، جن کے ایک ہاتھ میں خوفزدہ کرنے کیلئے کڑکتے کوڑے ہیں اور دوسرے ہاتھ میں ہمارے چیچک زدہ چہروں پر سجے طمع و حرص کے مارے منہ بھرنے کیلئے ڈالروں سے بھرے توڑے۔ ان کے پاس بے حس بندوقیں ہیں۔ شعلہ اگلتی ہوئی بندوقیں۔ میں انہیں زندگی اور موت کا مالک سمجھتا ہوں جن کے میزائلوں کی گڑگڑاہٹ سے دل دہل جاتا ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ میرا تورا بورا نہ بنا دیں۔ ہاں وہی ہیں میرے مالک... آپ کے متعلق کیسے کہہ سکتا ہوں؟ آپ جانیں اور آپ کا کام!

بروز بدھ 11 ربیع الثانی 1432ھ 16 مارچ 2011ء

گدھوں کا راج

ہاں یہ گھاؤ کہاں بھرتا ہے... رستا رہتا ہے... لگتا ایسا ہی کہ بھر گیا لیکن نہیں کبھی نہیں بھرتا..... تازہ رہنے والا سدا بہار..... آپ کسی پر اعتماد کریں۔ اندھا اعتماد۔ خود پر بھروسہ نہ ہو لیکن اس پر تکیہ کریں کہ ہاں یہ کبھی نہیں ہمارے اعتماد سے کھیلے گا۔ جان پر تو کھیل جائے گا کہ جان اتنی قیمتی بھی نہیں۔ لیکن... اعتماد کبھی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ آپ کے ایمان کا حصہ بن جاتا ہے وہ اعتماد اور پھر آپ کو معلوم ہو کہ ختم ہو گیا سب کچھ... شیشے کے برتن کی طرح کرچی کرچی ہو گیا۔ تب کیا بیتی ہے... بس یہ وہ جانتے ہیں جن پر بیتی ہے۔ شاید کانچ کرچی کرچی ہو کر جڑ سکے لیکن دل نہیں ناممکن ہے۔

جب آپ دل و جاں سے فدا ہو جائیں۔ سب کچھ لٹا دیں۔ ہاں سب کچھ... اپنے رب سے دعائیں مانگیں... اور مانگتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں جھڑی لگ جائے۔ مون سون کی برسات کی طرح۔ تج دیں آپ سب کچھ۔ آپ نغمے گائیں تو اس کے، قصیدے پڑھیں تو اس کے۔ ناز اٹھائیں تو اس کے۔ اپنے منہ کا نوالا بھی اس پر قربان کر دیں۔ تن من دھن سب کچھ اور وہ آپ کا سب کچھ بن جائے اور پھر وقت پڑے تو وہ منہ موڑ لے۔ تب... آپ کہاں کھڑے ہوتے ہیں۔

کچھ بھی تو نہیں رہتا آپ کے پاس۔ آپ کا خلوص منہ چھپائے پھرتا ہے۔ جذبات آہیں بن کر گونجتے ہیں۔ آپ کے گائے ہوئے نغمے... سسکیوں میں بدل جاتے ہیں۔ خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ عہد و پیمان... پرزہ پرزہ ہو کر ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔ خبر ہی نہیں ہوتی۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں۔ بہت مشکل ہو جاتی ہے زندگی... خواب بکھر جائے تو انسان بکھر جاتا ہے اور پھر یہی نہیں۔ جنہیں سینے سے لگایا تھا، وہ سینے چھیدنے لگتے ہیں اور ایسے کہ چھلنی ہو جائے دل۔ تب کیا بیتی ہے۔

میں آپ سے مخاطب ہوں۔ سن رہے ہیں آپ... کوئی ربط نہیں لگ رہا آپ کو میری باتوں میں۔ ہاں مجھے بھی خبر نہیں... کیا کہہ رہا ہوں۔ کس لیے اور کیوں کہہ رہا ہوں۔ جب کسی کو روگ لگ جائے تو اس سے ربط کا تقاضا... بہت ناانصافی ہے۔ سو معاف کر دیجئے مجھے۔ مجھے آپ کی وسیع القلبی پر ناز ہے۔ بہت ناز۔

لیکن ذرا ٹھہریئے بہت جلدی میں ہیں آپ۔ میں بھی تو آپ میں سے ہوں۔ کوئی اعلیٰ نسب، کوئی خصوصی فرد، کوئی مراعات یافتہ نہیں ہوں۔ بس آپ میں سے ہوں۔ میرا دل آپ کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں میں۔ بہت خوشیاں دی ہیں آپ نے مجھے۔ ہاں بہت اعتماد کرتے ہیں آپ مجھ پر جان... تو... کچھ نہیں ہے۔ آنی جانی ہے۔ ضرور جائے گی۔ جب لکھ دیا تو پھر کیا ڈرنا، پھر آپ کا اعتماد میری زندگی کا حاصل ہے۔ اسے میں کیسے روند سکتا ہوں۔ مجھے آپ پر ناز ہے۔ آپ کی محبتوں پر میرا سر بلند ہے۔ آپ میری تلخ نوائی پر بھی رنجیدہ نہیں ہوتے۔ کون سنتا ہے کسی کی تلخ باتیں۔ آپ سنتے ہیں۔ مجھے جان سے عزیز ہیں آپ۔ آپ نہ ہوتے تو کون اٹھاتا میرے ناز نخرے۔ بس میں آپ کے ساتھ رہتا ہوں اور رخصت بھی آپ کے کاندھوں پر ہو کر جائوں گا۔ میرا مرنا جینا لوگوں کے ساتھ ہے۔ اس مٹی میں آسودہ ہو جائوں گا۔

اور پھر کوئی اور آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ کسی کے چلے جانے سے کاروبار حیات رکا ہے نہ رکے گا۔ اپنے آس پاس دیکھتا ہوں تو سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ کتنے دکھ ہیں۔ کتنے آلام ہیں۔ لیکن ان سے تو ہم لڑیں گے۔ اپنوں سے کیا لڑیں... کیسے لڑیں، بہت مشکل ہے ناں... بہت ہی مشکل۔ اور ظرف کا بھی تو معاملہ ہے۔ کیا کریں کہاں جائیں۔

ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو پیشانی میں ہے، اسے پیش آنا ہے۔ جو کاتب تقدیر نے لکھا ہے اسے پورا ہونا ہے۔ خیر یا شر۔ برا یا بھلا۔ جو کچھ بھی آنے والے ایک پل کے پردے میں چھپا ہے۔ پل گزرتے ہی سامنے آجانا ہے۔ اگلے پل کے پیچھے کیا چھپا ہے، کیا سامنے آئے گا ۔ پچھلے پل کا تسلسل یا اس کے بالکل برعکس۔ کون جانے، کس کو معلوم؟

انسان کے بس میں کب کچھ ہے۔ جو کچھ ہے سلطان کے بس میں ہے۔ جو رحمان و رحیم بھی ہے، قہار و جبار بھی۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہے۔ کیا کوئی کاٹھی نہیں، جو وقت کے بے لگام گھوڑے پر ڈالی جا سکے۔ کوئی لگام نہیں جو اس گھوڑے کا منہ موڑ دے۔ کیا کوئی چابک نہیں جو اس اڑیل کو صحیح سمت میں رواں رکھ سکے۔ کیا کوئی رکاب نہیں جو سوار کو سواری کی
پیٹھ سے چپکا سکے۔ اسے اوندھے منہ گرنے سے بچا سکے۔

نہیں ایسا نہیں ہے۔ رب رحمان نے انسان کو سمجھایا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو پیشانی میں ہے اسے پیش آنا ہے۔ کاتب تقدیر نے لکھا ہے اسے پورا ہونا ہے۔ لیکن ہونی کیا ہے۔ پیش کیا آنا ہے۔ کاتب تقدیر نے کیا لکھا ہے۔ سوائے اس کے کہ "بما کسبت ایدیھم"۔ جو کچھ تم نے اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ اس نے راستے دکھائے ہیں۔ "ھدینہ النجدین"۔ بھلائی اور برائی کے راستے۔ اس نے تو سمجھایا ہے۔ "فالھمھا فجورھا وتقواھا"۔ ہم نے الہام کیا ہے، برائی کا بھی، بھلائی کا بھی۔ اس نے تو بار بار یاد دلایا ہے۔ "قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا" اس نے تو وعدہ کیا ہے۔ "لا یضیع عمل عامل منکم" (وہ کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا)۔ اور پھر اس نے کہا ہے تول لیا جائے گا تمہارا ہر عمل اچھا یا برا، چھوٹا یا بڑا۔ اور فیصلہ کر دیا جائے گا تمہارے فلاح یا خسارے کا۔ اس نے انسان کو متنبہ کیا ہے۔ "وقت کی قسم تمام انسان خسارے میں ہیں۔" اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس خسارے سے کیسے بچا جائے۔ اس نے وقت کا منہ زور گھوڑا ہی تخلیق نہیں کیا۔ اس نے کاٹھی بھی دی ہے، لگام بھی۔ چابک بھی دی ہے، رکاب بھی۔ ایمان کی کاٹھی۔ عمل صالح کی لگام۔ تواصی حق کی چابک اور تواصی صبر کی رکاب۔ تاریخ سے پوچھ کر دیکھئے۔ کون ہے جس نے وقت کے بے لگام گھوڑے کو قابو کرنے کے لیے ان اجزاء کو استعمال کیا ہو، اور ناکام رہا ہو۔ کون ہے جس نے ان اجزاء سے دامن چھڑایا ہو اور کامیاب ہوا ہو۔

لیکن ہمارا معاملہ عجیب ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ "تمنا برق کی رکھتا ہوں اور افسوس حاصل کا"۔ سمجھانے والے سمجھاتے رہ جائیں۔ راہ دکھانے والے راہ دکھاتے رہ جائیں۔ ہم کسی کی کب سنتے ہیں۔ ہم کہ عقل کل ٹھہرے، کب کسی کی مانتے ہیں۔ ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن نہ اس کے دین کو مانتے ہیں نہ یوم الدین سے ڈرتے ہیں۔ ہم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، لیکن اس سے ہدایت نہیں لیتے۔ ہم نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے ہیں، لیکن ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ ہم اپنے آپ کو اعتدال پسند، روشن خیال اور جمہوریت کے شیدائی کہتے نہیں تھکتے، لیکن اپنے رویوں میں انتہا پسندی، تاریک خیالی، اور آمریت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

گدھ ہیں یہ سب۔ گدھوں کا راج ہے یہاں۔ مردار خور گدھ... چلتی پھرتی لاشوں کو نوچنے والے گدھ۔ گدھ تو پھر لاشوں کو نوچتا ہے، یہ ایسے سفاک ہیں جو زندہ انسانوں کو پہلے چلتی پھرتی لاشوں میں بدلتے ہیں پھر انہیں نوچنے لگتے ہیں۔ یہ ہے سماج؟ کیا سماج ہے یہ! ہر بونے کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے یہاں۔ اور عوام...! وہ کب ہیں انسان... جی رہے ہیں کب...! بس سانس آ جا رہی ہے۔ اس ظالم اور مدقوق نظام ہی نے جیتے جاگتے انسانوں کو مدقوق کر دیا ہے۔ خون تھوک رہے ہیں وہ۔ چلتے پھرتے انسانوں کا قبرستان سوداگروں
نے فروخت کر دیا، سب کچھ بیچ ڈالا ہے۔ ہماری کوئی وقعت نہیں ہے۔ ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مردار ہیں ہم اور مردوں کی کوئی نہیں سنتا۔ کیوں نہیں اس کے محرکات معلوم کرتے... کیوں اس پر نہیں سوچتے... اتنے سارے خودکش بمبار ہم پر اچانک کہاں سے نازل ہو گئے... کیسے؟ بتایئے... ان مبینہ خودکش بمباروں کا راستہ کیوں نہیں روکا گیا؟

اور اب تو وہ ہماری حفاظت کے دعویدار، ہر طرح کے اسلحہ سے لیس خود نشانہ ہیں۔ اب ان کی حفاظت کون کرے! اب حل نکالا بھی تو کیسا... قدرت کے غیبی ہاتھ نے اس دھاگے کا سرا آپ کے ہاتھ میں تھمایا لیکن آپ نے اس جبر کے سامنے ناک رگڑ دی۔ استعماری ایجنٹ ریمنڈ کی دھمکی کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ اس نے پہلے دن ہی دھتکار کر رکھا تھا کہ مجھ پر اتنا پریشر ڈالو جتنا تم برداشت کر سکو، لیکن ہوا کیا؟ تم نے راتوں رات دیت کے کفن میں لپیٹ کر قوم کی غیرت کو دفنا دیا اور ہمارے بنیادی انسانی حقوق بھی فنا کر دیئے۔ بس جبر ہی جبر۔ خون ہی خون۔ انسانوں کا خون ہے یہ... ہر جگہ رائیگاں جانے والا لہو۔ کب بند ہو گی خون کی ہولی؟ کس کی ذمہ داری ہے اسے بند کرنا؟ کون کرے گا یہ... بتایئے؟

بدلو اس ذلیل نظام کو... مدقوق نظام، جبر کا نظام، انسانوں پر قائم درندوں کا نظام، منحوس اور بے برکت نظام۔ ہم آپس میں لڑ لڑ کر مر جائیں گے... یہی تو ان کا مقصد ہے۔ لڑاؤ، الجھاؤ، منتشر کرو، کچھ سوچنے نہ دو، راگ رنگ کی محفلیں دکھاؤ، تھرکتے ہوئے نیم برہنہ جسموں کی کیٹ واک کراؤ۔ الجھائے رکھو انہیں اور مزے اڑاؤ۔

میں آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ کہاں ہیں... ہیں بھی یہاں، یا پھر کہیں اور نکل گئے! سوئے ہوؤں کو جگایا جا سکتا ہے، جو سونے کی اداکاری کرے اسے کون جگا سکتا ہے! جاگنا ہو

تمہیں۔ تمہارا ہے یہ ملک۔ یہ پاک سرزمین تمہاری ہے۔ اور تم اس مٹی کو برباد ہوتا دیکھ رہے ہو، اپنی دھرتی کو اجڑا ہوا دیکھ سکتے ہو تم... تو ضرور دیکھو۔ مگر میں تو اس گناہ کبیرہ میں شامل نہیں ہو سکتا!!!! بس نام رہے گا اللہ کا۔

تیری دنیا کو لگ گئی ہے نظر
اس کا صدقہ اتار دے مولا

بروز سوموار 16 ربیع الثانی 1432ھ 21 مارچ 2011ء

ضمیر فروش

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے غریب اور پسماندہ ممالک کے حکمران، سیاستدان، جرنیل، صحافی، دانشوراور سول سوسائٹی کے علمبردار کیوں سستے داموں بک جاتے ہیں، ان کے ضمیروں کا سودہ مغربی ممالک اورامریکا کے سفارت خانوں میں کن مقاصد کے حصول کیلئے کیا جاتا ہے، ان بکاؤ افراد کا انتخاب کیسے ہوتا ہے اوران ضمیر فروشوں کو کیسے پہچانا جاتا ہے ، ان کی لالچ حرص اور ہوس کو کیسے سہانے خوابوں کے ساتھ سجایا جاتا ہے؟؟؟ پچھلے دنوں وکی لیکس کے انکشافات نے تو صرف دنیا کے اس بازاراور منڈی سے متعارف کروایا ہے جہاں بولیاں لگانے والے، وطن کا سودہ کرنے والے، ننگ دین وننگ ایمان اور ضمیر فروشوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس نے چند حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جسے اس ملک کا ہر باشعور شہری پہلے سے جانتا تھا کہ اس کی قوم کی تقدیر کو کب، کہاں اور کتنے میں بیچا گیااور کس شخص نے اپنی کیا قیمت وصول کی۔ لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ یہ بازار آخر کیوں سجایا جاتا ہے ، ان ضمیر فروشوں کی اس قدر عزت افزائی کیوں کی جاتی ہے؟

اس لئے کہ اس دنیا میں صہیونی سرمایہ دار کارپوریٹ کلچر کی ایک حکومت ہے جس نے امریکا کے ایوانوں سے لیکر دنیا بھر کے میڈیا سمیت سب کو اس خاص مقصد کیلئے خرید رکھا ہے کہ غریب ممالک کے مجبور و مقہور عوام کی جیبوں سے زیادہ زیادہ سرمایہ ان کی جیبوں میں منتقل ہوتا رہے۔ آخری خون کے قطرے تک نچوڑنے والے اس کارپوریٹ کلچر کا کمال یہ ہے کہ وہ پہلے بڑے مغربی ممالک کی قیادت کو سیاسی جماعتوں کی معاشی مدد کے ذریعے خریدتے ہیں پھر ان کے ذریعے دنیا بھر کے غریب ممالک میں ضمیر فروشوں کی حکومتیں قائم کرواتے ہیں۔ انہیں مالیاتی اداروں کے ذریعے قرضوں کے بوجھ میں جکڑتے ہیں اور پھر خود موٹے تازہ مردم خور بھیڑیوں کی طرح روز لوگوں کا خون پی پی کر جوان ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1970ء کے عشرے میں غریب ممالک اپنی تجارت میں امیر ملکوں سے ایک سے ڈیڑھ ارب ڈالر زیادہ کماتے ہیں جسے معاشیات کی زبان میں ٹریڈ سرپلس کہا جاتا ہے۔ اب غریب ممالک کا خسارہ بیس ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر کی چند ملٹی نیشنل کمپنیوں نے غریب ممالک کی اجناس تک کا تیس فیصد حصہ خرید لیا ہے۔ تیل اور معدنیات تو ویسے ہی انہی چند کمپنیوں کے کنٹرول میں ہیں۔

1990ء کے عشرے میں ضمیر فروش قیادتوں کے ذریعے جو نجکاری کی مہم شروع کروائی گئی اس کے نتیجے میں ان غریب ممالک کی دولت اب صرف ایک فیصد دولت مند افراد کے ہاتھ میں آگئی ہے جو جب چاہیں چینی آٹے دال کا بھاؤ مقرر کر دیں۔ ان کمپنیوں نے سب سے پہلے ان ملکوں کو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے مقروض کیا اور پھر ان کو سود کی لعنت میں ایسا پھنسایا کہ 1996ء میں غریب ممالک 6.88 کھرب ڈالر سود دیتے تھے اور 1999ء میں 4.114 کھرب ڈالر ادا کرنے لگے اوراب یہ تعداد دو سو ارب ڈالے سے کہیں زیادہ تجاوز کر چکی ہے۔ اس سود کی ادائیگی کیلئے قوم کے لیڈروں سے یہ کہا جارہا ہے کہ یہ بھی ہمیں بیچو، وہ بھی ہمیں بیچو۔ اپنا مال ہمیں اس بھاؤ پر فروخت کرو اور ہمارا مال اس مہنگے دام پر اپنے عوام کو فروخت کر کے ان کا خون نچوڑو۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں آج پچاس فیصد لوگ روزانہ دو ڈالر یومیہ سے بھی کم آمدن پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ دو ارب لوگوں کے پاس نہ صاف پانی، بجلی، صفائی، اراضی کی ملکیت اور نہ فون ہے۔ حتیٰ کہ ان پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے تو بچانے کیلئے کوئی ادارہ موجود نہیں۔ دنیا میں ہر روز چالیس ہزار بچے بھوک اور بیماری سے مر جاتے ہیں۔ اس کاروباری گورکھ دھندے میں کوئی ایک سو کے قریب بڑے ادارے شامل ہیں جن میں 51 ملٹی نیشنل کارپوریشن ہیں۔ ان میں سے 47 کے ہیڈ کوارٹرز امریکا میں موجود ہیں اور یہ سب امریکا کی دونوں جماعتوں کو کثیر چندہ دیتے ہیں اور امریکی کانگرس کے ذریعے اپنے مفادات کا تحفظ کرواتے ہیں۔ دنیا کا سارا کا سارا میڈیا ان کارپوریشنوں کے اشتہارات اور خفیہ رقوم کا مرہونِ منت ہے۔ یہ اشتہارات بند کر دیں تو میڈیا کا گلہ یوں بند ہو جائے کہ اس کی آواز تک نہ نکل سکے اور آن کی آن میں سارا میڈیا صفحہ ہستی پر گنگ ہو جائے۔ اسی لئے دنیا کے ہر ملک میں امریکی سفیر کسی ملک کے مفاد کا تحفظ نہیں کر رہا ہوتا بلکہ ان ایک سو کے قریب بڑے اداروں کے مفادات کی خاطر کام کرتا ہے جو اس دنیا کا خون چوس رہے ہیں۔

یہ ادارے ہر غریب ممالک کی قیادت کو اپنی طرح کاروباری اداروں میں شریک کرتے ہیں، انہیں مشترکہ فیکٹریوں میں حصے دار بناتے ہیں۔ انہیں غریبوں کو لوٹنے کا گر بتاتے ہیں، یوں یہ ضمیر فروش قائدین اس بڑے کلب کا حصہ بن جاتے ہیں جو اس دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ اپنے ملک کی اجناس کو باہر بھجوائیں گے تاکہ سستی خریدی جائے، وہاں ذخیرہ ہو گی، پھر کئی گنا مہنگی قیمت پر واپس خرید کر لائیں گے۔ ایک ملک سے سستی خریدی گئی گندم یا چینی دوسرے ملک کو مہنگی فروخت کی جائے گی۔ کارپوریٹ کلچر کا کمال یہ ہے کہ اس نے دنیا کے غریب ممالک کی افواج کو کاروبار پر لگا دیا ہے، وہ بھی اپنے اپنے ملک میں ایک کارپوریٹ کمپنی بن گئی ہیں۔ یوں کسی ملک کی فوج بھی اگر کھاد کی فیکٹری چلاتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتی کہ عوام کو کیا فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اس کی سوچ یہ ہو گی کہ کھاد مہنگی بیچ کر مجھے کتنا منافع ملے گا۔

ان تمام کمپنیوں کا طریقہ واردات کمال کا ہے۔ پہلے کسی بھی ملک کی قیادت کو رشوت اور کمیشن کے ذریعے بد دیانت بنایا جاتا ہے اور جب ان کے پاس ناجائز آمدنی کا وافر حصہ جمع ہو جاتا ہے تو انہیں کالے دھن کو سفید کروانے کیلئے کاروبار کروایا جاتا ہے۔ جب وہ منافع خوری اور لوگوں کو لوٹنے کے اس فن کے تمام اصول سیکھ جاتے ہیں تو پہلے اندرونی طور پر بلیک میل کر کے کام نکلوائے جاتے ہیں، وہ یہ کام کرتے رہتے ہیں لیکن جب مطالبات بڑھ جائیں اور یہ ضمیر فروش ذرا ہچکچاہٹ دکھائیں تو ان کے سکینڈل منظر عام پر آنے لگتے ہیں۔ کام چلتا رہے تو ٹھیک وگرنہ انہیں گندے ٹشو پیپرز کی طرح گندگی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ان مطالبات میں سب سے اہم مطالبہ اسلحہ ساز کمپنیوں کا ہوتا ہے کہ جنگ جاری رکھو، اپنے لوگوں کو آپس میں

لڑاؤ۔ کسی دوسرے ملک میں دہشت گردی پھیلاؤ۔ گزشتہ سو سالوں میں دو بڑی اور کئی سو چھوٹی جنگیں لڑی گئیں۔ پہلے جنوبی مشرقی ایشیا میں ،پھر جنوبی امریکا اور اب مسلم ممالک میں۔

دہشت گردی کی جنگ میں ہمارا ساتھ دو، اس جنگ میں وہ ہمارا خون ہی نہیں بلکہ اپنی رعایا کا بھی لہو نچوڑتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے فوجی اخراجات سالانہ ایک کھرب پچاس ارب ڈالر سے کہیں زیادہ تجاوز کر چکے ہیں اور ان میں سے نصف سے زیادہ صرف امریکا کے ہیں، یعنی ہر امریکی مرد، عورت اور بچے کو 1800 ڈالر سے کچھ زیادہ ادا کرنے پڑتے ہیں اور یہ سب رقم ان بڑی بڑی اسلحہ ساز کمپنیوں کے پاس جاتی ہے جو ڈرون بناتی ہیں اور غریب ممالک پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اسلحے کے تاجر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ہی تاجر اسرائیل اور حماس کو، شیعہ اور سنی کو، ہندو اور مسلمان کو اور ترک اور کرد کو اسلحہ بیچتا ہے۔ اسلحہ لوگوں کے گھروں کی دہلیز تک پہنچایا جاتا ہے، اس کو استعمال کرنے کی تربیت مفت فراہم کی جاتی ہے اور پھر ان کی منہ مانگی قیمت وصول کی جاتی ہے اور مستزاد یہ کہ اس ترسیل کو عالمی تحفظ حاصل ہے۔

یہ داستان بہت طویل ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جس نے خوراک میں خود کفیل افریقہ کو قحط میں مبتلا کر دیا ہے اور امن سے رہنے والے ایشیا کو لاکھوں لاشوں کا نذرانہ۔ قارئین اگر آپ کو یاد ہو تو پچھلے دنوں وکی لیکس نے تو ضمیر فروشوں کے صرف نام ظاہر کئے تھے لیکن ضمیر خریدنے والوں کے چہروں پر ابھی تک نقاب پڑا ہوا ہے۔ سارا میڈیا ان کے ہاتھ میں غلام اور ساری سیاسی قیادتیں ان کی زر خرید ہیں۔ اب کس میں ہمت ہے کہ ان چہروں کو بے نقاب کرے اور دنیا کو درپیش تباہی کے سونامی سے محفوظ کر سکے؟ جنوبی ایشیا میں واقع پاکستان کی جغرافیائی حیثیت اور اس کی نیوکلیر طاقت کا حامل ہونا ان بڑے اداروں کو بری طرح کھٹک رہا ہے۔ وہ جان چکے ہیں کہ پاکستان کے مادی وسائل اور اس کے محنتی عوام اس ملک کی تقدیر بدلنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں لیکن یہ ضمیر خریدنے والی قوتوں کو کیسے گوارہ ہے کہ ایسی زرخیز منڈی ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کو مسلسل ایک ایسے مصنوعی عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ہر آنے والا دن گزرے دن سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں نہ صرف غلامی سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے بلکہ ہماری قومی غیرت کی بھی دھجیاں اڑا دی گئیں ہیں۔

اس ملک کو نیوکلیر صلاحیت سے ہمکنار کرنے والے سائنسدانوں سے ان ضمیر فروشوں نے کیا سلوک کیا؟ ڈاکٹر عبدالقدیر کو قومی مجرم بنا کر ٹیلیویژن پر پیش کر کے رسوا کر دیا گیا اور دوسری طرف ملک کے انتہائی نامور سائنسدان بشیر الدین محمود کی ماں نے قوم کے سامنے دہائی دی کہ آئندہ کوئی پاکستانی ماں اپنے بچے کو سائنس کی تعلیم نہ دلوائے۔ ایک نہتی اور بیکس عافیہ صدیقی کو امریکی جیل میں پھینک کر ہم بھول گئے ہیں اور ادھر ہمارے حکمرانوں نے امریکیوں کو انسانی شکار گاہ کی یہ سہولت فراہم کر دی ہے کہ وہ ہمارے شہر کے گلی کوچوں میں ہمارے شہریوں کو دن دیہاڑے سرعام ان کے سروں میں بڑی بے رحمی سے سوراخ کر کے اپنے شکار کی فلم بنائیں اور اس کا معاوضہ ادا کر کے باعزت واپس اپنے ملک میں لوٹ جائیں اور ان کارناموں پر فخر کریں کہ وہ ایک نیوکلیر طاقت کے حامل مسلم ملک پاکستان میں انسانی شکار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قارئین! اگر آپ کو یاد ہو تو چند برس پہلے امریکی اٹارنی جنرل نے بھری عدالت میں یہ کہا تھا کہ پاکستانی چند ہزار ڈالر کے عوض اپنی ماں کو فرخت کر دیتے ہیں۔ اس وقت بھی پاکستان کے غیور عوام ان

ضمیر فروشوں کو نہ پہچان سکی اور کیا اب بھی یہی کیفیت ہے؟؟؟

لکھتے رہے ہم پھر بھی حکائتِ خونچکاں
ہر چند کہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

بروز جمعتہ المبارک 20 ربیع الثانی 1432ھ 25 مارچ 2011ء

دوستی کا حساب

ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بس میں کا چکر۔ دھوکا ہی دھوکا اور خود فریبی۔ دربارِ عالیہ میں مسندِ نشین خوشامد پسند حکمران اور چاپلوس مشیرانِ کرام... راگ رنگ کی محفلیں، نائو نوش کا دور اور عوام کا درد و غم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں! ہو ہی نہیں سکتے۔ نہیں جناب آپ نے بجا ارشاد فرمایا... آپ ہی تو صحیح فرماتے ہیں... آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں آپ کے ارشاداتِ عالیہ۔ دُرنایاب ہیں آپ، نجات دہندہ اور زمین پر خدا کا سایا۔ رحمتِ باری تعالیٰ اور اوتارِ زمانہ ہیں آپ سرکار آپ جئیں ہزاروں سال سدا جئیں کا نعرہ۔ اور خود فریبی میں رچا بسا فریب خوردہ انسان۔ اتنی آوازوں میں کون اپنے آپ میں رہتا ہے۔ جامے سے باہر ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن کون جیا ہے سدا! کوئی بھی نہیں۔ سب کو چلے جانا ہے۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ نہیں بچا کوئی۔ کوئی بھی تو نہیں بچا۔ لیکن کون سمجھائے جب قلب سیاہ ہو کر پتھر بن جائے چاہے دھڑکتا ہی ہو، اس سے کیا ہوتا ہے! ہاں پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔ فریب ہی فریب اور دھوکا ہی دھوکا۔ زمین پر پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتا یہ دھوکا۔

چاہے کچھ کر لیں... ہاں کچھ بھی، نہیں بچ سکا کوئی بھی موت کے منہ سے۔ بے حس و سفاک موت، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ ہاں وہ کسی کی بھی دھمکی نہیں سنتی، کسی کے نام و نسب، منصب و جاگیر سے اجنبی موت۔ لیکن پھر بھی جیئے جیئے سدا جیئے کا خمار۔ ایسا نشہ جو سارے نشے کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کر دے۔ آہ نہیں بچا کوئی۔

آگ و خون کی بارش کرنے والے بھی اور مظلوم، معصوم اور مقہور بھی۔ نہیں کوئی نہیں بچا۔ لیکن پھر سب ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ تب خیال آتا ضرور ہے لیکن ساعت و لمحات بیت چکے ہوتے ہیں، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے، پھر پل کی خبر نہیں ہوتی حالانکہ سامان سو برس کا دھرا ہوتا ہے۔

وہ مجھے اکثر کہتا ہے کو الٹی لائف ہونی چاہیے۔ ہاں وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر چیز وافر اور وقت نپا تلا۔ لیکن کیا یہ ہے کو الٹی لائف! اچھی نوکری کے لیے بہترین تعلیم حاصل کرنا۔ پھر پیسے جمع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا۔ پھر ایک خوب صورت لڑکی سے شادی۔ ایک آسائشوں بھرا گھر اور اس کے لان میں بچھی ہوئی آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے گپ شپ۔

بس یہ ہے آج کی کو الٹی لائف۔ کیا یہی ہے زندگی! میرا ایک دیہاتی دوست بہت ہنستا اور کہتا تھا: کچھ لوگوں کی زندگی پتا ہے کیسی ہوتی ہے؟ میں کہتا نہیں پتا۔ تو کہنے لگتا: ان کی زندگی ہوتی ہے" نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی"۔ کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں... بس میں، میں اور میں کا چکر۔

زندگی موت کی امانت ہے۔ ان کا یہ جملہ ہر وقت میری سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ میں اکثر ان سے ملتا تھا۔ بس ہر وقت ایک ہی بات تھی ان کی ۔ دنیا بھر کی نعمتیں اس پیٹ میں ڈال ، پیٹ کی نہ ماننا یہ کبھی نہیں بھرتا لے، اگر ایک وقت کا فاقہ آ گیا تو ہٹ دھرمی سے کہنے لگتا ہے میں نے تو آج تک کچھ کھایا ہی نہیں۔ پیٹ بھی ایک جہنم ہے۔ کیا تشبیہ ہے یہ۔ زندگی موت کی امانت ہے، مت بھولنا۔

ہم اگر بھول بھی جائیں تب بھی کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔ خود کو فریب دیں گے۔ موت تو ہمیں نہیں بھولتی۔ زندگی کے ساتھ ہم سفر موت، کبھی نہیں مہلت دیتی۔ آ کر رہتی ہے۔

بس ایک فرق ہے۔ کس نے کس طرح موت کا استقبال کیا۔ بس یہ ہے اصل۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا تھا: دیکھ، سامان اول تو ہونا ہی نہیں چاہیے اور اگر ہو بھی تو بس مختصر۔ دیکھ، موت کی گاڑی زندگی کے ساتھ ہی روانہ ہوتی ہے، تجھے کسی اسٹیشن پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کوئی وقت ہی نہیں جو تجھے معلوم ہو۔ لیکن آتی بروقت ہے۔ اس لیے بس چھوٹی سی گٹھڑی سے زیادہ جمع نہ کرنا، موت کی ٹرین آئے تو بس ہنس کھیل کر سوار ہو جانا۔ ہونا تو ہے، تو پھر ہنس کھیل کر کیوں نہیں۔ اور پھر ان کا نعرۂ مستانہ گونجتا" کوئی بھی نہیں بچے گا، آ آ مجھے تو تیار پائے گی"۔ انسان اور بندۂ عاجز لیکن طاقت کے زعم میں لتھڑا ہوا۔ فریب خوردہ سمجھ ہی نہیں پاتا، بس اتنی طاقت کے نشے میں چُور چلا تا رہتا ہے: یہاں سے ماریں گے، وہاں ماریں گے، کوئی نہیں بچے گا، نہیں چھوڑیں گے، بس ماریں گے ہم، ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر آگ و خون کی بارش برستی ہے اور موت کا ہرکارہ پروانۂ اجل تقسیم کرنے لگتے ہے، اور پھر سب رخصت ہو جاتے ہیں، سب نے ہونا ہے رخصت۔

مجھے یاد آیا، اُس کی گردن تن سے جدا کرنے لگے تو پکارنے لگا: رب کعبہ کی قسم، میں تو کامیاب ہو گیا۔ ہاں یہ بھی ایک موت ہے، بارود کی بارش میں معصومیت کا قتل عام۔ کوئی بھی نہیں بچے گا جناب۔ زندگی موت کی امانت ہے اور مہلتِ عمل بہت تھوڑی۔

دنیا دھوکا ہے، سراسر دھوکا۔ کسی کی رہی نہ رہے گی، اپنے اپنے حصے کی آگ اور اپنے اپنے حصے کے پھول لے کر سب چلے جائیں گے۔

بس دیکھ کہیں تُو اپنے لیے آگ ہی آگ تو جمع نہیں کر رہا۔ اس کی ماں نے اس ریگستان کی ٹھنڈ سے بیتاب ہو کر اس سے کہا تھا: جا آگ لا۔ بہت دیر بعد "ماں کہیں سے آگ نہیں ملی" وہ خالی ہاتھ لوٹا اور ماں کے حضور ردست بدستہ عرض گزاری:

تب ماں نے تلخ ہو کر پکارا" جا کر جہنم سے ہی لے آتا۔" تو پھر اپنا سر خم کیا اور عرض کی" ماں وہاں بھی گیا تھا، میں نے وہاں کے نگراں سے کہا مجھے کچھ آگ درکار ہے، تب اس نے مجھے کہا جا اپنا رستہ لے، ہر انسان اپنی آگ دنیا سے خود لے کر یہاں آتا ہے"۔

سنا ہے ارضِ کشمیر کے شکاری نیا جال لیکر آرہے ہیں۔ ابطہ کار سمجھتے ہیں کہ کشمیر کی اٹانومی پر کچھ رعائت دیکر مسئلہ کشمیر کو ختم کر دیا جائے، اس طرح پاکستان کے روشن دماغ اور عالمی برادری کو اپنا ہمنوا بنا کر اس خطے میں امن کی بانسری بجانے کا عمل شروع کیا جائے۔ اطلاع ہے کہ نیشنل کانفرنس والے اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل پر بہت نازاں ہیں حالانکہ ان نادانوں کو اس کی خبر نہیں کہ اس سے کہیں زیادہ اختیارات تو ان کے رہنما شیخ عبد اللہ کے پاس موجود تھے اور ان دنوں کشمیریوں کی قربانیوں کی تاریخ میں ایسے قابل رشک کارنامے ہائے بھی نہیں تھے لیکن کیا کشمیریوں کو مطمئن کیا جا سکا؟ ہر گز نہیں۔ خود شیخ عبد اللہ اپنی معزولی اور گیارہ سال جیل کی زندگی کا ذمہ دار پنڈت نہرو کو قرار دیتے رہے۔

کیا عبرت کیلئے کچھ اور دیکھنا مقصود ہے؟ مسئلہ کشمیر کو جلد یا بدیر حل ہونا ہے بلکہ اب تو اس کے حل کا وقت تو بہت قریب ہے۔ عالمی سامراج اس علاقے سے اپنا بوریا بستر گول کرنے کی مکمل تیاری کر چکے ہیں۔ وہ پتے جن پر بھروسہ تھا وہ اب ہوا دینے لگے ہیں۔ اب تو ان مظالم کا حساب دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ میرا رب ان ظالموں کی رسی کو مزید ڈھیل نہیں دے گا۔ ایک لاکھ سے زائد مظلوم کشمیریوں کی قربانیاں راستہ روک کر کھڑی ہیں۔ حکومت کے مزے تو عارضی ہیں، اس دوستی کا حساب بھی تو آخر دینا ہو گا! مجھے بھی اپنے دس ہفتوں کی غیر حاضری کا حساب دینا ہے۔ ایک ایک لمحہ آپ سب کا یاد کرتا رہا ہوں۔ اسی کا حساب دینے کیلئے آج حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ کو فیصلہ کرنا ہے لیکن ان کو یاددہانی کروادوں جو اقتدار کے نشے میں سب کچھ بھول چکے ہیں!

جناب اب بھی وقت ہے، نہ جانے مہلتِ عمل کب ختم ہو جائے۔ زندگی کی ہمسفر ہے موت۔ نہ جانے کہاں اچک لے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

کبیر سریر سرائے ہے، موت سووت تُو دن رین

بروز بدھ 25 ربیع الثانی 1432ھ 30 مارچ 2011ء

جان غنیمت جانو!

ہاں بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے انسان... بہت کوشش، بہت تگ ودو... کس لیے؟ اس لیے کہ وہ سکون سے رہے، آرام سے رہے، محفوظ رہے۔ ناموری کا خواہش مند ہوتا ہے وہ... واہ، واہ سننا چاہتا ہے داد و تحسین کا طالب اور چہار دانگ عالم میں تشہیر... بس یہی ہے۔

سکون سے رہنا چاہتا ہے اور بے سکون ہوتا رہتا ہے۔ آرام فوم کے گدوں پر سونے سے ملتا نہیں ہے، لاکھ توپ و تفنگ پاس ہو، اپنوں سے بھی ڈرتا رہتا ہے۔ سائے سے بھی ڈر جانے والا۔ ناموری کے شوق میں ایسی ایسی بے ہودہ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں اُس سے کہ بس۔ چہار جانب بچہ جمہورے واہ، واہ تحسین کے لیے نت نئے ڈرامے اور اداکاری... لیکن ذلت لکھ دی جاتی ہے۔ میں غلط کہہ گیا ہوں، اپنی ذلت و کرتے رہتے ہیں اور خلقِ خدا تھو تھو۔ داد و رسوائی کا سامان ساتھ لیے پھرتا ہے وہ۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا گھوڑا اسے اپنے سموں تلے روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔

سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی۔ اپنی انا کے بت پوجنے والا کب کسی کو خاطر میں لاتا ہے! بس ذرا سا اختلاف کیجیے تو چڑھ دوڑتا ہے اپنے لشکر کو لے کر، یہ جانتے بوجھتے بھی کہ لشکروں کو پرندوں کا جھنڈ کنکریاں مار کر کھائے ہوئے بھس میں بدل دیتا ہے۔ عبرت سرائے ہے یہ۔ لیکن نہیں مانتا وہ۔ وہ ناز کرتا ہے اپنے لشکر پر۔ اور دنیائے فانی میں کوئی سدا نہیں جیتا۔ اپنے سینے پر سجے تمغے دیکھ کر نہال ہو جانے والے بھی تنہا اور لاچار ہو جاتے ہیں اس لیے کہ زندگی پر موت کا پہرا ہے اور موت کسی سے خائف نہیں ہوتی۔
ہاں وہ کسی چار دیواری، کسی پناہ گاہ، کسی قلعے، کسی نسب، کسی منصب و جلال، کسی لشکر کو نہیں مانتی، دبوچ لیتی ہے... اور پھر ایسا کہ سامان سو برس کا ہوتا ہے، جو دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جسم کے پنجرے کو توڑ کر موت اچک لیتی ہے اس کی روح۔

موت تو خیر آتی ہے، موت سے پہلے بھی کبھی موت آجاتی ہے۔ وہ موت اور بھی بے حس ہوتی ہے۔ ہاں اُس وقت جب زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دینے لگتی ہے۔ بے کلی، بے چینی، اضطراب، وحشت، تنہائی... کیا یہ سزا کم ہوتی ہے! سب کو تہہ تیغ کر کے آگے بڑھ جانے والا سوچتا رہ جاتا ہے لیکن پھر وقت ہاتھ نہیں آتا۔

انہیں بھی برداشت کرنا پڑتا ہے جنہیں کرپٹ کہتا ہے، نہیں آنے کی دھمکیاں دیتا ہے... اس لیے کہ اپنے رب کا غلام نہیں ہوتا وہ۔ وہ تو طاقتِ عارضی کا ادنیٰ غلام ہوتا ہے، اور جب ارضی خدا اسے کہہ دیں پھر کیا مجال ہوتی ہے کہ انکار کر دیا جائے! ہاں پھر برداشت کرنا پڑتا ہے جناب۔

کشمیر میں جاری آزادی کی لہر نے ایک امید پیدا کر رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھارت اپنے عالمی استعماری دوستوں کے بل بوتے پر بین الاقوامی صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور عالمی استعمار کی پالیسیوں کے باعث اس تحریک کو سرد کرنے کی کوششیں بھی جاری و ساری ہیں لیکن اس کے باوجود معاملات میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہو رہی بلکہ دن بدن حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ امریکا

اوراس کے اتحادیوں کے افغانستان میں داخل ہونے کے بعد پاکستان پر شدید دباؤ کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر متاثر ضرور ہوا ہے لیکن جوں جوں امریکا اوراس کے اتحادی افغانستان میں کمزور ہو رہے ہیں وہ واپسی کی راہ تلاش کرنے میں دن رات کوشاں ہیں، کشمیر کی تحریکِ آزادی چلانے والے مرد، مجاہد سید علی گیلانی اوران کے ہمنواؤں کو پورا یقین ہے کہ افغانستان سے ان بیرونی غاصبوں کی واپسی کے بعد حالات یکسر بدل جائیں گے۔

یہ مفروضہ بھی یقیناغلط ہے کہ تحریکِ آزادی کمزور ہو گئی ہے اوراب رابطہ کاروں کی طے شدہ رپورٹ پر کشمیریوں کو کسی لالی پاپ پر راضی کر لیا جائے گا اور کشمیریوں کی بے پناہ اور بے مثال قربانیوں کو کسی انجانی قبر میں دفن کر دیا جائے گا لیکن اب یہ اس لئے ممکن نہیں کہ "شرائن بورڈ" اور "کشمیر چھوڑدو" کی حالیہ تحریکوں نے عسکری سے زیادہ عوامی رنگ اختیار کیا ہوا ہے۔ پچھلی چھ دہائیوں سے بھارتی جتنا کو بلا کسی ثبوت اور شواہد کے کشمیر میں جاری کسی بھی تحریک آزادی کی پشت پر پاکستان نظر آتا تھا لیکن اب جو تحریک اٹھی ہے اس کے پس پشت پر ماضی کی تحریک اور قربانیوں کے اثرات کو بین الاقوامی طور پر بھی شدت سے تسلیم کیا جارہا ہے اور خود بھارت کے کئی انصاف پسند دانشور کشمیر پر ہونے والے مظالم پر بھرپور نہیں بلکہ کئی گنا مضبوط ہو کر ابھرا ہے۔ اس لئے میرا وجدان اس بات کی گواہی احتجاج کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر کا تحریکی پہلو پہلے سے کمزور دیتا ہے کہ جونہی امریکا اوراس کے اتحادی افغانستان سے نکلیں گے کشمیر کی آزادی کو کوئی روک نہیں سکے گا اوراگر اب اس معاملے کو طاقت کے بل بوتے پر دبانے کی کوئی کوشش کی گئی تو بھارت کو کشمیر کے ساتھ بہت کچھ اور چھوڑنا پڑے گا جو یقینا بہت مہنگا سودہ ہو گا۔

کشمیر کی تحریکِ آزادی کو دبانے کیلئے ایک اور خدشے کا اظہار بھی تواتر کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے دوران مجاہدین، دینی جماعتیں اورامریکا باہمی حلیف تھے مگر جونہی امریکا کے مقاصد حاصل ہوئے وہ حلیف سے حریف بن گیا، اس طرح مجاہدین امریکا کے آلہ کار کے طور استعمال ہوئے اورامریکا اپنے مقاصد حاصل کر کے ان تمام مجاہدین کو تنہا اور پاکستان پر ایک خطرناک بوجھ ڈال کر فرار ہو گیا۔ امریکا کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ اس بات سے باخبر ہیں کہ امریکا اب تک دو درجن سے زائد ملکوں میں جارحیت کا مرتکب ہوا لیکن باوجود دنیا کی سپر پاور ہونے کے اس کو ہر ملک میں عوامی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ امریکا کچھ دیر کیلئے ضرور وہاں اپنے من پسند ایجنٹ حکمرانوں کی مدد سے اپنی مرضی کے احکامات پر تعمیل کرواتا رہا لیکن بالآخر اس کو شدید جانی اور مالی نقصان کے بعد ہزیمت سے دوچار ہو کر نکلنا پڑا بلکہ ویتنام میں تو اس کے فوجیوں نے ہیلی کاپٹر سے لٹک کر راہِ فرار اختیار کیا۔

کئی صاحبِ نظر تو اس بات کی پیش گوئی کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس صدی میں غلبہ عطا فرمانا ہے۔ پندرہویں صدی کے بالکل آغاز ہی میں روس افغانستان آیا تھا جس کی بناء پر افغان جہاد شروع ہو گیا تھا، امریکا کے روس کے خلاف اپنے مفادات تھے اور اس نے اپنے مفادات کے تحت حکومتوں سے ڈیل کی اور افغان جہاد میں اپنے مفادات کی تکمیل میں شامل ہو گیا تھا مگر وہ ایک پہلو تھا لیکن مجاہدین نے جو قربانیاں اخلاص اور جذبے کے تحت دی ہیں انہیں یہ کہنا کہ امریکا استعمال کر گیا..... یہ ایسے چند لوگوں کی سوچ ہے جو اب بھی اپنے مفادات امریکا کی دوستی میں تلاش کرتے ہیں اور وہ اس پہلو کو بھول جاتے ہیں کہ امریکا کے اپنے مفادات ہیں جس کی تکمیل میں وہ کبھی بھی کسی کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا اور یہی وہ تلخ حقیقت ہے۔ کشمیریوں کی قربانیاں بھی ضرور رنگ لائیں گی اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اگر روس اور امریکا جیسی سپر طاقتیں افغانستان میں نہ ٹھہر سکیں تو پھر بھلا بھارت طاقت کے بل بوتے پر کشمیریوں کو کتنی دیر تک دبا سکتا ہے جبکہ وہ خود ان دونوں طاقتوں کے مقابلے میں کہیں کمزور اور ناتواں ہے۔

یہ ہے دنیا جناب! سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ انسان کر ہی کیا سکتا ہے جناب! جو اپنے رب پر بھروسہ کریں انہیں ملتا ہے سکون، انکار کی جرأت اور خوف سے نجات۔ بندہ بشر ہے ہی کیا اپنے سائے سے بھی خوفزدہ۔

جی جناب! وقت کا گھوڑا انہیں اپنے سموں تلے روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر نعرہ بلند ہوتا ہے "دیکھو جو مجھے دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔
کچھ نہیں رہے گا جناب، کچھ بھی نہیں... بس نام رہے گا اللہ کا۔

کہاں سکندر، کہاں ہے دارا، جام کہاں ہے، جم کا
جن کی تیغ سے دیو بھی کانپیں، دل دہلے رستم کا
ان کی راکھ ملے نہ ڈھونڈے، دنیا کا گھر ہے غم کا
ہاشم، جان غنیمت جانو، نہیں بھروسہ دم کا

بروز ہفتہ 28 ربیع الثانی 1432ھ 2 اپریل 2011ء

نئے سپاہی اور امریکا

سلطان اور خان دولت عثمانیہ کا دوسرا تاجدار تھا، اس کے حوصلے اتنے بلند تھے کہ وہ دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھتا تھا لیکن کمزور فوجی قوت اس کے خوابوں کی تعبیر میں رکاوٹ تھی، اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے اس نے ایک عجیب تدبیر اختیار کی۔ 730 ہجری میں اس نے اپنے افسران کو حکم دیا کہ جہاں بھی صحت مند غلام بچے ملیں انہیں خرید لیا جائے اس کے علاوہ جو بھی جنگی قیدی ہوں ان کے صحت مند بچوں کو الگ کر لیا جائے۔ اس کے بعد ان بچوں کو نہایت اعلیٰ رہائش گاہیں فراہم کی گئیں جہاں وہ رہتے اور تعلیم و تربیت پاتے انہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ سلطان کے سب سے وفادار اور باعتماد افراد ہیں اور ان پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے، جب یہ بچے جوان ہوتے تو اعلیٰ عصری تعلیم کے علاوہ بہترین فوجی تعلیم سے بھی آراستہ ہوتے، انہیں دینی تعلیم میں بھی یکتا کیا جاتا، معززین کے طور طریقے سکھائے جاتے اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا جاتا، اس عہد کے مشہور ولی اللہ حاجی یکتاش نے ان سپاہیوں کا نام "نئے سپاہی" رکھا جو بعد میں ینی چری کے نام سے معروف ہوئے۔ غلامی کی بدترین زندگی گزارنے والے بچوں کو جب سلطان نے سب سے بلند مقام دیا تو انہوں نے بھی جانثاری میں کسر نہیں چھوڑی اور سلطنت عثمانیہ کا عروج انہی کی مرہون منت تھا۔ ان نئے سپاہیوں کے کارنامے اور بہادری کی داستانیں اتنی عجیب تھیں کہ افسانوی معلوم ہوتی تھیں۔

اس فوج نے جب سلطنت کے لئے لازوال کارنامے انجام دیئے تو خلیفہ کا اعتماد ان پر بڑھ گیا انہیں ملک میں خصوصی حیثیت حاصل ہو گئی سلطان کی ان پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ ان غلام سپاہیوں کو ملک کی سب سے بہترین رہائش گاہیں فراہم کی جاتیں جہاں یہ اپنے بچوں کے ہمراہ رہتے، اس فوج کے سبکدوش ہونے والے جرنیلوں کو حکومت میں اعلیٰ عہدے دیئے جاتے اور ان کا نام احترام سے لیا جاتا۔ سلطان اور خان کے بعد بھی کئی سلطان گزر گئے اور غلاموں کی اس فوج میں یہ سوچ پنپنے لگی کہ ملک ہماری وجہ سے ہے اگر ہم نہ ہوتے تو ملک بھی نہ ہوتا، قربانی ہم دیتے ہیں اور حکومت سلطان کرتے ہیں، ہماری ذمہ داری ملک کی حفاظت کرنا ہے مگر ہم سے ملک کے کاروبار میں مشورہ نہیں لیا جاتا، فوج کی سرگوشیوں کو سننے کے بعد سلطان وقت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہیں بھی اپنے امور سلطنت میں شامل کرے کیوں کہ قوت واقعی اس فوج کے پاس ہی تھی جب کہ سلطان صرف احکامات دے سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس فوج کا اثر اتنا بڑھا کہ تمام بڑے عہدوں پر ینی چری کے ریٹائرڈ افسران نظر آنے لگے ان کا زور اس قدر بڑھ گیا کہ کوئی ان کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، خود خلافت اور سلطنت ان لوگوں کے قبضے میں تھی جسے چاہتے تخت سے اتار دیتے اور جسے چاہتے بٹھا دیتے، اس دور کے سلاطین و ملوک کی داستانیں بڑی عبرت ناک ہیں، کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ کب اسے گھسیٹ کر تخت سے اتار دیا جائے گا یا اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جو کچھ بھی ہوتا تھا انہی فوجی افسران کی رہائش گاہوں میں ہونے والے فیصلوں کی وجہ سے ہوتا۔

ملک کی حفاظت کے لئے بنائی جانے والی فوج ینی چری جسے کبھی اس قدر عزت حاصل تھی کہ لوگ اس کا نام احترام سے لیتے تھے، اب ذلت، نفرت اور رسوائی کا نشان بن گئی، لوگ انہیں اپنی نجی محفلوں میں "سانپ کے بچوں" کے نام سے پکارتے تھے جنہیں دشمن کے مقابل لانے کے لئے دودھ پلا کر پالا گیا تھا مگر وہ خود اپنے مالک کو ڈسنے لگے تھے، سلطنت عثمانیہ کا یہ دور فتوحات سے خالی نظر آتا ہے کیوں کہ فوج امور سلطنت میں اس قدر مگن تھی کہ اسے جنگی امور کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا، اکثر فوجی اجلاس اس بات پر ہوتے تھے کہ نیا خلیفہ کسے بنایا جائے اور اپنے لئے مزید مراعات کس طرح

حاصل کی جائیں، کسے وزیر لگایا جائے اور کسے وزارت سے ہٹایا جائے، ینی چری کے افسران رعایا سے اس قدر سختی سے پیش آتے تھے کہ کوئی معمولی افسر بھی کسی طرف جا نکلتا تو لوگوں میں سراسیمگی پھیل جاتی۔ آخر کار سلطان محمود خان نامی خلیفہ نے تخت و تاج کو ان سرکش سپاہیوں سے ہمیشہ کے لئے مامون کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے با اعتماد ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ انہیں کس طرح سے اپنے کام تک محدود کیا جائے کہ وہ صرف فوجی امور پر توجہ دیں اور امور سلطنت میں دخل دینا چھوڑ دیں۔

سبھی کا یہ خیال تھا کہ اقتدار کا چسکا ایسا ہے کہ فوج اس سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہو گی، واحد حل یہ ہے کہ فوج کو بھی کسی فارمولے کے تحت اس طرح اقتدار میں شامل کر لیا جائے کہ وہ بے جا مداخلت سے باز آ جائے اور اپنی توجہ اصل فرائض کی طرف بھی دے۔ مگر سلطان محمود خان کا خیال تھا کہ اگر فوج کو امور مملکت میں شامل رکھا گیا تو کبھی بھی بہتری نہیں آئے گی بلکہ مزید ابتری کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ محمود خان بھی سلطان اور خان کی طرح اُلو العزم تھا، جس طرح سے اور خان نے ینی چری قائم کی تھی وہ ان کا استیصال کرنا چاہتا تھا، سب کو یہ یقین تھا کہ فوج کا استیصال تو ناممکن ہے البتہ ایک اور عثمانی خلیفہ فوج کا نشانہ بننے جا رہا ہے مگر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ سلطان محمود خان کامیاب رہا، ینی چری کا بالکل صفایا کر دیا گیا، تمام سرکش افسران کا یا تو قتل کر دیا گیا، یا پھر گرفتار کر لیا گیا، سپاہیوں کو فارغ کر دیا گیا اور وہ پھر سے ذلت بھرغلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ینی چری، جو کبھی عوام کے لئے فخر کی علامت تھی، اس کو تہہ تیغ کئے جانے پر کسی کو افسوس نہ ہوا اور لوگ خوشی مناتے دیکھے گئے جب کہ ملکوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالنے والی وہ فوج جو کبھی اپنے کارناموں کے لئے عالم میں افسانوی شہرت حاصل کر گئی تھی، اپنی بنیاد سے انحراف کے نتیجے میں آسانی سے ایک خلیفہ کے ہاتھوں انجام کو پہنچ گئی۔

حال ہی میں ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ قصرِ سفید نے عرب ممالک میں عدمِ استحکام پیدا کرنے کیلئے 13 کروڑ ڈالر خرچ کئے ہیں اور امریکا کے سابقہ کردار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ چشم کشا رپورٹ قرینِ قیاس اور حقیقت پر مبنی لگتی ہے جس دن سے امریکا کی حکومت میں یہود و ہنود کا اثر و رسوخ بڑھا ہے اسی دن سے ان مذموم طاقتوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے ہر حربہ استعمال کریں اور اس میں یہ تمیز نہیں ہوتی کہ کس قسم کے لوگوں کو نشانہ بنایا جائے۔ مقصد صرف مفادات کا حصول ہوتا ہے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے آج تک امریکا سے تعاون کیا تھا بالآخر اس کے عتاب کا شکار ہو رہے ہیں۔ کئی عرب حکمراں اب بھی امریکا کی آشیر باد پر حکومت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور کئی حکمران ماضی میں امریکی ایجنٹ کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ان میں حسنی مبارک ہوں یا زین العابدین یا قذافی ہوں۔ آج ایک مرتبہ پھر امریکا اپنے ذیلی ادارے اقوام متحدہ کے ذریعے قرارداد منظور کروا کے لیبیا پر چڑھ دوڑا ہے حالانکہ امریکا کو عرب عوام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ صلیبی اتحادی امریکا کی قیادت میں مسلم ممالک کے خلاف اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کیلئے کر رہے ہیں لیکن دوسرے مسلم ممالک نادانستگی میں اس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان صلیبی، ہنود و یہود صہیونی سرپرست طاقتوں کی جانب سے مسلم ریاستوں میں مداخلت کا سلسلہ یہیں پر نہیں رکے گا اور وہ ممالک جو آج امریکا کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں وہ بھی امریکی بد معاشیوں سے محفوظ نہیں رہیں گے۔ ابھی حال ہی میں ایک ہوشربا رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ حالیہ عرب ممالک کی شورش کو سنی شیعہ فساد میں تبدیل کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور اب قصرِ سفید کے مکینوں کے ایماء پر سعودی عرب کی حفاظت کیلئے پاکستانی افواج کے دو ڈویژن فوج کو تیار رہنے کا حکم جاری کر دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں سعودی شہزادے پرنس بندر بن سلطان جو سعودی نیشنل سیکورٹی کونسل کے سیکرٹری جنرل نے اپنے حالیہ دورۂ پاکستان میں پاکستان افواج کے دو ڈویژن کی استدعا کی ہے جو ممکنہ سعودی عرب کی عوامی شورش کو دبانے کیلئے استعمال کی جائے گی۔

یاد رہے اس سے پہلے بحرین کی حکومت کی درخواست پر پاکستان فوجی فاؤنڈیشن نے حال ہی میں ریٹائر ہونے والے ایک ہزار فوجیوں کی بحرین نیشنل گارڈ کیلئے بھرتی شروع کر دی ہے جنہیں ماہانہ ایک لاکھ روپے مشاہرہ کیلئے علاوہ دیگر دوسری مراعات حاصل ہونگی۔ خصوصی طور پر صرف سنی العقیدہ افراد کی بھرتی کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں پاکستانی اخبارات میں اس کی تشہیر بھی کی گئی ہے۔ بحرین خلیج کی واحد ریاست ہے جہاں مشہور زمانہ پانچواں امریکی بیڑہ مستقل طور پر لنگر انداز ہے جہاں سے امریکا اپنے تمام مفادات کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا امریکا پاکستانی افوج کیلئے سلطان محمود کا کردار تو ادا نہیں کر رہا؟؟؟

بروز سوموار 30 ربیع الثانی 1432ھ 4/ اپریل 2011ء

کرکٹ ڈپلومیسی۔لاحاصل مشق

عالمی طاقتیں ایک مرتبہ پھر کرکٹ ڈپلومیسی کی آڑمیں بھارت کے چہرے پر لگے داغوں کو صاف کرنے میں مصروف ہیں۔دراصل بھارت کو کرکٹ ڈپلومیسی کی آڑ میں مزید رعائتیں دلانے کیلئے یہ بساط بچھائی گئی ہے۔اس خطے میں شہنشاہ ایران رضاشاہ پہلوی کے بعد اب تک قصرِ سفید کو اپنا کوئی مستقل ٹھکانہ نصیب نہیں ہو رہا اس لئے وہ اب پوری امیدیں بھارت کے ساتھ لگائے بیٹھے ہیں اوران دنوں من موہن سنگھ عالمی طاقتوں کے منیم (منشی) کا کردار بخوبی نبھارہے ہیں۔پاکستانی حکمران تو پہلے ہی اپنے حصے کا کردار بخوشی ادا کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اسی لئے جونہی بھارتی ہم منصب سے کرکٹ دیکھنے کی دعوت ملی یوسف گیلانی فوری طور پر اپنے منظور شدہ وفد کو ساتھ لیکر موہالی روانہ ہو گئے ۔اس بے ثمر دورے کا آغاز ہی پاکستانیوں کی غیرت پر تازیانے برسا کر یوں کیا گیا کہ وزارتِ داخلہ نے اس دورے کو کامیاب کرنے کروانے کیلئے بڑے فخر کے ساتھ بھارتی جاسوس کی رہائی کی سمری وزیر اعظم ہاؤس کو ارسال کی اوراس سمری کو فوری طور پر ایوان صدر منظوری کیلئے روانہ کر دیا گیااوراس طرح جھٹ پٹ صدر زرداری صاحب نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس خطرناک بھارتی جاسوس کی بقیہ سزا معاف کر کے پاکستان کے ایک اور دشمن کو آزاد کر دیااوراس طرح محب وطن حلقے انگشت بدنداں ہیں کہ پہلے پاکستانی نوجوانوں کو دن دیہاڑے قتل کرنے والے ایک امریکی جاسوس ریمنڈ کو اوراب بھارتی جاسوس کو یکے بعد دیگرے رہا کر کے یہ پیغام دیا جارہا ہے کہ پاکستان ایک انسانی شکار گاہ وچراگاہ ہے جہاں جو چاہے اپنی غنڈہ گردی کر کے واپس اپنے ملک چلا جائے۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے نادانوں کو اس بات کی بھی خبر نہیں کہ ان کے اس مجرمانہ فعل پر جہاں دشمن ایجنسیوں اوراداروں کا مورال اوراعتماد بڑھتا ہے کہ پاکستان میں کسی بھی کاروائی کی انہیں کھلی چھٹی ہے اور کوئی انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا وہاں ہمارے اپنے قانون نافذ کرنے والے اداروں میں سخت بد دلی پھیل رہی ہے کہ جن وطن دشمنوں کو وہ اپنی جان پر کھیل کر گرفتار کرتے ہیں وہ بہر حال آزاد ہو کر ان کی غیرت کو للکارتے ہوئے سینہ پھلائے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے رہا کر دیئے جاتے ہیں۔آخر اس کرکٹ ڈپلومیسی کا کیا ایجنڈہ تھا اوراس ڈپلومیسی سے پاکستان کے حصے میں ماسوائے بزدلی اور رسوائی کے اور کیا حاصل ہوا ہے !وزیر داخلہ عبدالرحمان ملک نہ صرف بھارتی جاسوس کی رہائی کا کریڈٹ لیتے ہوئے بڑا فخر محسوس کر رہے ہیں بلکہ کرکٹ میچ سے تین دن قبل قومی ٹیم کو میچ فکسنگ کے شبہ میں ایک نفسیاتی دباؤ میں مبتلا کر دیتے ہیں اوراس کے ساتھ ہی بھارتی خفیہ ادارے جو ہندو انتہاپسندوں دہشت گردوں کی دھمکیوں سے خوف میں مبتلا تھے ان کی اس طرح مدد کر دی کہ پاکستان سے کچھ طالبان اس کرکٹ میچ کو سبوتاژ کرنے کیلئے موہالی پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مزید برآں بڑے تفاخر سے ایک ایسے فرد کو دہشت گرد قرار دیکر گرفتار کروادیا جس کا تعلق پاکستان سے بھی نہیں تھا۔جو اپنے ملک سے کراچی آیا اور یہاں سے مالدیپ روانہ ہو گیا۔مالدیپ میں گرفتاری کے چند روز بعد سری لنکن حکام نے اسے بیگناہ قرار دیکر رہا کر دیا۔خدانخواستہ اگر اس کرکٹ میچ میں ہندو انتہاپسند اپنی کسی کاروائی میں کامیاب ہو جاتے تو یقیناً بھارت کیلئے پاکستان پر سارا الزام لگانا بہت آسان ہو جاتا جیسا کہ اس سے پہلے سمجھوتا ایکسپریس اور دیگر دہشت گردی کے واقعات میں ہو چکا ہے۔آخر یہ موصوف کس ملک کے وزیر داخلہ ہیں اوراپنی ان حرکات سے کس ملک کی مدد اور خدمت کر رہے ہیں۔اب تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی ے کہ موصوف مستقبل میں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کے حصول کیلئے امریکا کی

نظروں میں مقبولیت حاصل کرنے کیلئے ایسے کارنامے سر انجام دے رہے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک بھارتی مسلمان عالم سے بھی رجوع کیا تھا جو ان دنوں امریکی رابطہ کار کا کردار سر انجام دے رہے ہیں۔ دراصل ایسے من گھڑت واقعات کو پھیلا کر کرکٹ ڈپلومیسی میں پنہاں اس سازش کو چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے جس کیلئے یہ سارا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔

اس حوالے سے وزارتِ داخلہ کے بعض ذمہ دار ماہرین نے اس خفیہ ایجنڈے کا انکشاف کیا ہے کہ یہ امریکی اور بھارتی خواہش اور مفادات کے حصول کیلئے کرکٹ ڈپلومیسی کی بساط بچھائی گئی تھی۔ کیونکہ امریکا جولائی میں افغانستان کے کمبل سے جان چھڑا کر راہِ فرار اختیار کر رہا ہے اور یہود و ہنود گروپ جو قصر سفید میں موثر انداز میں کام کر رہا ہے، وہ افغانستان میں امریکی شکست کا ذمہ دار پاکستانی افواج کو قرار دے رہا ہے اور وہ ہر حال میں پاکستان کو کسی بڑے نقصان سے دوچار کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے اور امریکا کے اگلے
الیکشن کیلئے اپنی شکست کو چھپانے کیلئے امریکی عوام کے سامنے اپنی خفت مٹانے کیلئے اس کو استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ ان قوتوں کی شدید خواہش ہے کہ امریکا اس خطے میں
پھنسا رہے اور اگر یہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تو کم از کم پاکستان کی نیوکلیر طاقت کو ہر حال میں ختم کر دیا جائے۔

حالیہ عراق اور افغانستان میں امریکی جارحیت کو بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ افغانستان سے رخصت ہوتے وقت نفرت کی تمام فیکٹریاں بھارت کے سپرد کر کے جائے تاکہ اس خطے میں جنگ کے شعلے مسلسل بھڑکتے رہیں اور اس کی اسلحہ ساز کمپنیوں کا کاروبار جاری و ساری رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے برس امریکی سیکرٹری خارجہ ہلیری کلنٹن نے بڑی کاوشوں کے بعد بھارت کو افغانستان کیلئے پاکستانی سرزمین سے تجارتی راہداری کا پروانہ جاری کروایا ہے اور اس اہم تجارتی راہداری کے حصول کے وقت مسئلہ کشمیر، بلوچستان میں بھارتی دہشت گردی 'بھارت کی آبی دہشت گردی کو بری طرح نظر انداز کیا گیا اور حد تو یہ ہے کہ سمجھوتا ایکسپریس میں ہونے والی دہشت گردی کا بھی سرے سے کوئی ذکر نہیں کیا گیا، البتہ ممبئی واقعے کی بازگشت اور دیگر امور و تجارتی مفاد کو اولین ترجیح دی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممبئی واقعہ کے رونما ہونے کے فوری بعد پاکستانی حکومت نے اپنے ہی ملک کی مشہور زمانہ خدمتِ خلق کا کام کرنے والی جماعت الدعوہ اور اس کے سربراہ حافظ سعید کو نہ صرف پابند سلاسل کر دیا بلکہ اقوام متحدہ سے اس پر پابندی لگوانے کیلئے پاکستان کے دیرینہ مخلص دوست چین کو بھی اس پابندی کے خلاف ویٹو کرنے سے گریز کی باقاعدہ درخواست کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی کرکٹ ڈپلومیسی پر جانے سے

پہلے کابینہ کے اجلاس کے بعد میڈیا کو بریفنگ دیتے ہوئے وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان نے کہا کہ " ایجنڈے پر کشمیر نہیں ہے "اور ہمارے وزیر اعظم نے بھی یہ فرمایا کہ "پاک بھارت مذاکرات میں کسی تیسرے فریق کی ضرورت نہیں"۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس کرکٹ ڈپلومیسی کے ایجنڈے میں پاکستان کے مفاد کا ایک بھی مسئلہ نہیں تو اس بے نتیجہ مذاکرات کا ڈول کیوں ڈالا گیا؟ اصل معاملہ یہ ہے کہ کرکٹ ڈپلومیسی کی آڑ میں ایک مرتبہ پھر بھارت کو مراعات دلونے کا ایک جامع منصوبہ امریکی ساتھ لائے ہیں اور پاکستانی وزیر اعظم کو اس میں استعمال کیا جارہا ہے۔ مستقبل میں کشمیر کے مسئلے پر سید علی گیلانی کو تنہا کر کے حریت کانفرنس میں بھی دراڑیں ڈالنے کے ایک خطرناک منصوبے پر عملدرآمد مقصود ہے۔

کرکٹ ڈپلومیسی کا آغاز 1977ء میں اس وقت ہوا تھا جب بھارتی کرکٹ ٹیم 1971 کی جنگ کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان آئی اور اس کے بعد 1987ء میں جنرل ضیاء الحق بھارتی فوجوں کی طرف سے پاکستانی سرحدوں پر اجتماع کے موقع پر جے پور میچ دیکھنے گئے۔ وہاں مبینہ طور پر بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے کان میں صرف ایک جملہ کہا تھا کہ پاکستان ایٹمی ٹیکنالوجی میں کسی سے پیچھے نہیں اور وقت آنے پر اس کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ ضیاء الحق کی وطن واپسی سے قبل ہی بھارتی افواج کی واپسی کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ ضیاء الحق نے تو بھارت کو یہ پیغام بھی دیا تھا کہ "کابل کا راستہ اگر درکار ہے تو وہ سرینگر سے ہو کر گزرتا ہے اور اگر تم پانی بند کروگے تو ہمیں کھولنا بھی آتا ہے ۔" کیا موجودہ حکومت نے حالیہ کرکٹ ڈپلومیسی میں کوئی ایسا پیغام بھارت کو پہنچایا؟ یقیناً امریکی دباؤ میں قائم ہونے والی پاکستانی حکومت ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پاک بھارت سیکرٹری خارجہ سطح ملاقات میں ان ایشو پر کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا پھر بھلا پاک بھارت سربراہ ملاقات میں اس کا تذکرہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضیاء الحق کی کرکٹ ڈپلومیسی سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس کرکٹ ڈپلومیسی کے پیچھے دراصل دوسرے عوامل کار فرما تھے۔ امریکا کی خواہش ہے کہ بھارت کو کسی بڑا کردار سونپنے سے پہلے اس کو دوسری عالمی طاقتوں کی آشیر باد بھی حاصل ہو جائے۔ اس کیلئے سب سے پہلے بھارت کے پڑوسیوں کی طرف سے "تنہائی" کی شکائت کو دور کیا جائے۔ ذرائع کے مطابق چین کی طرف سے چھتیس گڑھ کی سرحد پر
جارحانہ طرز، عمل اور اب نیپال سے دوٹوک تعلقات دراصل بھارت اور امریکا کیلئے ایک اہم پیغام ہے جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر پاکستان کو مصروف رکھنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف امریکی دہشت گرد ریمنڈ کی رہائی کے باوجود پاکستان کے فوجی اور انٹیلی جنس کی سطح پر امریکا کے تعلقات میں رخنہ پڑ گیا ہے لہذا قصر سفید اس تاثر کو زائل کرنے کیلئے پاکستان کو خوش کرنے کی خاطر پاک بھارت مذاکرات کو بحال کروانا چاہتا ہے مگر ایک سابق سیکرٹری خارجہ کے بقول صورتِ حال اور امریکی دباؤ کے باوجود بھارت اب بھی
کمپوزٹ ڈائیلاگ راہِ فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جہاں تنازعات حل کے قریب تھے جبکہ اب بھارت مزید وقت حاصل کرنے کیلئے مذاکرات کو دوبارہ صفر سے شروع
کرنا چاہتا ہے لیکن اس کرکٹ ڈپلومیسی کے مذاکرات سے عالمی طاقتوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اس خطے میں بھارت امن کیلئے بہت مخلص ہے۔

ذرائع کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان ٹریک ٹو ڈپلومیسی ایک عرصے سے چل رہی ہے جس کے تحت دونوں ملکوں کے ریٹائرڈ حضرات بات چیت کو آگے بڑھارہے ہیں۔اس
سلسلے میں بھارتی وفد میں میجر جنرل دیپانکر بینرجی،ائروائس مارشل کپل کاک،بریگیڈئر گورمیت کندل،بریگیڈئر ارون سمگل،پی آر چنزی،ڈاکٹر ڈیوصوبا عرف چندن،سابق سیکرٹری خارجہ کے سی سنگھ،وریندر سنگھ اور ملیکا یوسف شامل ہیں جبکہ پاکستانی وفد میں ریاض کھوکھر،ہمایوں خان،جنرل جہانگیر کرامت،نجم الدین شیخ،ہود بھائی،الٰہی بخش رئیس اور عزیز خان شامل ہیں۔دونوں وفود بنکاک میں جنوری میں مذاکرات کے چھ دور کر چکے ہیں مگر ابھی تک کسی ایک معاملے پر بھی اتفاق نہیں ہو سکا۔ٹریک ٹو میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بھارت مذاکرات نہیں چاہتا مگر عالمی طاقتوں کو خوش رکھنے کیلئے مذاکرات میں مصروف دکھائی دینا چاہتا ہے۔لہٰذا اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ کرکٹ ڈپلومیسی محض ایک لاحاصل مشق اور تفریح سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

بروز بدھ 2 جمادی الاوّل 1432ھ / 6 اپریل 2011ء

منافقت کے نصاب

پچھلی چھ دہائیوں سے زائد کشمیری عالمی ضمیر کو جگانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ پچھلے دو عشروں سے آزادی کی تحریک میں ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں نے اپنی جان کی قربانی دیکر آزادی حاصل کرنے کا عزم پوری آب و تاب سے جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ بھارتی ظلم و ستم اور جبری تسلط کے خلاف کچھ دیر کیلئے یہ تحریک مسلح جدوجہد کی صورت میں بھی جاری رہی لیکن اب تک بھارت نے کشمیر میں ظلم و ستم کا وہ بازار گرم کر رکھا ہے جس سے پوری مہذب دنیا بھی آگاہ ہے لیکن اب تک کسی بھی عالمی ادارے کو بھارت کو اس بہیمانہ ظلم و ستم روکنے کیلئے کوئی خاطر خواہ اقدامات اٹھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر کسی انسانی ہمدردی کے ادارے نے کشمیر کے معاملے میں کسی دلچسپی کا اظہار بھی کیا تو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا نعرہ لگانے والی بھارتی سرکار نے کشمیر تک رسائی دینے سے صاف انکار کر دیا لیکن اس کے باوجود کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کی داستانیں اکثر عالمی ضمیر کو جھنجھوڑتی رہتی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے بعض مشروط پابندیوں کے ساتھ بھارت نے یورپی یونین کے ایک وفد کو بھولے سے کشمیر جانے کی اجازت دیدی تو اس وفد نے محدود وقت اور بے شمار پابندیوں کے باوجود جو 70 صفحات پر مشتمل ایک چشم کشا رپورٹ مرتب کی اس کا حاصل اک جملہ یہ بھی تھا کہ "کشمیر دنیا کی خوبصورت ترین جیل ہے"۔ گزشتہ سال 18 سے 24 مئی تک ایمنسٹی انٹرنیشنل کے چار رکنی وفد نے بکرم جیت باترا کی سربراہی میں وادی کے سیاسی، غیر سیاسی اور سول سوسائٹی کے کئی افراد سے ملاقاتیں کرنے کے علاوہ کئی دوسرے آزاد ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔ اس رپورٹ کے باضابطہ اجراء کیلئے ایمنسٹی کے اس وفد نے دوبارہ سرینگر کا دورہ کیا اور اپنی پریس کانفرنس میں اس رپورٹ کو ایک کتابی شکل میں کشمیری عوام اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔

حریت کانفرنس کے دونوں دھڑوں کے لیڈروں جناب سید علی گیلانی۔ میر واعظ عمر فاروق کے علاوہ دیگر کشمیری لیڈروں شبیر احمد شاہ' لبریشن فرنٹ کے ملک یاسین اور نعیم خان نے اس رپورٹ کا زبردست خیر مقدم کرتے ہوئے عالمی برادری کو اس کا نوٹس لینے کی اپیل بھی کی۔ اس رپورٹ کے حقائق کو کشمیر کے وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ بھی جھٹلانے کی ہمت نہ کر سکے اور کچھ تحفظات کے ساتھ اس رپورٹ کی روشنی میں کچھ اصلاحی اقدامات اٹھانے اور اس کو ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکنے کا سیاسی وعدہ کئے بغیر نہ رہ سکے لیکن "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا" کے مصداق اب تک اس پر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

اس 70 صفحات کی رپورٹ میں کشمیریوں کی حالِ زار کا جو نوحہ بیان کیا گیا ہے اس میں سرِ فہرست "پبلک سیفٹی ایکٹ" جیسے ظالمانہ قانون کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے جس کو خود بھارتی سپریم کورٹ کالا قانون قرار دے چکی ہے۔ اس رپورٹ میں بھارتی حکومت کے ساتھ عدلیہ کو بھی برابر کا قصوروار اور شریک مجرم قرار دیا گیا ہے۔ انہی ظالمانہ قوانین کی بناء پر حکومت عدلیہ کے کسی بھی فیصلے اور کسی بھی حکم کو نہ صرف نظر انداز کر دیتی ہے بلکہ بعض معاملات میں عدلیہ کے فیصلوں کی کھلم کھلا دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اور کئی مقدمات میں عدلیہ کو ناکامی

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زمینی حقائق تو یہ ہیں کہ سیکورٹی وانٹیلی جنس ادارے اور پولیس خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہوئے عدلیہ کے فیصلوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اوران کے جاری مظالم کو روکنے والا کوئی ایسا آہنی ہاتھ موجود نہیں جو ان کو کشمیری عوام پر غیر قانونی ظلم وستم روا رکھنے سے روک سکے۔

پبلک سیفٹی ایکٹ جو کہ بین الاقوامی قانون کی صریحاً خلاف ورزی ہے اور خود بھارت کی اعلیٰ عدالتیں بھی اس کو کالا قانون قرار دے چکی ہیں لیکن اس کے باوجود اس قانون کا بے ہنگم استعمال ہو رہا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون معصوم بچوں پر ظلم وستم روا رکھنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن کشمیر میں ہزاروں نابالغ بچے اس کالے قانون کے تحت نظر بند کر دیئے گئے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی اس رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے کہ اس کالے قانون کے نام پر لاقانونیت کا بازار گرم ہے۔ اس رپورٹ کی تیاری کیلئے صرف پچھلے سات سالوں 2003ء سے لیکر 2010ء تک کے ان مقدمات کا جائزہ لیا گیا جو اس کالے قانون کے تحت درج کئے گئے۔ اس تحقیق سے پتہ چلا کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے ظالمانہ قانون کے تحت انسانی حقوق کی زبردست پامالی کی گئی اور اس عرصے میں اس وحشیانہ قانون کے تحت آٹھ ہزار سے زائد لوگوں کو قید کیا گیا جبکہ صرف جنوری 2010ء سے لیکر 31 دسمبر 2010ء کے آخر تک 322 افراد کو گرفتار کر کے بے پناہ اذیتوں سے دوچار کیا گیا۔ اس رپورٹ میں مزید یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ اس انسانیت سوز قانون کے تحت جن افراد کو گرفتار کیا جاتا ہے، انہیں نہ تو فوری طور پر گرفتاری کی وجوہات سے آگاہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان کو اپنی صفائی کیلئے کسی قانونی امداد کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ ایک طرف تو ریاست کے عسکری ادارے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اب وادی میں صرف پانچ سو جنگجو سرگرم ہیں اور دوسری طرف دس لاکھ فوج کے علاوہ سیکورٹی اور انٹیلی ایجنسیوں اداروں کی بھرمار نے ہر کشمیری مرد وزن اور بچوں کو دنیا کی اس خوبصورت جیل میں ہراساں کرنے کا کام جاری رکھا ہوا ہے۔ اس قانون کے تحت جہاں آزادی پسند قیادت کی پہلی اور دوسری صف کے رہنماؤں کو جیل میں رکھ کر ان کی آواز کو دبانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے وہاں مجبور و مقہور بوڑھے مرد وزن اور بچے بھی اس قانون کی دسترس سے محفوظ نہیں۔ اپنے بنیادی انسانی حقوق کا مطالبہ کرنے والے مظاہرین کو بھی اسی غیر قانونی قانون کے تحت انتقام کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

اس رپورٹ میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دم بھرنے والی بھارتی سرکار کے چہرے سے یہ نقاب بھی اٹھایا گیا ہے کہ کشمیر میں حکومتی ادارے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار افراد کو عدالت میں مجرم ثابت کرنے اور انہیں سزا دلوانے کی بجائے ان بے گناہ افراد کو جیلوں میں بند رکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور ان مبینہ قوانین کے تحت متوازی ظالمانہ فوجداری نظام چلایا جا رہا ہے۔ رپورٹ میں اس ظالمانہ قانون، انتظامی حراست کو فوری منسوخ کرنے، نظر بندوں پر فوری باقاعدہ فردِ جرم عائد کرنے، مجسٹریٹ کے سامنے فوری پیشی کو یقینی بنانے، اسیروں کیلئے قانونی مشورے، طبی معائنے کی سہولت اور عزیز و اقارب کے ساتھ رابطے میں سہولت کی فراہمی کو یقینی بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں کئی اور سفارشات کو بھی شامل

کیا گیا جس میں بھارتی حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ بین الاقوامی قانون کے تحت اقوام متحدہ کے خصوصی اداروں کی رسائی کو یقینی بنایا جائے اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں کی رپورٹس برائے ایذا رسانی اور ورکنگ گروپ برائے غیر قانونی گرفتاری کی سفارشات کا بھی فوری جائزہ لیا جائے۔

دوسری طرف بھارت نے کشمیر میں جہاں مزید دو لاکھ فوج کا اضافہ کر دیا ہے وہاں بھارتی فوجیوں کو کشمیری زبان سکھانے کا عمل محض اس لئے شروع کر دیا گیا ہے کہ ڈوگرہ سرٹیفکیٹ کے تحت ان کو کشمیری شہریت دیکر وادی میں آبادی کا توازن تبدیل کر کے مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ وادی کو مستقل طور پر مذہبی بنیاد پر تقسیم کر دیا جائے اور مستقبل میں اس تقسیم سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کو قانونی طور پر بھارت کا حصہ قرار دینے میں کوئی مشکل باقی نہ رہے، لیکن سازشی عناصر کبھی بھی اپنے اس پروگرام میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ کیا وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ یک لاکھ جانوں کی قربانی کے بعد بھی کشمیریوں کے عزم میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی وہ بھلا اس سازش کو کیسے کامیاب ہونے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کل جماعتی کانفرنس کے رہنما جناب سید علی گیلانی اور دیگر رہنماؤں نے ایسے کسی بھی منصوبے کی بھرپور مزاحمت کا اعلان کیا ہے اور دنیا بھر میں بسنے والے کشمیریوں نے اظہارِ یکجہتی کیلئے اس غیر قانونی سازش کے خلاف سخت ردعمل کا اعلان بھی کیا ہے۔

منافقت کے نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستانِ گلاب لکھنا

بروز ہفتہ 5 جمادی الاوّل 1432ھ 9/ اپریل 2011ء

موہن لال سے من موہن سنگھ تک؟

تقریباً دو صدیاں پہلے کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کچھ ہندو پنڈتوں نے مستقل رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت کشمیری مسلمانوں نے اپنے حسن سلوک سے ان کو صدقِ دل سے خوش آمدید کہا اور اس طرح آہستہ آہستہ مزید ہندو افراد بھارت سے کشمیر میں پہنچنا شروع ہو گئے اور اس طرح یہ تمام ہندو افراد کشمیری پنڈت کے نام سے بلائے جانے لگے۔ بدھ سنگھ جو ایک لٹا پٹا جاگیر دار تھا اس نے بھی اپنے کنبے کے کچھ افراد کے ساتھ کشمیر میں پناہ لی۔ ابھی وہ جوان ہی تھا کہ اس نے ایک انگریز افسر مانسٹوٹ کے پاس ملازمت حاصل کر لی اور پھر اس کے ساتھ ہی دلی منتقل ہو گیا۔ دورانِ ملازمت دلی قیام کے دوران 1812ء میں اس کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام اس نے موہن لال رکھا۔ بدھ سنگھ ایک جہاں دیدہ شخص تھا لہٰذا جب 1828ء میں انگریز نے فارسی کالج دلی میں انگریزی کی کلاسیں شروع کیں تو بدھ سنگھ نے اپنے بیٹے موہن لال کو وہاں داخلہ دلا دیا جہاں موہن لال کے نام کے ساتھ کاشمیری کا اضافہ کر دیا گیا۔

یوں موہن لال کاشمیری ہندوستان کے ان چھ نوجوانوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے انگریز راج کے شروع میں انگریزی سیکھ لی۔ 1831ء کو وہ فاتح افغانستان سر الیگزانڈر برنس کے پاس ملازم ہو گیا۔ موہن لال فارسی اور انگریزی زبان بولنے اور لکھنے میں کافی ماہر ہو گیا تھا لہٰذا اسے شروع میں بخارا کی مہم سونپی گئی۔ وہ برنس کے ساتھ دہلی سے نکلا اور لدھیانہ، پانی پت، کرنال، لاہور، پنڈ دادن خان، جلالپور، راولپنڈی، پشاور، کابل اور بامیان سے ہوتا ہوا بخارا پہنچا۔ برنس اور اس کے انگریز ساتھی جیرارڈ مقامی لوگوں کی بھیس میں اس کے ساتھ تھے۔ اس مہم کا مقصد افغانستان کی دفاعی پوزیشن کا جائزہ لینا تھا۔ موہن لال کاشمیری سفر کے دوران ڈائری لکھتا رہا جو مختلف ذریعوں سے انگریز سرکار تک پہنچتی رہی۔ موہن لال 1834ء کو واپس پہنچا، انگریز سرکار نے اس کی خدمات کے عوض اسے قندھار میں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ لگا دیا۔

1838ء کو انگریز نے افغانستان پر قبضے کا فیصلہ کیا، موہن لال کو اس مہم کا ،، گائیڈ،، مقرر کر دیا گیا۔ موہن لال برنس کے ساتھ نکلا اور انگریز فوج کو سیدھا کابل لے گیا۔ افغانوں سے جنگ ہوئی، افغان ہار گئے کیونکہ موہن لال اس سے پہلے بہت سے غیر مسلم افغانیوں کو مال و دولت سے انگریز سرکار کی حمائت کیلئے خرید چکا تھا۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا اور اس کی آڑ میں افغانستان پر حکومت کرنے لگے۔ موہن لال اس سارے دور میں انگریزوں کے مفادات کیلئے کام کرتا رہا۔ موہن لال کو قدرت نے سازش، مکر و فریب اور جوڑ توڑ کی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مقامی لوگوں میں رچ بس جاتا تھا اور پھر ان کی جڑیں کاٹ کر اپنے آقا انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ موہن لال 1877ء تک زندہ رہا، اپنی باسٹھ سالہ زندگی میں اس نے برطانیہ کا سفر بھی کیا، آخری عمر میں اس نے دو سفر نامے بھی لکھے جو کسی ہندوستانی باشندے کی انگریزی زبان میں پہلی کتابیں تھیں۔

یہ کتابیں بد قسمتی سے شہرت نہ پا سکیں۔ 1930ء کے آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو لندن کے ایک کباڑیئے کی دوکان پر کسی کام سے گئے تو وہاں انہوں نے ان کتابوں کو خرید لیا۔ ان کتابوں کا جب مطالعہ کیا تو موہن لال کے مشاہدات اور زبان دانی پر حیران ہو گئے۔ نہرو کی تحریک پر بعد ازاں ہری رام گپتا نے موہن لال پر پی ایچ ڈی کی۔ گپتا کا مقالہ 1943ء میں شائع ہوا، اس کا دیباچہ خود نہرو نے لکھا لیکن بد قسمتی سے یہ مقالہ بھی کوئی

شہرت نہ حاصل کر سکا۔ ساٹھ برس بعد یعنی 2003ء میں یہ ایک بار پھر شائع ہوا، اس مرتبہ اس نے تہلکہ مچادیا، دنیا موہن لال کاشمیری کے مشاہدات پر حیران رہ گئی۔

موہن لال 1838ء سے 1841ء تک کابل رہا تھا، اس نے انگریزوں کی حکومت بنتے اور پھر بگڑتے دیکھی تھی، وہ افغانوں کا مزاج شناس بھی تھا لہٰذا جب اس نے کابل میں انگریزوں کے زوال کی داستان لکھی تو کمال کر دیا۔ اس نے لکھا افغان سب کچھ سہہ جاتے ہیں لیکن وہ بیرونی طاقتوں کو برداشت نہیں کرتے۔ افغان شراب اور جنسی بے راہروی کے ساتھ بھی سمجھوتا نہیں کرتے ۔ انگریز اقتدار پر قابض ہوئے تو انہوں نے افغانوں کے مزاج کو فراموش کر دیا، انہوں نے سارے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لئے، بادشاہ محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ کابل میں شراب خانے کھولے گئے اور انگریز فوج نے سرِعام شراب نوشی شروع کر دی۔ انگریزوں نے بڑے بڑے مکانات اور باغات پر قبضہ کر لیا، وہ وہاں گھڑ دوڑ، کرکٹ اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وہ سردیوں میں کابل میں اسکیٹنگ بھی کرتے تھے، شہر بھر میں قحبہ خانے کھل گئے، انگریز فوجیوں کی دست درازیاں شرفاء کے گھروں تک پہنچ گئیں۔ انگریز افسر اور اہلکار سرداروں کی بہو بیٹیاں اٹھالاتے اور اس زیادتی پر حکومت خاموش رہتی۔ انگریزوں نے شہر کے تمام اچھے مکانات ہتھیا لئے یا پھر کرائے پر حاصل کر لئے۔ اناج، گھاس، گوشت اور سبزیاں بھی انگریز خرید لیتے تھے جس کے نتیجے میں افغانستان قلت اور مہنگائی کا شکار ہو گیا۔ افغان تین برس تک یہ ظلم سہتے رہے یہاں تک کہ 1841ء ستمبر آن پہنچا۔ تمام افغان سرداروں نے قرآن پر حلف لیتے ہوئے ایک معاہدے پر دستخط کئے اور اس کے بعد انگریزوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا ۔ برنس کو اس کے گھر کے سب سے بڑے دروازے پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ یہ بغاوت 7 جنوری 1842ء تک جاری رہی۔ تنگ آکر میجر پاٹنجر نے افغانستان چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ انگریز فوج کابل سے نکلی لیکن افغانوں نے اسے راستے میں گھیر کر بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس جنگ میں بیس ہزار انگریز مارے گئے، صرف ڈاکٹر برائیڈن بچا جو زندگی بھر افغانوں کی بربریت کی داستانیں سناتا رہا۔ موہن لال بھی اس جنگ میں گرفتار ہوا لیکن اس نے انگریزوں کے تمام خفیہ راز اگل دیئے اور بڑی مشکل سے رہائی پائی۔

مجھے گزشتہ دنوں میرے ایک مربی نے ان کشمیری پنڈتوں کی تاریخ پڑھنے کو کہا تو میرے ہاتھ موہن لال کاشمیری کی آپ بیتی، گلوب اینڈ میل کی ایک پرانی رپورٹ اور کرسٹینا لیمب کا ۲۰۰٤ء میں لکھا ہوا کالم اکٹھے پڑھنے کا اتفاق ہوا، گلوب اینڈ میل نے انکشاف کیا،، کابل شہر گناہوں کی دلدل بن چکا ہے، شہر میں جسم فروشی کے سینکڑوں مراکز کھل چکے ہیں، وزیر اکبر خان اور شہر نو کے جدید علاقوں میں درجنوں نائٹ کلب ہیں۔ افغان قانون کے مطابق شراب نوشی جرم ہے لیکن شہر میں شراب عام ہے۔،، کرسٹینا لیمب نیویارک ٹائمز میں اپنے کالم میں لکھتی ہیں کہ "کابل شہر میں ایک سابق افغان عمر نے دو لاکھ ڈالر سے "پی کاک" کے نام سے ریستوران کھولا جس کا سوئمنگ پول مارٹینی شراب کے گلاس کی مانند ہے، اس ریستوران میں شراب کے ساتھ حرام گوشت بھی ملتا ہے، پی کاک کے علاوہ وہاں برطانیہ کے دو باشندوں نے ایلبو روم کے نام سے کاک ٹیل بار اور تھائی ریستوران بھی

کھولا ہے۔ پورے شہر میں شراب اور عورت عام ہے جسے افغان پسندیدگی سے نہیں دیکھ رہے، حالت یہ ہے طالبان کے مخالف بھی آج ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، کیا امریکا نے یہ جنگ اس لئے لڑی تھی کہ وہ یہاں شراب خانے، ریستوران اور رقص گاہیں تعمیر کر سکے"۔

میں نے موہن لال کی آب بیتی کو ایک طرف رکھا اور ٹھنڈا سانس بھر کر سوچا،، کیا 1841ء اور 2010ء میں کوئی فرق ہے؟،، کرسٹینا لیمب کے اسی کالم کے آخر میں اس کا جواب مل جاتا ہے کہ "ہاں ہے، 1841ء میں افغانستان میں انگریز تھا اور آج وہاں امریکی ہیں"۔ میں نے سوچا" کیا تاریخ خود کو دہرائے گی؟" تو اس کے جواب میں کرسٹینا لیمب یوں جواب دیتی ہے کہ "ہاں جلد ہی کیونکہ غلطیوں کے بیج سے ہمیشہ غلطیوں کے پودے نکلتے ہیں"۔ میرا وجدان مجھے فوری طور پر اس طرف لے گیا کہ چند سال پہلے جب کشمیر کی تحریک آزادی نے بہت زور پکڑا تو بھارتی خفیہ ایجنسی کشمیر کی تحریک آزادی کو بدنام کرنے کیلئے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی۔ امریکی صدر کلنٹن کے بھارتی دورے کے دران بھارتی فوج کے خفیہ ادارے "را" نے 20مارچ 2000ء کو کشمیر کی تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے چھتی سنگھ پورہ اننت ناگ میں بڑے بہیمانہ انداز میں وہاں کے مقامی گردوارہ میں 34 سکھوں کو قتل کر دیا اور اس کی ساری ذمہ داری کشمیری مسلمانوں پر ڈال دی لیکن بعد میں خود بھارتی تین رکنی تحقیقاتی کمیشن نے بھارتی سیکورٹی فورسز کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بھارتی بنئے کی اس خوفناک سازش کا بھانڈہ پھوڑ دیا۔ اس طرح بہت سے موہن لال اپنے گھناؤنے کردار کے ساتھ بے نقاب ہو گئے اور دوسری طرف کشمیری پنڈتوں کو استعمال کرتے ہوئے من گھڑت واقعات سے دنیا کو گمراہ کرنا شروع کر دیا جس کو بھارت کے میڈیا نے بہت اچھالا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ان پنڈتوں کا انخلاء اس لئے بھی مقصود تھا کہ مسلمانوں کے خلاف بھارتی فوج کے ظالمانہ آپریشن میں ان کو فری ہینڈ مل سکے۔

بھارت جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرتا ہے آخر وہ دنیا کے پریس اور کیمرے کو وہاں جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ اگر چند منٹ کیلئے بڑی ناگواری کے ساتھ فرض کر لیا جائے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے تو وہ کون سا قانون ہے جس کے تحت بھارت نے اپنے ہی ایک لاکھ سے زائد بے گناہ شہریوں کو کشمیر میں قتل کر دیا ہے؟ اور پنڈت جواہر لال نہرو جو بھارت کا بڑا محبوب لیڈر تھا اس نے اقوام متحدہ میں عالمی طاقتوں کو ضامن بنا کر جس تحریر پر دستخط کئے تھے اس قرارداد کشمیر پر ساٹھ سال سے کیوں عملدرآمد نہیں ہوا؟ اس کا کوئی جواب ہے کسی کے پاس؟؟ کیا موہن لال اور من موہن سنگھ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟

بروز بدھ 9 جمادی الاوّل 1432ھ 13 / اپریل 2011ء

شکاری

دنیا امن وسلامتی کی آرزومند ہے، کم سے کم زبان سے تو سب اسی امن اور سلامتی کے دعویدار ہیں لیکن اس امن وسلامتی کی ایک شرط ہے ایک بنیاد ہے اگر یہ شرط پوری نہ ہو اور یہ بنیاد میسر نہ آئے تو ہماری اس انسانی دنیا کا امن اور سلامتی فقط ایک دعویٰ اور خالی آرزو ہی رہے گی۔ وہ شرط اور بنیاد عدل ومساوات ہے۔ جب تک عدل وقائم نہ ہو اور سب کے ساتھ برابر کا سلوک نہ ہو سکے تو امن وسلامتی کا دعویٰ بھی جھوٹا ہے اور اس کیلئے آرزو بھی خام خیالی ہے کیونکہ امن وسلامتی سے پہلے عدل ومساوات ضروری ہے اور عدل وانصاف کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے۔

سوئے اتفاق اور بدقسمتی سے دنیا میں تصادم کی فضا ہے، ظلم وناانصافی ہے اور سب سے یکساں سلوک مفقود ہے۔ یہ بھی عجب ستم ظریفی ہے کہ یہ ظلم اور ناانصافی صرف مسلمانوں سے روا رکھی جارہی ہے۔ ظالمانہ تصادم کی فضا کا عملی شکار بھی مسلمان ہیں۔ اس سے بھی عجیب ترین بات یہ ہے کہ اس تصادم اور ظلم وفساد کی جڑ بھی مسلمانوں کو ٹھہرایا جارہا ہے اور عجیب ترین بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ کیفیت چپ چاپ برداشت کرلی ہے، کم سے کم دنیا بھر کے مسلم حکمران تو بالکل چپ ہیں، اس پر احتجاج بھی نہیں کررہے جیسے کچھ دیکھتے نہ ہوں، جیسے کچھ سمجھتے نہ ہوں۔ اس المناک صورت حال کا سبب یہ ہے کہ یہاں عوام اور حکمرانوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہ حکمراں اسلام مخالف قوتوں کے رحم وکرم پر ہیں اور عالمِ اسلام ظالم لٹیروں کی زد میں ہے۔

اگر صحیح جمہوری فضا ہوتی تو دنیا بھر کے مسلم عوام اور اسلامی دنیا کی یہ حالت نہ ہوتی۔ آج بھی اگر مسلم عوام اور ان کے حکمراں متحد ہو کر اس امتیازی سلوک کے خلاف زوردار آوازیں اٹھائیں تو یہ فضا بدل سکتی ہے۔ امن وسلامتی کے جھوٹے دعویدار اپنی اپنی قوم کے سامنے رسوا ہو کر بے اثر ہو سکتے ہیں کیونکہ حسنِ اتفاق سے ان کے اپنے اپنے ملک کے عوام جمہوری قوتوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں اور یہ عوامی جمہوری قوتیں جس طرح اپنے جھوٹے حکمرانوں کو برداشت نہیں کرتیں، وہ پسماندہ قوموں سے ظلم وناانصافی اور ڈبل معیار کی بھی مخالف ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی دنیا کے عوام دنیا کے جمہوری عوام تک رسائی اور ربط کی صورت پیدا کریں تو پھر وہی ہو سکتا ہے جو عراق میں بش اور ٹونی بلیئر کے ساتھ ہوا۔

گو عراق ابھی تک آزاد نہیں ہوا لیکن عراقی عوام آزاد ہو گئے ہیں کیونکہ انہوں نے ظلم کو مسترد کردیا ہے اور ان کی اور ان کے قاتل کی حقیقی صورتحال دنیا کے جمہوری عوام تک پہنچ گئی ہے جو اپنے حکمرانوں سے حساب لے سکتے ہیں اور لیتے ہیں۔ اگر آپ کی نظر تاریخ پر ہے تو آپ محض مسلمان ہونے کے سبب اس ظالمانہ تہمت اور تصادم سے بچ بھی سکتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ پر جارحانہ چڑھائی سے صلیبی جنگوں کا آغاز کس نے کیا بلکہ یہ بھی کہ یہ کس نے کروایا؟ چار سو سال تک انسانیت کا خون پانی کی طرح بہتا رہا جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، مال لوٹا گیا، ملک چھینے گئے، یہ سب سلوک مسلمانوں سے تھا اور یورپ کے صلیبیوں نے کیا تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگیں کس نے شروع کیں؟ پرانے سامراجیوں نے۔ آج یہ ظالمانہ تصادم کی فضا کس نے پیدا کی؟ آج کے نئے سامراجیوں نے۔ مگر یہ سب کچھ کس نے کرایا؟ مسلمانوں کے اصلی دشمن یہودیوں نے، جی ہاں! خفیہ وسیہ کاریوں میں یہودیوں کا جواب نہیں۔

یقین نہیں آتا تو دیکھ لیجئے ہٹلر کے آنے تک مسیحی دنیا خصوصاً یورپ یہودیوں کا دشمن تھا، ان سے نفرت کرتا تھا، اپنے معاشرے سے انہیں نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ دونوں عالمی جنگوں میں اگر سود خوروں کے قرضے نہ ہوتے تو یہ جنگیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی تھیں۔ سودی کاروبار کس کے پاس تھا؟ انہی یہودیوں کے ہاتھ میں۔ دونوں جنگوں میں لگنے والے یہودی سرمائے نے مغرب کو پنجۂ یہود میں جکڑ دیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ سے اور بعد کے حالات سے تو ساری دنیا سود کے جال میں پھنس گئی ہے اور یہ جال یہودیوں شکاریوں کے ہاتھ میں ہے!

گزشتہ صدی کے دوران سود خوروں نے سودی پیسے سے مسلمان حکمرانوں کو خریدنا چاہا تھے مگر منہ کی کھائی، یہی پیسہ مغرب کے حکمرانوں کو جکڑنے کیلئے دیا گیا۔ پہلے یورپ کو پھر امریکا کو، چنانچہ آج سب پنجہ یہود میں ہیں لیکن یہودی وسیہ کاری ملاحظہ ہو کہ وہ انہی پرانے اور نئے سامراجیوں سے مسلمانوں کو پٹوا رہا ہے اور مسلمان سوتے رہے یا سلا دیئے گئے، آج بھی سو رہے ہیں یا سلائے جا رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں سے یہودی عداوت اور حسد ایک فطری رد عمل ہے۔ اس عداوت اور حسد کی ایک لمبی تاریخ ہے جو طویل بھی ہے اور تلخ بھی۔ ایک وقت تھا جب مکہ اور عرب کے تمام بت پرست اور یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد تھے، آج بھی متحد ہیں، پہلے مشرکین مکہ اور یثرب و خیبر کے یہودی اسلام کے خلاف متحد تھے۔ آج بھی تل ابیب اور نئی دہلی نے ایک مدت کے بعد ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے۔ پہلے اتحاد خفیہ تھا لیکن ایڈوانی اور شیرون نے اسے ایک کھلی حقیقت بنا کر مسلمان دنیا کو پیغام دیا ہے کہ کہ کل بھی دونوں کا دشمن مشترک تھا اور آج بھی مشترک ہے۔

اس اشتراک، عداوت اور حسد نے یہود و ہندو کو مسلمانوں کے خلاف ایک بنا رکھا ہے۔ یہود و ہنود دونوں کی خواہش ہے کہ نئے اور پرانے سامراجی انہیں تعاون کیلئے اپنے مہرے بنائیں تو خونِ مسلم میں ہاتھ رنگ کر من کو شانتی ملے اور لوٹ ماریں سے کچھ حصہ بھی ملے مگر قدرت نے نئے سامراجیوں کو ننگا کر دیا ہے اور امریکا اور مغرب کے جمہوریت پرست عوام انہیں تاریخ کی گمنامی میں دھکیل رہے ہیں مگر یہ یہود و ہنود اب بھی نہیں بدلے۔ وہ عدل و انصاف کی ہر آواز پر تلملا اٹھتے ہیں، وہ ہر صورت میں کچھ نہ کچھ لے مرنے کی فکر میں رہتے ہیں کہ فلسطین اور کشمیر میں کسی نہ کسی بہانے مسلمانوں کا خون بہاتے رہیں۔

مسلمانوں کیلئے یہ موقع ہے کہ مغرب کے امن پسند اور انصاف کے داعی تنظیموں سے اپنا رابطہ از سرِ نو مرتب کریں۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر مسلم ملکوں کیلئے داخلی، علاقائی اور عالمی مسائل پیدا کر کے الجھانے کی سر توڑ کوشش موجودہ وسیہ کاری اور خفیہ سازش کا حصہ ہے۔ صہیونیوں کو پہلے خطرہ صرف پاکستان کے ایٹمی اسلحے سے تھا مگر اب تازہ خطرہ ایران سے ہے۔ اگر عراق میں شیعہ اکثریت کے حق کو تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس سے ایران کو یقیناً تعاون اور فائدہ ہو گا اور اس سلسلے میں اس نے ایک طرف عرب ممالک کو ممکنہ ایرانی خطرے کے پیش نظر اس خطے کے مسلمانوں کی حمائت

حاصل کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے لیکن عراق میں مسلمانوں کے تمام دھڑے صہیونی سازشوں سے باخبر ہو گئے ہیں اور ان کی یہ پالیسی بظاہر ناکام ہو گئی ہے۔

عراق میں مسلمانوں کے تمام دھڑوں کے اس اتفاق نے صہیونی طاقتوں کو از حد پریشان کر رکھا ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کا اتحاد کل فلسطین کی آزادی کا سبب بھی بن سکتا ہے اور کشمیر کو بھی بھارتی ظالم ہندو استبداد سے بھی نجات مل سکتی ہے۔ صہیونی تو اس علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی طرح وہ ساؤتھ ایشیا میں ہنود کی بالادستی میں ان کی مدد کر رہے ہیں اس لئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان عالمی امن پسند قوتوں سے رابطہ قائم کر کے یہود و ہنود کے ان ناپاک ارادوں کو ناکام بنادیں۔

ساؤتھ ایشیا میں لالہ لبھورام کشمیر میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو اسرائیل کا جنونی دہشت گرد فلسطین میں کھیل رہا ہے۔ آزادی مانگنے والا ہر کشمیری بھارت کے نزدیک پاکستان کا ایجنٹ ہے اس لئے اسے سات لاکھ فوج مارنے میں حق بجانب ہے۔ پاکستان کے حکمراں تو اقتدار کی کرسی کیلئے کشمیریوں کی ہر قربانی کو پس پشت ڈالتے ہوئے بھارت کے ساتھ مذاکرات کیلئے انتہائی بے چین نظر آتے ہیں جب کہ بھارت انتہائی مکاری اور ہوشیاری کے ساتھ پاکستان کو دباؤ میں رکھنے کیلئے اصل مسائل پر مذاکرات کرنے کی بجائے دوسرے مسائل میں پاکستان کو الجھا رہا ہے۔ لیکن کشمیری اب اس بات سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اگر افغانستان جیسا ملک دنیا کی سب سے بڑی سپر طاقت اور اس کے اتحادیوں کو شکستِ فاش پر مجبور کر سکتا ہے تو بھارتی بنیا تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کشمیریوں نے اپنے خون کے ساتھ جو حریت کی داستانیں رقم کی ہیں اور اپنی آزادی کی خاطر جو بیش بہا قربانیاں دی ہیں، وہ کبھی رائیگاں نہیں ہو سکتیں اور وہ دن بہت قریب ہے جب کشمیری اپنی اس فصل کو آزادی کی نعمت میں وصول کر کے رہیں گے انشاء اللہ!

بروز اتوار 13 جمادی الاوّل 1432ھ 17/ اپریل 2011ء

کہیں تلوار سے بھی کانٹا پاؤں کا نکلتا ہے

بھارت نے آج تک پاکستان کے وجود کو دل سے اس لئے تقسیم نہیں کیا کہ برہمن سامراج کا مہابھارت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا جس کی صدیوں سے تمنا دل میں لئے ہوئے ہے۔ برہمن اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جس ملک کو بحرِ ہند کا پانی چھو کر گزرتا ہے وہ مہابھارت کا حصہ ہے حالانکہ بھارت پر مسلمان حکمرانی کی چھاپ صدیوں پر محیط ہے۔ قیامِ پاکستان نے ان کی آرزوؤں پر بری طرح پانی پھیر دیا لیکن برہمن آج تک اس زخم کو بھلا نہیں پایا، یہی وجہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے تک بھارت میں یہ امید اور خواہش بہت جوان تھی کہ پاکستان ایک پکے ہوئے پھل کی مانند ان کی جھولی میں آن گرے گا۔ اس میں امید اور خواہش کے الگ الگ پہلو تھے۔ بھارت کے دانشوروں اور سیاستدانوں کی امید کی بنیاد یہ تھی کہ پاکستان ایک قومی ریاست کی تعریف پر اس لئے پورا نہیں اترتا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذاہب سے نہیں۔ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا ہے اور مشترکہ بود و باش، زبان، ثقافت، تاریخی شعور اور معاشی مفادات ریاستوں کے بننے اور ٹوٹنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جبکہ پاکستان کی مختلف اکائیوں میں مذہب کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں کہ اس میں رہنے والوں کا مذہب اسلام ہے۔

اندرونی اور بیرونی سازشوں کی بنیاد پر جب 1971ء میں پاکستان کے مشرقی بازو کو الگ کر دیا گیا تو برہمن زادی اندرا گاندھی نے بڑے تکبر سے یہ اعلان کیا کہ آج ہم نے نہ صرف ایک ہزار سال پرانا قرض چکایا ہے بلکہ دو قومی نظریہ کو بھی خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے۔ بظاہر بھارت کی تو یہ شدید خواہش تھی کہ باقی ماندہ پاکستان کے بھی ٹکڑے کر کے اس کو ہمیشہ کیلئے ایک طفیلی ریاست بنا دیا جائے اور اس طرح مہابھارت کے خواب کی تکمیل کا آغاز کیا جائے۔ بھارت کے سیاستدان اور دانشور یہ سوچنے لگے کہ پاکستان کے اندر ایسی بہت سے طاقتیں اب بھی موجود ہیں جو قیامِ پاکستان کی مخالف تھیں یا تحریک پاکستان کے دھارے سے الگ تھلگ تھیں اس لئے اب قومیت اور لسانیت کے جن بوتل سے نکال کر ان کے درمیان فساد پیدا کر کے باقی ماندہ پاکستان کو بے پناہ مسائل اور مشکلات میں مبتلا کر کے اس کے باقی ماندہ وجود کو ایسا عالمی بوجھ بنا دیا جائے کہ اس کے عوام نظریہ قیام پاکستان کو ایک غلطی قرار دیکر خود بخود یا تو بھارت کا ایک حصہ بن جائیں یا پھر بھارت کی ایک باجگزار ریاست بننا قبول کر لیں۔

پاکستان میں جمہوری عدم سسٹم کی موجودگی نے بھی بھارتی سیاستدانوں اور دانشوروں کی ان امیدوں کو تر و تازہ اور جوان رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کا وجود متحدہ ہندوستان کی راکھ سے اٹھا ہے اور ہندوؤں کی عددی برتری و بالادستی کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر کے تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں نے ان کی انا کو بری طرح زخمی کیا ہے، اور پھر ہندو مت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے اور ایک وسیع و عریض خطے پر ان کی عملداری رہی ہے اور اس خطے کے یہ تمام مسلمان بھی پہلے ہندو دھرم سے ہی وابستہ تھے اس لئے پاکستان کے قیام کی صورت میں اس تہذیب کا شکست کھا جانا ہندو دانشوروں کو کسی بھی صورت ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ 1971ء میں بھارت کی کھلی جارحیت کے بعد پاکستان کے مشرقی بازو کو بنگلہ دیش بنانے کے باوجود وہ بھارت کا حصہ نہ بن سکا بلکہ بنگلہ دیش بھارتی سرحد پر کئی نئے مسائل کا موجب بن گیا۔ متحدہ پاکستان، مشرقی پاکستان کے ذریعے جن علاقوں کو متاثر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اب بنگلہ دیش کی صورت میں

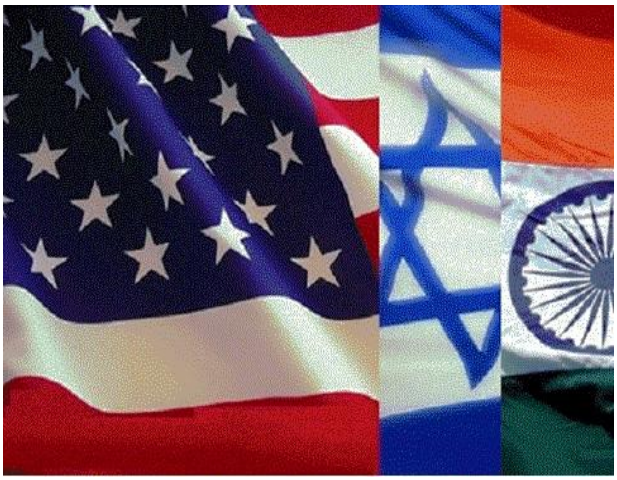

بنگال، آسام اور ناگالینڈ کی ان سرحدوں پر نئے حوالوں سے کئی خطرات نے جنم لے لیا ہے اور اب کئی بھارتی دانشور اپنی اس فاش غلطی کو کوس رہے ہیں۔

پاکستان کے ایٹمی طاقت کے طور پر ابھرنے کے بعد بھارتی سیاستدانوں اور دانشوروں کی موہوم امیدوں نے جہاں دم توڑا ہے وہاں اٹل بہاری واجپائی کو مینار پاکستان کے سائے تلے اور بعد ازاں متعصب ہندو لیڈر لال کرشن ایڈوانی کو مزارِ قائداعظم پر پاکستان کے وجود کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا۔ اٹل بہاری واجپائی کا ایٹمی دھماکوں کے بعد مینار پاکستان لاہور کے سائے تلے تقریر کرنا اس بدلتی ہوئی سوچ کا آئینہ دار تھا کہ انہوں نے پاکستان کے اس حق کو تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں جینے کا حق صرف ان کو ہے جو اپنی حرمت پر مرنے کا عزم رکھتے ہیں حالانکہ جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا تو دھماکے کے صرف پندرہ منٹ بعد ایڈوانی نے اپنی پریس کانفرنس میں پاکستان کو کھلی دھمکی دی تھی کہ وہ آزاد کشمیر پر حملہ کر کے کشمیر کے مسئلے کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں گے۔ بظاہر بھارت نے پاکستان کے وجود کو تسلیم تو کر لیا لیکن اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں کو اب بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

بھارت کی یہ پرانی خواہش ہے کہ وہ اس خطے کی سپر پاور بن کر مہابھارت کی نقشے میں اپنی امنگوں کا رنگ بھر سکے لیکن پڑوس میں چین اور پاکستان جیسی ایٹمی قوتوں کے بعد اس
کو اپنے خوابوں کی تعبیر اور امنگوں کی تکمیل میں ناکامی ہو رہی ہے اس لئے وہ اس خطے میں امریکا اور مغربی ممالک کے توسط سے ایک تیر سے کئی شکار کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پچھلے تین عشروں سے چین کی تیز رفتار صنعتی ترقی نے دنیا کی بیشتر منڈیوں پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ خود یورپ اور امریکا کی منڈیوں پر چینی مصنوعات نے برتری حاصل کر لی ہے جس کی بناء پر پچاس بڑی صہیونی کارپوریشنز جن کی گرفت میں عالمی تجارت ہے، ان کے مفادات کو بری طرح زک پہنچ رہی ہے۔ ان کارپوریشنز کا امریکا اور مغربی ممالک کی حکومتوں میں عمل دخل اب کوئی ڈھکا چھپا ہوا نہیں۔ پچھلی دو دہائیوں سے ہنود و یہود لابی نے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے جو گٹھ جوڑ کیا تھا اور جس بری طرح اس لابی نے پینٹاگون اور سی آئی اے میں اپنے خونی پنجے گاڑ رکھے ہیں اس کے بارے میں خود امریکی دانشوروں کی ایک کثیر تعداد تشویش میں مبتلا ہے۔

گزشتہ ہفتے بھارتی فوج کے ناردرن کمانڈ کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل کے ٹی پرنائیک نے اسی لابی کے ایماء پر پاک بھارت سرحد پر چینی افواج کا الزام عائد تو کر دیا لیکن بھارتی جرنیل اور میڈیا آج تک یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ آزاد کشمیر میں "ایل او سی" پر کس جگہ ان کو چینی افواج نظر آئی ہے۔ امریکی انٹیلی جنس کے اداروں نے فوری طور پر تصدیق کرتے

ہوئے عالمی میڈیا میں اس کا بڑے زور شور سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے بڑی حکمت سے اس سے پہلے کئی مرتبہ دیوسائی پلین تک امریکی رسائی کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اب کسی بھی صورتحال سے نمٹنے کیلئے وہاں اپنی ایئر فورس کو متعین کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز الزام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر 1965ء اور 1971ء کی دو جنگوں میں پاکستان نے چینی افواج کو نہیں بلایا تو بھلا اب ایٹمی پاکستان کو اس کی کیا ضرورت آن پڑی ہے۔

پاک چین تعلقات کے حوالے سے بلیک میلنگ پر مشتمل پالیسیاں گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہیں اور اس الزام تراشی کے پس پردہ بھی وہی مقاصد بڑے واضح دکھائی دیتے ہیں ۔ اس بے بنیاد خبر کے ذریعے دراصل امریکا اپنی اس ناکامی کے بعد پاک بھارت سرحد پر چینی افواج کا الزام عائد کر کے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں محض اس لئے فساد پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہاں کی مقامی آبادی اس خبر کو سن کر مشتعل ہو گی کہ پاکستان نے اس علاقے میں چینی فوج بلا کر مقامی آبادی کی توہین کی ہے اور دوسرا بڑا مقصد 12 / اپریل کو من موہن سنگھ کے دورۂ بیجنگ سے پہلے چین پر دباؤ بڑھانا مقصود تھا اور تیسرا بڑا مقصد مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی تعداد میں ایک بڑا متوقع اضافہ ہے جسے اسرائیلی ماہرین کی مدد بھی حاصل ہے۔ بدقسمتی سے بھارت اور امریکا اپنے پہلے دو مقاصد میں قطعی کامیاب نہیں ہو سکے۔

اس وقت بھارت کشمیر کی تحریکِ آزادی کو کچلنے میں نہ صرف بری طرح ناکام ہو چکا ہے بلکہ کشمیر میں جاری ظلم و ستم کی وجہ سے عالمی طور پر بدنام بھی ہو رہا ہے اور اب بھارت اس بہانے کی آڑ میں کشمیر میں مزید دو لاکھ فوج کے اضافے کی پوری کوشش کرے گا تاکہ مزید طاقت کے بل بوتے پر کشمیر کے مسئلے سے جان چھڑا سکے اس لئے بھارتی اس سے پہلے زاد کشمیر میں چینی افواج کی موجودگی کا ہوا کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور امریکا کی طرف سے اس طرح کی حرکت کی توقع اس لئے تھی کیونکہ مغربی سرحدوں پر پاکستان کے مستحکم قسم کے " نو مور " کے بعد یہ ضروری تھا کہ وہ پاکستان کیلئے مشرقی سرحدوں میں پریشانی پیدا کریں، دوسرا بڑا مقصد امریکا اندرونی سطح افغانستان میں اپنی شکست چھپانے کیلئے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ امریکی عوام کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ اگر انہوں نے افغانستان سے اپنی فوجیں نکالیں تو چین جو پہلے ہی پاکستان آ چکا ہے وہ اس خطے پر مکمل قبضہ کر لے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سیاسی تجزیہ نگار اور ماہرین نے اس خبر کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور وہ سب جانتے ہیں کہ پاک افواج کو بالخصوص بھارت کے مقابلے کیلئے کسی اور کی مدد کی قطعاً ضرورت نہیں۔

ڈرا دھمکا کے تم ہم سے وفا کرنے کو کہتے ہو
کہیں تلوار سے بھی کانٹا پاؤں کا نکلتا ہے

بروز منگل 15 جمادی الاوّل 1432ھ 19 / اپریل 2011ء

تکلف بر طرف قاتل کو قاتل لکھ دیا جائے

چند روز قبل کرکٹ ڈپلومیسی اور امن کی آشا کے بارے میں کالم تحریر کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ نام نہاد "امن کی آشا اور کرکٹ ڈپلومیسی" کے دھوکہ میں الجھا کر ارضِ وطن اور چین کے زمینی رابطے کو منقطع کرنے کی سازشیں بے نقاب ہو گئیں ہیں اور قومی سلامتی کے ذمہ داروں نے شیطانی تثلیث امریکا، اسرائیل اور بھارتی منصوبے کی تفصیلات کا سراغ لگالیا ہے۔ قومی سلامتی کے اداروں نے کچھ ایسے ٹیلی کیمونیکیشن پیغامات ریکارڈ کئے ہیں جس سے آزاد کشمیر کی لائن آف کنٹرول پر چینی افواج کے اجتماع کی جھوٹی خبر کی وجوہات طشت از بام ہو گئی ہے اور اس میں پنہاں اس خطرناک سازش کا بروقت پتہ چلالیا گیا ہے جس کی بنیاد پر پاکستان کے شمالی علاقوں میں شورش پیدا کرنے کا پلان تیار کیا گیا ہے جس میں پاکستان اور چین کے درمیان واحد زمینی راستے کو ہمیشہ کیلئے تباہ و برباد کر کے شمالی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد ریاست "بالادرستان" کے قیام کے بعد دیوسائی پلین میں امریکی اڈے قائم کرنے کا منصوبہ شامل ہے۔

صہیونی و ہنود لابی کا خیال ہے کہ امریکا کے اس خطے سے نکلنے کے بعد پاکستان اپنے دیرینہ اور مخلص دوست چین کے تعاون سے گوادر بندرگاہ کو آپریشنل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس سے اس خطے میں نہ صرف پاکستان کی معاشی خوشحالی میں مدد ملے گی بلکہ دفاعی نقطہ نگاہ سے پاکستان کو بالادستی حاصل ہو جائے گی۔ دوسری طرف چین گوادر سے شاہراہِ قراقرم تک ریل اور سڑک کا رابطہ قائم کر کے بھارت کی اس خطے میں بالادستی کے خواب کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ملیامیٹ کر دے گا۔ اس لئے بڑی عجلت میں اس شیطانی تثلیث نے اپنے اس مکروہ پلان کو عملی جامہ پہناتے ہوئے آزاد کشمیر کی لائن آف کنٹرول پر چینی افواج کے اجتماع کا ڈرامہ رچا کر گلگت اور بلتستان میں ان قوم پرست عناصر کو جو حالیہ انتخابات میں بری طرح شکست سے دوچار ہونے کے بعد دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور اپنے ایجنٹوں کو متحرک کر کے پاکستان اور چین کے درمیان رابطہ کاٹنے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔

مجوزہ قوم پرست جماعت "بالاورستان نیشنل فرنٹ" کا سربراہ جو اس وقت مکمل امریکی آشیر باد اور یہود و ہنود سرمائے سے اس وقت "برسلز" میں بیٹھا ہوا اس ساری سازش کو کامیاب کرنے کیلئے اپنے ایجنٹوں کے ساتھ رابطے میں ہے جس طرح آزاد بلوچستان کی تحریک چلانے کیلئے اسرائیل نے یروشلم میں چند گمراہ بلوچوں کو نہ صرف پناہ دے رکھی ہے بلکہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ ان کی بھارتی معاونت کے ساتھ مالی اور عسکری مدد بھی کر رہا ہے۔ پچھلے ایک سال سے برسلز سمیت دیگر مقامات پر یہود و ہنود لابی سے بی این ایف کے بعض لیڈروں کی مسلسل ملاقاتیں جاری ہیں۔ منصوبے کے مطابق عنقریب بالاورستان نیشنل فرنٹ گلگت بلتستان میں کچھ مخصوص اور اہم مقامات پر پاک چین تجارت کے خلاف منظم احتجاج کی کال دے گا جس کے بعد یہ فرنٹ پہلے حکومت کے خلاف ریلیوں کا سلسلہ شروع کرے گا اور بعد میں اسی تحریک کا رخ چین کے خلاف ایک مہم کی صورت میں ایجی ٹیشن کی شکل اختیار کرتے ہوئے شاہراہ قراقرم کے راستے پاک چین تجارت اور خطے میں ترقیاتی کاموں خصوصاً شاہراہ قراقرم، پونجی ڈیم، دیگر کئی چھوٹے بڑے پل، سڑکوں اور ہائیڈرل پراجیکٹس پر کام کرنے والی چینی فرموں کے خلاف موڑ دیا جائے گا اور ان کو یہاں سے نکالنے کا پرزور مطالبہ کیا جائے گا۔

گزشتہ برس جب سیلاب کے موقع پر امداد کی آڑ میں امریکی ہیلی کاپٹر زدورانِ پرواز جاسوسی کے مرتکب بھی پائے گئے تو قومی سلامتی کے ادارے کا ماتھا ٹھنکا، ان کو فوری روک دیا گیا اور یہ کام چین کے سپرد کر دیا گیا لیکن امریکا نے اس ادارے کی جرأت کو معاف نہیں کیا۔ اس لئے جب بھارت نے شاہراہ قراقرم کو چوڑا کرنے پر سخت اعتراض کیا تو حیرت انگیز طور پر امریکا نے بھی اس اعتراض میں پورا وزن ڈال دیا اور ہماری موجودہ حکومت نے امریکی دباؤ میں شاہراہ قراقرم کی مجوزہ چوڑائی کو 70 فٹ سے کم کر کے تیس اور 36 فٹ کر دیا جس پر ابتدائی طور پر چین نے بھی اپنے تحفظات کا اظہار کیا جبکہ ابتدائی دس کلو میٹر سڑک پروگرام کے مطابق 70 فٹ تعمیر کی گئی ہے حالانکہ یہ کلی طور پر پاکستان کے ذاتی معاملات میں دخل دراندازی ہے اور عالمی قوانین کے مطابق کسی خود مختار ملک میں جارحیت کے مترادف ہے۔ ادھر دوسری طرف بھارت نے گلگت بلتستان کے اس پر امن خطے کو شورش زدہ بلوچستان کی طرح بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک خطیر سرمایہ کاری شروع کر دی ہے تاکہ چین کو گوادر بلکہ پاکستان تک اس زمینی رسائی سے روکا جاسکے۔ یہی سبب تھا کہ نیویارک ٹائمز نے 11 ہزار چینی فوجیوں کی موجودگی کی من گھڑت خبر شائع کی تاکہ اس کی آڑ میں اس مذموم منصوبہ کو شروع کیا جاسکے۔

ان مجوزہ ٹیلیفون کالز سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ بی این ایف (بالادرستان نیشنل فرنٹ) کی قیادت کو ہدایات موصول ہوئی کہ وہ مقامی سطح پر لوگوں کو باور کرائیں کہ اس منصوبہ کو امریکا کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے اور امریکا نے یقین دہانی کروائی ہے کہ ایک دفعہ علیحدگی کی تحریک شروع کر دی جائے تو امریکا اپنا پورا وزن اس تحریک کی کامیابی کیلئے استعمال کرے گا۔ اس سلسلے میں امتیاز نامی شخص پچھلے کئی ماہ سے امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں گلگت بلتستان کے عوام پر پاکستان اور چین کے مشترکہ مظالم کا جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے بالادرستان کی آزادی کیلئے امداد حاصل کرنے کیلئے لیکچر دے رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے امریکا کا ایک طوفانی دورہ کیا جہاں اسی شیطانی تثلیث نے مختلف سیمینار کے انعقاد کا پورا بندوبست کیا تھا۔ بالاورستان نیشنل فرنٹ کا موقف ہے کہ اس خطے کا پرانا نام بالاورستان تھا اور اس میں گلگت، بلتستان، چترال، کوہستان کا ایک حصہ اور لداخ شامل تھے لہٰذا ان علاقوں کو یکجا کر کے آزاد بالاورستان بنا دینا چاہئے۔ امریکی اس منصوبے کو اس حوالے سے بہت اہمیت دے رہے ہیں کہ اس طرح انہیں اس خطے خصوصاً دیوسائی پلین کے ذریعے چین کے اندر تک مانیٹر کرنے اور اپنا کھیل کھیلنے کا بخوبی موقع مل جائے گا۔ یاد رہے کہ چین کی حساس تنصیبات اسی علاقے میں موجود ہیں جہاں امریکا کی فی الحال رسائی ناممکن ہے۔ س شیطانی تثلیث کو اس امر کا قوی یقین ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کی بل پر یہاں مشرقی پاکستان والا سبق بڑی آسانی کے ساتھ دہرا سکتے ہیں کیونکہ دشوار گزار اور دور دراز پہاڑی سلسلوں میں پاکستان اور چین کی افواج کو یہاں مداخلت میں بہت دشواری ہوگی جبکہ بھارت تاجکستان میں موجود اپنے فضائی بیڑے سے واخان کے راستے اور امریکا و اسرائیل افغانستان سے مشترکہ حملہ آور ہو کر اس پر قبضہ کر لیں گے۔ اسی خیال کو سامنے رکھتے ہوئے وہ بی این ایف کی بھرپور مدد کر رہے ہیں۔

گلگت کے فسادات میں بھارتی سرمایہ ملوث ہونے کے بڑے مضبوط، واضح شواہد اور ثبوت مل چکے ہیں اور حال ہی میں اسکردو میں نور بخشی اور شیعہ مکتبہ فکر میں تصادم کی کوششوں کو بھی بڑی کامیابی سے ناکام بنادیا گیا ہے جس میں بھارتی خفیہ ایجنسی "را" نے ایک منصوبے کے تحت ایک سیاسی محاذ پر بی این ایف کو استعمال کیا تھا اور دوسری طرف پاکستان کی ایک لسانی جماعت کو موجودہ حکومت کے تعاون سے گلگت اسمبلی میں نمائندگی دلائی گئی ہے تاکہ مستقبل میں ان کو استعمال کیا جاسکے۔ اس علاقے میں مداخلت کا یہ پہلا منصوبہ نہیں، اس سے قبل 1990ء کی دہائی کے اوائل میں ایک خاتون بھی بالادورستان کی خود مختاری کا نعرہ لگا کر کراچی میں رہائش پذیر ہو چکی ہیں۔ موصوفہ شملہ میں پیدا ہوئیں، کراچی میں ایک بہاری سے شادی کی، ان کو بھی بلتستان کی آزادی کی فکر بہت کھائے جارہی تھی البتہ ناکامی کے بعد اب گھر میں بیٹھ گئیں ہیں مگر ان کا ایک بیٹا آجکل ٹی وی کے ڈراموں میں دکھائی دے رہا ہے۔

بھارت کا دوہرا کردار اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس نے پاکستان اور چین سے ملحقہ اپنے سرحدی علاقوں میں دس ارب ڈالر کی لاگت سے مجموعی طور پر 27 ہزار 986 کلومیٹر فاصلے کی 558 سڑکوں کی تعمیر کا منصوبے شروع کر دیئے ہیں جو 2030ء تک مکمل کر لئے جائیں گے۔ منصوبے کے تحت پہلے مرحلے میں بھارتی بارڈر روڈ آرگنائزیشن کو فوری
طور پر 13 ہزار ایک سو کلومیٹر کی 277 سڑکیں بنانے کی فوری ہدائت کی گئی ہے جس پر 249/ارب روپے کی لاگت آئے گی اور دوسرے مرحلے پر 253/ارب روپے کی لاگت سے 14 ہزار 886 کلومیٹر کی 281 سڑکوں کی تعمیر عمل میں لائی جائے گی۔ چین کی جانب سے اپنے پڑوسی ملکوں نیپال و پاکستان اور دیگر ملکوں سے تعاون اور اسٹرٹیجک شراکت داری نے یہود و ہنود اور ان کے سرپرست امریکا کو بدحواس کر دیا ہے حالانکہ چین اور اس کے پڑوسی ملکوں کی ایسی اسٹرٹیجک پارٹنر شپ بھارت کے قطعی خلاف نہیں ہے جبکہ یہود و ہنود اور امریکا نے جو اسٹرٹیجک گٹھ جوڑ کیا ہے اور امریکا نے بھارت کو جو ایٹمی مواد کے حوالے سے جو مراعات اور سہولتیں دی ہیں ان کا مقصد واضح طور پر پاکستان اور چین کے خلاف محاذ آرائی کیلئے بھارت کو تیار کرنا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ بھارت نے پاکستان اور چین کی سرحدوں سے ملحق علاقوں کی سڑکوں کی تعمیری منصوبوں پر ترجیحی بنیاد پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے اس سے چانکیائی سیاست کے حامل بھارتی نیتاؤں کے مذموم عزائم کو پرکھا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تو پاکستان اور چین سے مذاکرات کا ڈھونگ اور دوسری طرف جنگ کی تیاریاں، یوں منہ میں رام رام اور بغل میں چھری یہی چانکیائی اور میکاولی سیاست ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ امریکا بہادر کو واضح الفاظ میں پیغام دے دیا جائے کہ اس خطے میں "وارآن ٹیرر" کی جنگ کو خود سنبھالے۔ افغانستان سے اس کی کب اور کس طرح رخصتی ہوگی اس سے پاکستان کو کوئی سروکار نہیں۔

کہیں سچ بولنے سے شعریت مجروح ہوتی ہے
تکلف برطرف قاتل کو قاتل لکھ دیا جائے

بروز جمعرات 17 جمادی الاوّل 1432ھ 21/اپریل 2011ء